نہرو دور کی یادیں

مصنف
ایم۔او۔متھائی

ترجمہ
نذیر حق

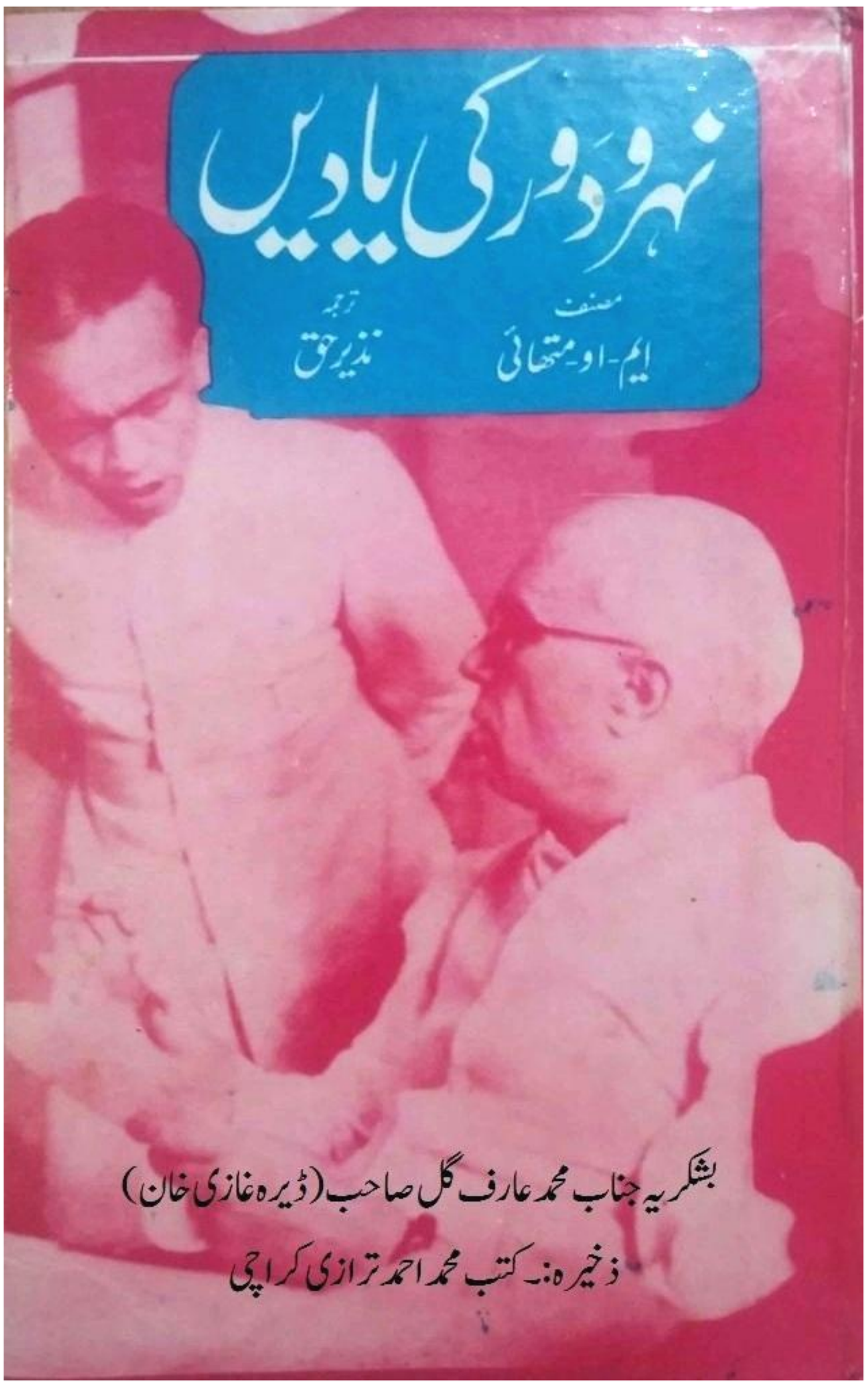

بشکریہ جناب محمد عارف گل صاحب (ڈیرہ غازی خان)

ذخیرہ:۔ کتب محمد احمد ترازی کراچی

نہرو دور کی یادیں

— مصنف —

ایم — او — متھائی

(جو ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۹ء تک نہرو کے بعد ہندوستان کا سب سے طاقتور فرد تصور ہوتا تھا)

— ترجمہ —

نذیر حق ۔ چیف نیوز ایڈیٹر روزنامہ مشرق ۔ لاہور

★

عزیز پبلشرز ۔ اُردو بازار ۔ لاہور

بشکریہ

جناب محمد عارف گل صاحب (ڈیرہ غازی خان)

ذخیرہ کتب: محمد احمد ترازی کراچی

جملہ حقوق محفوظ

اشاعت دوم ——— ۱۹۹۳ء

ناشر ——— عزیز پبلشرز۔ لاہور

طابع ——— علی پرنٹرز لاہور

قیمت ——— Rs 300.00

عرضِ ناشر

"نہرو دور کی یادیں" آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو کے پرنسپل سیکرٹری ایم۔او متھائی کی تصنیف ہے۔ وہ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۹ء تک گیارہ سال تک پنڈت نہرو کے ساتھ رہے اور اس دور میں انہیں نہرو کے بعد بھارت کا سب سے طاقتور شخص تصور کیا جاتا تھا۔ یہ کتاب اسی دور کی یادوں پر مشتمل ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں بھارت کے مختلف سیاسی رہنماؤں پر اپنے نقطہ نظر سے اظہار خیال کیا ہے اور آزادی کے بعد بھارت کے ایوان سیاست میں ہونے والے گھٹ جوڑ اور سازشوں سے پردہ اٹھایا ہے۔

مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس کے اپنے خیالات اور احساسات پر مبنی ہے۔ وہ واقعات کو اپنے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے اور پھر اپنی کسوٹی پر پرکھ کر ان کے بارے میں اپنی آرار کا اظہار کرتا ہے۔ اس نے جو کچھ لکھا ہے جو انکشافات کئے ہیں یا جن آرار کا اظہار کیا ہے ضروری نہیں کہ ان سے ہمیں اتفاق ہو۔ مگر یہ واقعات اور انکشافات ایسے ہیں کہ ان کا مطالعہ دلچسپی اور افادیت سے خالی نہیں۔ بھارت کے سیاسی رہنما پاکستان کے پڑھے لکھے طبقے کے لئے اجنبی نہیں ہیں مگر ان میں سے بیشتر کے کردار کے بارے میں اب تک جو کچھ یہاں کے لوگوں کو معلوم ہے، متھائی اس میں بلاشبہ اضافہ کرتا ہے اور یہ اضافہ یقیناً حیران کن، سنسنی خیز اور انتہائی دلچسپ ہے۔

اس لحاظ سے "نہرو دور کی یادیں" کا مطالعہ پاکستان کے تعلیم یافتہ

طبقہ کے لیے معلومات افزا ہوگا۔ اسی نقطۂ نظر سے یہ کتاب اردو میں پیش کی جا رہی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے محظوظ ہو سکیں اور اپنی معلومات میں اضافہ کر سکیں۔

مصنف نے ایک دو جگہ پنڈت جواہر لال نہرو کی "صفائی" پیش کرتے ہوئے بعض حقائق کو غلط انداز میں پیش کرنے کی بھی کوشش کی ہے مگر کتاب کے مترجم نے اپنی وسیع معلومات کی روشنی میں ان مقامات پر حواشی لکھ کر مصنف کی غلط بیانی کا مکمل طور پر ازالہ کر دیا ہے۔

سید عزیز شاہ بخاری

جولائی ۱۹۷۸ء

فہرست

عرض ناشر		
باب ۱	نہرو اور میں	۷
باب ۲	کمیونسٹوں کے حملے	۲۷
باب ۳	باغی کی پریشانی	۳۱
باب ۴	نہرو اور رجعت پسند	۳۲
باب ۵	مہاتما گاندھی	۳۶
باب ۶	لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور "فریڈم ایٹ مڈنائٹ"	۴۸
باب ۷	ماؤنٹ بیٹن	۵۵
باب ۸	چرچل، نہرو اور انڈیا	۵۹
باب ۹	برنارڈ شا سے نہرو کی ملاقات	۶۵
باب ۱۰	راج گوپال اچاریہ	۶۹
باب ۱۱	بھارت کے صدر کی آئینی حیثیت	۷۲
باب ۱۲	راجندر پرشاد اور رادھا کرشنن	۷۴
باب ۱۳	وزیر اعظم کا سیکرٹریٹ	۷۹
باب ۱۴	ایوان وزیر اعظم	۸۲
باب ۱۵	وزیر اعظم اور فضائیہ کے طیارے	۸۶
باب ۱۶	رفیع احمد قدوائی	۸۹
باب ۱۷	فیروز گاندھی	۹۵
باب ۱۸	نہرو کے اخبارات	۹۹
باب ۱۹	نہرو اور پریس	۱۰۳
باب ۲۰	نہرو پر ماحول کا اثر	۱۰۷
باب ۲۱	نہرو اور "لکشمی دیوی"	۱۱۳
باب ۲۲	جی۔ ڈی۔ برلا	۱۱۸
باب ۲۳	نہرو نے چسکی لگائی	۱۲۱

ب ۲۴	سروجنی نائیڈو	۱۲۷
ب ۲۵	راج کماری امرت کور	۱۲۹
باب ۲۶	وجے لکشمی پنڈت	۱۳۴
باب ۲۷	ذکر کچھ کتابوں کا	۱۴۱
باب ۲۸	ابوالکلام آزاد اور شراب	۱۴۶
باب ۲۹	وہ کون تھی ؟	۱۵۲
باب ۳۰	کرشنا منن کیا تھا ؟	۱۵۳
باب ۳۱	کرشنا منن — ایک نشہ باز	۱۶۱
باب ۳۲	کرشنا منین اور اقوام متحدہ	۱۷۱
باب ۳۳	کرشنا مینن کے سکنڈل	۱۷۵
باب ۳۴	کرشنا مینن — ناکام عاشق	۱۸۴
باب ۳۵	کیا نہرو مغرور تھے ؟	۱۹۴
باب ۳۶	نہرو اور ہیرو کریسی	۱۹۶
باب ۳۷	نہرو کی گوپیاں	۲۰۳
باب ۳۸	نہرو اور سوشلسٹ	۲۱۶
باب ۳۹	نہرو۔ چین اور کشمیر	۲۲۱
باب ۴۰	گوبند۔ بلبھ۔ پنت	۲۲۵
باب ۴۱	ٹی۔ ٹی کرشن مچاری	۲۲۸
باب ۴۲	کامراج	۲۳۲
باب ۴۳	لال بہادر شاستری	۲۳۷
باب ۴۴	دو گرگ باراں دیدہ	۲۴۳
باب ۴۵	ولبھ بھائی پٹیل	۲۴۶
باب ۴۶	اندرا	۲۵۵
باب ۴۷	مرارجی ڈیسائی	۲۶۶
باب ۴۸	مرارجی ڈیسائی کا "آب حیات"	۲۷۲

باب

نہرو اور میں

۱۹۴۵ء میں نہرو کی جیل سے رہائی کے بعد میں نے انہیں آسام سے خط لکھا کہ "میں قومی تحریک میں آپ کا ہاتھ بٹانا چاہتا ہوں۔" مجھے ان کا جواب موصول نہ ہوا، کیونکہ میری چٹھی سی آئی ڈی کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ پھر میں نے انہیں ایک اور خط لکھا جس کا نہرو نے زبانی جواب دیا۔ انہوں نے لکھا کہ وہ جلد آسام آرہے ہیں اور میں ان سے آسام میں ہی جہاں میں ان دنوں مقیم تھا، ملاقات کروں۔ انہوں نے ملاقات کے لیے مقام، تاریخ اور وقت کا تعین بھی کر دیا تھا میں نے مقررہ وقت پر نہرو سے ملاقات کی۔ میں نے خوب باتیں کیں۔ نہرو نے مجھ سے کہا۔ "میری زندگی پھولوں کی سیج نہیں۔ آپ کو کافی مشکل دنیا آئے گی اور غیر یقینی صورتِ حال کا سامنا پڑے گا۔" میں نے انہیں اپنے واحد سیاسی تجربے کے بارے میں بتایا جو میں نے صرف کالج کی چار دیواری میں حاصل کیا تھا ڈراونکور میں کانگریس کی تحریک نہ ہونے کے برابر تھی۔ مگر سی۔ پی رام سوامی آئر کی ظالمانہ حکومت کے خلاف میں نے کالج کے طلباء کے مظاہرے کا اہتمام کیا تھا، اور امتناعی قوانین کو توڑا تھا۔ علاقے کی پولیس کا سربراہ میرے کالج میں آیا۔ اُسے اوپر سے ہدایت ملی تھی کہ طلباء کے مظاہرے کے "چودھری" کو گرفتار کر لیا جائے۔ اس نے بہت سے طلباء سے پوچھ گچھ کی مگر کسی نے میرا نام نہ لیا۔ میں نے نہرو کو یہ بھی بتایا کہ مدراس یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کرنے کے بعد میں نے ملازمت اختیار کر لی تھی کیونکہ مجھ پر والدین، چھوٹے

بھائیوں اور بہنوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری عاید ہوتی تھی۔ مَیں نے نہرو کو صاف صاف بتایا کہ مَیں نے شادی نہیں کی اور نہ ہی کوئی ایسا ارادہ ہے۔ مزید یہ کہ مجھے کسی مقصد کی تلاش ہے جس کے لیے میں اپنی زندگی وقف کر سکوں اور میں مقصد حیات کے لیے خطرات مول لینے سے بھی گریز نہیں کروں گا۔ نہرو سے رخصت ہونے سے قبل مَیں نے انہیں بتایا کہ میں مزید ایک ماہ آسام میں ہوں۔ اس کے بعد چند دن کے لیے والدین سے ملنے ٹراونکور جاؤں گا۔ نہرو نے مجھے الٰہ آباد آکر ملنے اور اپنے ہاں قیام کی دعوت دی تاکہ اِس دوران مَیں ان سے مزید بات چیت کر سکوں۔ ہم دونوں نے بات چیت کے دوران تو یہ سوچا بھی نہ تھا کہ انڈیا میں حکومت بدل سکتی ہے۔ حالانکہ ایک سال سے بھی کم عرصے میں حکومت تبدیل ہو چکی تھی۔

دسمبر ۱۹۴۵ء میں نہرو سے میری ملاقات آنند بھون (الٰہ آباد) میں ہوئی۔ ہم پھر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ وہ کیلوں، ناریل، مرچ مسالے اور کیرالہ کی میٹھے اور نمکین پانی والی جھیلوں پر گفتگو کرتے رہے۔ میں سنتا رہا میں نے انہیں کالیداس کا ایک شعر سنایا جس کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ کالیداس ملیالی تھا۔ اس پر نہرو خوب ہنسے اور بولے کہ ہمالیہ کی شان و شوکت کو چھوڑ کر کیرالہ ہندوستان کی سب سے خوبصورت جگہ ہے۔ مَیں نے انہیں بتایا کہ بندھیاچل اور مغربی گھاٹ کے علاقے تو ہمالیہ سے بھی قدیم ترین ہیں اور ٹراونکور میں ایک دو قصبے تو پانچ ہزار فٹ سے زاید بلندی پر آباد ہیں۔ پھر یہاں مراٹھوعہ کی پہاڑیاں ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہنومان انہیں ہمالیہ سے اٹھا کر لایا تھا۔ اور مغربی گھاٹ میں نصب کر دیا تھا۔ پنڈت نہرو کو ان باتوں کا علم نہیں تھا۔

الٰہ آباد سے میری واپسی سے قبل نہرو نے مایوسی کے عالم میں مجھے بتایا کہ وہ مجھے کسی قسم کی ادائیگی سے قاصر ہیں اور یہ کہ وہ میرا مستقبل تباہ کرنا نہیں چاہتے۔ مَیں نے نہرو سے کہا کہ مجھے روپے کی ضرورت نہیں۔ پھر مَیں نے ان کی مزید تسلی کے لیے یہ بھی بتا دیا کہ میرے پاس کتنی رقم ہے۔ اس پر انہوں نے تسلیم کیا کہ یہ رقم میرے گزارنے کے لیے کافی سے زیادہ ہے۔ مَیں نے انہیں صاف صاف بتایا کہ اپنے مستقبل کی فکر میں خود کروں گا۔ یہ جتانے کے لیے کہ میں آزاد منش انسان ہوں۔ مَیں نے نہرو سے یہ بھی کہا کہ "کسی مقصد کے لیے میں تنخواہ پر کام کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں گا۔" اب نہرو نے مجھ سے چند باتیں اور کیں، گویا وہ میری جانچ کر رہے ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ مَیں ان کے سیکرٹری کی حیثیت سے ان کے ساتھ ملایا (اب ملائشیا) کا دورہ کرتا۔ لیکن خود ہی کہنے لگے کہ مجھے پہلے اپنے والدین سے ملنے ٹراونکور جانا چاہیے۔ انہوں نے مجھے تلقین کی کہ مَیں فروری ۱۹۴۶ء میں الٰہ آباد پہنچ جاؤں۔ وہ فروری میں ملایا سے واپس آنے والے تھے۔ ملایا کے دورے پر وہ اپنے بہنوئی پرشوتم ہتھی سنگھ کو اپنے سیکرٹری کے طور پر ساتھ لے گئے۔

میں اپنا بہت سا سامان آنند بھون میں ہی چھوڑ کر ٹراونکور چلا گیا۔ یہاں کچھ دن ماتا پتا کے پاس گزار کر واپس الٰہ آباد آگیا۔ گھر جا کر مَیں نے دیکھا کہ پتاجی نے تمام جائیداد ہم بہن بھائیوں میں تقسیم کر دی ہے۔ اور خاصا بڑا حصہ میرے نام لگا دیا ہے۔ مگر مَیں نے اپنا حصہ اپنے بہن بھائیوں کو ہبہ کر دیا۔ میری ماتا اور پتاجی دونوں نے مجھے نہرو کے ساتھ کام کرنے سے روکا۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ نہرو کے ساتھ رہ کر مجھے جلد ہی جیل یاترا کرنا پڑے گی۔ اور ایسا ہی ہوا بھی۔

مَیں فروری ۱۹۴۶ء کے اوائل میں الٰہ آباد پہنچ گیا اور چند دن بعد ہی نہرو بھی ملایا سے واپس آگئے۔ مَیں نے سابقہ ملاقاتوں کے دوران ہی نہرو کو بتا دیا تھا کہ مَیں ایک ہفتہ ان کے ساتھ گزار کر بتا سکوں گا کہ مَیں ان کے کس طرح کام آسکتا ہوں۔ مگر اس کام میں مجھے چند دن ہی لگے۔ صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد مَیں نے محسوس کیا کہ نہرو کو ایک سیکرٹری کی اشد ضرورت ہے۔ اب تک ان کا کوئی سیکرٹری نہ تھا۔ وہ اپنی ڈاک وغیرہ بھی خود ہی فائل کرتے تھے۔ ان کی کتابوں، رائلٹی اور عام لین دین کے معاملات سخت ابتری کا

شکار تھے۔ مَیں نے نہرو کو بتایا کہ تمام صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میں ان کے سیکرٹری کے طور پر مفید کام کر سکتا ہوں۔ اور مَیں نے فیصلہ کیا ہے کہ مَیں ایک سال تک ان کے لیے یہ ناخوشگوار کام انجام دوں گا۔ اس پر نہرو نے نہایت مسرت کا اظہار کیا۔ اگرچہ مَیں نے انہیں نہیں بتایا تھا مگر میرا ارادہ یہ تھا کہ میں اپنے خرچ پر کسی کو ملازم رکھوں گا اور اسے ایک سال میں ضروری تربیت دے کر اس کام پر متعین کرا دوں گا اور خود اس روزمرہ کے کام سے آزاد ہو جاؤں گا۔ جلد ہی نہرو فالتو کام کے جھنجھٹ سے سبکدوش ہو گئے۔

یہ ۱۹۴۶ء کا ذکر ہے ایک روز کچھ امریکن جو مجھے پہلے سے جانتے تھے۔ نہرو جی کے درشنوں کے لیے انند بھون آئے۔ انہوں نے نہرو کے ساتھ مجھے دیکھتے ہی چلا کر کہا:

"اے میک" اس کے بعد تو نہرو اور خاندان کے تمام افراد مجھے میک ہی کہنے لگے۔ بعد میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن بھی مجھے اسی نام سے پکارتے رہے۔

جلد ہی لندن سے کیبنٹ مشن انڈیا کے دورے پر آگیا اور ہم دہلی اور شملہ میں اس کام میں پھنس گئے۔ پھر بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ اس اجلاس میں نہرو کو مولانا آزاد کی جگہ کانگریس کا صدر منتخب کر لیا گیا اور اس کے بعد وائسرائے لارڈ ویول کے ساتھ عبوری حکومت کے قیام کی بات چیت شروع ہو گئی۔ اسی دوران میں ہم کشمیر بھی گئے۔ جہاں ہمیں عین کشمیر کی سرحد پر گرفتار کر لیا گیا۔ اس طرح مجھے نہرو کی آخری قید میں رفیق بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ لیکن یہ قید ایک ہفتہ بعد ہی ختم ہو گئی۔

۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو جب عبوری حکومت قائم ہوئی تو نہرو مجھے اپنے ساتھ محکمہ خارجہ میں لے گئے۔ مَیں نے اسی روز شام کو انہیں بتایا کہ مَیں سرکاری ملازمت نہیں چاہتا۔ مَیں نے دوسرے دن دفتر جانے سے انکار کر دیا اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء تک مَیں نے سرکاری ملازمت اختیار نہ کی۔ اس پر نہرو مجھ سے خفا بھی ہوئے۔ مگر نہرو کی رہائش گاہ پر بھی کرنے کو بہت کچھ تھا۔ چنانچہ مَیں نے چند افراد کا انتخاب کیا اور نہرو کے گھر پر سیکرٹریٹ کھول دیا۔ اس سیکرٹریٹ کا عملہ نہرو کے سرکاری عملے کا ہی ایک حصہ تھا چنانچہ نہرو کا بیشتر اہم کام ان کی رہائش گاہ پر ہی انجام پاتا تھا۔ یہ طریقہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء تک آزاد ہندوستان کی حکومت کے قیام تک جاری رہا۔

عبوری حکومت میں عہدہ سنبھالتے ہی نہرو نے شمال مغربی سرحدی صوبہ کے قبائلی علاقہ کا دورہ کرنے کا ناخوشگوار فیصلہ کیا۔ یہ قبائلی علاقے امور خارجہ کے محکمہ کی علمداری میں تھے۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ میں اس وقت ایک "ولیرا اور شاندار کانگریسی" ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت قائم تھی۔ نہرو کو ہر طرف سے اس دورے پر نہ جانے کو کہا گیا۔ مگر نہرو اپنے فیصلے پر قائم رہے۔ میں بھی اس دورے میں ان کے ہمراہ تھا حالانکہ مجھے سرکاری امور سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ اس دورے کا نتیجہ خوشگوار نہ نکلا اور یہ محسوس کیا گیا کہ نہرو نے یہ دورہ کر کے سیاسی غلطی کی ہے۔ اس سے مسلم لیگ کو فائدہ پہنچا اور اسے صوبہ میں مقبولیت حاصل ہوئی۔

ستمبر ۱۹۴۶ء کے بعد کے دو سال نہایت مشکل اور میری زندگی کے المناک دن ثابت ہوئے۔ اس دوران کام کا بوجھ اتنا بڑھا کہ سونے کو بھی وقت نہیں ملتا تھا۔ ایسی بے شمار راتیں آئیں۔ جب میں آنکھ بھی نہ جھپک سکا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی ہر وقت بجتی رہتی تھی۔ اکثر کالیں ان مسلمانوں کی ہوتیں جن پر ہندو شرنارتھیوں کے وحشیانہ حملے ہوتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ آدھی رات کے بعد مجھے ٹیلی فون پر اطلاع ملی کہ ہندوؤں کے ایک ہجوم نے بدرالدین طیب جی کی کوٹھی پر حملہ کر دیا ہے۔ مَیں نے نہرو کی کوٹھی پر متعین حفاظتی گارد کی جیپ لانے کا حکم دیا اور ہدایت کی کہ چند سپاہی مسلح ہو کر آ جائیں۔ اس وقت نہرو بالائی منزل میں مصروف کار تھے انہوں نے جیپ کے انجن اور

سپاہیوں کے بوٹوں کا شور سنا تو بھاگتے ہوئے نیچے آئے اور مجھ سے پوچھا کیا معاملہ ہے
میں نے جواب دیا کہ بات کرنے کا وقت نہیں۔ چنانچہ وہ پھلانگ لگا کر جیپ میں آ
بیٹھے۔ میں ان کے اور ڈرائیور کے درمیان پس کر رہ گیا۔ جیپ چل پڑی اور میں نے راستے
میں انہیں ساری صورتِ حال بتائی۔ ہم جب موقع پر پہنچے تو دیکھا کہ بدر کا ہمسایہ دیوان
چمن لال حملہ آوروں کو روک رہا ہے۔ دیوان آدمی جیسا بھی تھا۔ مگر وہ فرقہ پرست
نہ تھا۔ ہمارے ساتھ مسلح پولیس کو دیکھ کر بلوائی بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہم نے چند سلح
سپاہی بدرالدین طیب جی کی کوٹھی پر متعین کر دیئے۔ بدر گھبرائے ہوئے تھے۔ مگر ان کا
عزم پختہ تھا اور وہ مایوس نہ تھے۔ بدر اور مغربی پنجاب کے ایک ممتاز خاندان کے فرزند
عظیم حسین دونوں آئی سی ایس تھے۔ انہوں نے تقسیم کے بعد ہندوستان کی خدمت کرنے
کا فیصلہ کیا تھا۔ اب دونوں ریٹائر ہو چکے ہیں۔ وہ ذاکر حسین کی طرح ہی محبِ وطن ہیں
جو قتل ہوتے ہوتے بچے تھے۔

۱۹۴۷ء کے موسمِ گرما کا ذکر ہے۔ مجھے ٹیلی فون پر اطلاع ملی کہ نئی دہلی کے ایک
چھوٹے سے ہوسٹل میں ایک مسلمان لڑکی خطرے میں ہے۔ میں نے پولیس والوں سے
جو نہرو کی کوٹھی پر متعین تھے۔ پستول لیا اور کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ کار کا ڈرائیور ایک
معمر مسلمان خالق تھا۔ وہ جوانی میں نہرو کے پتا موتی لال نہرو کا بھی ڈرائیور رہ چکا تھا۔
اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی۔ اس صورت حال میں اسے گھر سے باہر لے جانا ٹھیک نہ
تھا۔ مگر اس کے سوا کوئی اور موجود نہ تھا۔ ہم وہاں پہنچے تو اس لڑکی کے کمرے کے
سامنے ایک جوان سکھ بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کرپان تھی اور تیور خطرناک تھے۔ اُس
نے نفرت آمیز نظروں سے خالق کو دیکھا۔ سکھ انگریزی جانتا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ
یہاں سے چلا جائے۔ اس پر وہ بگڑ گیا اور کرپان سے مجھ پر حملہ کرنا چاہا۔ میں نے پستول نکال
لیا اور سختی سے کہا کہ "اگر تم دفع نہ ہوئے تو میں تمہیں چھلنی کر دوں گا۔" اس پر وہ بھاگ نکلا

اس دروازہ کھول کر اندر گیا۔ ایک نوجوان لڑکی چارپائی پر بیٹھی پتے کی طرح کانپ رہی تھی
میں دیکھ کر وہ چند منٹوں کے لیے مبہوت ہو گئی اور اس کے منہ سے بات ہی نہ نکلی۔ وہ
ناگپور کی مسلمان لڑکی تھی۔ اور دہلی میں سرکاری ملازمت کرتی تھی۔ بلوائیوں نے اس کا
سامان لوٹ لیا تھا۔ اس کی کل کائنات اس کے تن کے کپڑے اور ایک ساڑھی تھی، جو
ایک بکس میں پڑی تھی۔ میں نے خالق کو بھی اندر بلا لیا تاکہ لڑکی ایک مسلمان کو دیکھ کر یہ باور
کر لے کہ ہم اچھی نیت سے آئے ہیں۔ میں نے لڑکی کو ساتھ لیا اور نہرو کی رہائش گاہ پر
لے آیا۔ اُسے میں نے اندرا کے کمرے میں ٹھہرایا۔ جوان دنوں دہلی سے باہر گئی ہوئی تھی
چند دن بعد جب اس لڑکی کا خوف دور ہو گیا تو ہم نے اسے پولیس کی حفاظت میں بذریعہ طیارہ
ناگپور پہنچا دیا۔ بعد میں مجھے بتایا گیا کہ حالات درست ہونے پر وہ اپنی ملازمت پر واپس
دہلی آ گئی ہے۔

ان دنوں "فری پریس جرنل" نامی جریدے کا نامہ نگار جو جنوبی ہند کا برہمن تھا کام
میں میری رضاکارانہ مدد کیا کرتا تھا۔ وہ ان لاتعداد اخبارات کا مطالعہ کرتا جو نہرو کے
زیرِ مطالعہ نہیں آتے تھے۔ اور ان میں سے اہم نوعیت کی خبروں اور تبصروں کی کٹنگ
تیار کرتا۔ یہ فائل روزانہ نہرو کے مطالعہ کے لیے پیش کی جاتی تھی۔ ایک دن وہ چہل قدمی
کے لیے نہرو کی رہائش گاہ سے باہر گیا جہاں چاقوؤں سے مسلح ہندوؤں کے ایک گروہ نے
اسے گھیر لیا۔ وہ اسے مسلمان سمجھے تھے۔ اس نے شور مچایا کہ وہ ہندو ہے اور برہمن ہے
مگر وہ نہ مانے اور اسے پاس اتارنے کو کہا۔ مگر اس نے تامل کیا۔ کیونکہ بدقسمتی سے بچپن
میں کسی وجہ سے اس کا ختنہ کر دیا گیا تھا بس پھر کیا تھا۔ یہ گروہ اسے ختم کر دیتا۔ مگر اتنے
میں ایک روایتی برہمن جس کے سر پر اتی لمبی چوٹی اور ماتھے پر سیندور کا ٹیکا تھا ادھر آ نکلا
اس نے شور مچایا کہ یہ شخص برہمن ہے اور میں اسے جانتا ہوں۔ اس طرح میرے اس
ہندو دوست کی جان بچ گئی۔ بعد میں وہ وزارتِ خارجہ میں منتخب ہو گیا اور ترقی کرتے کرتے

سفیر کے عہدے پر پہنچ کر ریٹائر ہوا۔

یہ بڑے مشکل دن تھے۔ کھانے پینے کی اشیاء کا حصول آسان نہ تھا۔ دیوان چمن لال ہمیں کبھی کبھار انڈے اور بکرے کا گوشت بھیجا کرتا تھا۔ ایک روز ہمارے ایک ملازم نے جو گوا کا رہنے والا تھا بتایا کہ وہ ایک سالم بکرا حاصل کر سکتا ہے۔ اس کا گوشت فریزر میں رکھ لیتے ہیں جب نہرو کو اس کا علم ہوا تو وہ بہت بگڑے اور کہا کہ آئندہ ایسا ہوا تو وہ کھانا نہیں کھائیں گے۔ مگر ایسا کرنے کی ضرورت نہ تھی کیوں کہ میں نے سرکاری طور پر سپلائی کا انتظام کر لیا تھا۔

میری زندگی کا المناک ترین تجربہ نہرو کے ساتھ غیر منقسم پنجاب کا دورہ ہے۔ ہمیں ملتان، لاہور اور امرتسر میں معصوم لوگوں کی لاشوں اور تباہ شدہ عمارتوں کے ملبہ پر سے گزرنا پڑا۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دنیا کے سب سے بڑے تبادلۂ آبادی کو روبہ عمل دیکھا ایک کروڑ اسی لاکھ افراد گھر بار چھوڑ کر جا رہے تھے۔ چند سال بعد ایک دوست نے مجھ سے پوچھا "ظلم میں کون آگے تھا مسلمان یا سکھ"؟ میں نے جواب دیا "ایک فریق کے نصف درجن دوسرے کے چھ کے برابر تھے مگر ...... غالباً سکھ ایک قدم آگے تھے۔ اور ہندو بھی سکھوں سے پیچھے نہیں تھے"۔

نہرو کی رہائش ابھی ۱۷، یارک روڈ پر ہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ایک موٹی سی نوجوان لڑکی روزانہ صبح کو نہرو کی کوٹھی کے سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی اور کافی دیر تک کھڑی رہتی۔ میں ایک ہفتہ اسے برابر دیکھتا رہا۔ وہ غمزدہ سی دور کھڑی رہتی اور یہاں آنے والے دوسرے لوگوں کی طرح آگے بڑھ کر نہرو سے ملنے کی کوشش نہ کرتی۔ ایک دن جب نہرو دفتر چلے گئے تو میں نے اس لڑکی سے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ وہ میانوالی کی رہنے والی تھی اور بی اے۔ بی ٹی تھی۔ اس کا باپ اپنے ضلع کی کانگریس کا صدر تھا اس نے اپنا خاندان دوسرے لوگوں کے ساتھ شرنارتھیوں کی اسپیشل ٹرین میں دہلی بھیجا

دیا تھا۔ اور خود میانوالی میں مقیم رہا۔ تاکہ باقی ماندہ غیر مسلموں کا انخلا مکمل کرا سکے۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ اس کے علاقہ سے تمام غیر مسلم جو ہندوستان جانا چاہتے تھے۔ چلے گئے ہیں تو وہ خود بھی دہلی روانہ ہو گیا۔ مگر لاہور کے ریلوے سٹیشن پر اسے قتل کر دیا گیا۔ جب وہ مجھے اپنی کتھا سنا رہی تھی۔ تو موٹے موٹے آنسو اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔ میں نے لڑکی سے پوچھا کہ وہ کہاں رہتی ہے تو اس نے بتایا کہ کناٹ سرکس کے علاقہ میں ایک درخت کے نیچے ان کا ٹھکانہ ہے۔ میں لڑکی کو کار میں بٹھا کر کناٹ سرکس لے گیا جہاں اس کی غمزدہ ماں موجود تھی۔ میں نے اسے وہاں چھوڑا اور ہدایت کی کہ اگلے روز صبح سویرے نہرو کی کوٹھی پہنچ جائے۔ رات کو میں نے نہرو سے اس لڑکی کا تذکرہ کیا۔ نہرو بہت متاثر ہوئے اور بولے کہ میں اس لڑکی کے باپ کو جانتا ہوں۔ وہ بہت اچھا آدمی تھا۔ میں نے نہرو سے کہا کہ میں اس لڑکی کو ان کے سیکرٹریٹ میں ملازم رکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے ذمے یہ فرض ہو گا کہ نہرو کی رہائش گاہ پر آنے والے لٹے پٹے مہاجر اس سے مل کر اپنا حال بیان کریں تاکہ حکومت ان کی مناسب امداد کر سکے۔ نہرو فوراً آمادہ ہو گئے۔ میں نے بعض مشکلات کے بعد اس لڑکی کے لیے آسامی نکالی دوسرے روز وہ لڑکی آئی تو میں نے اسے اپنی تجویز سے آگاہ کیا۔ وہ مان گئی۔ چنانچہ اسے "افسر استقبالیہ" مقرر کر دیا گیا یہ مس وملا سندھی تھیں جو بعد میں دہلی کے معاشرتی حلقوں میں بڑی مقبول ہوئیں۔

انہی دنوں مجھے سڑک پر ایک بچہ روتا ہوا ملا۔ وہ انگریزی نہیں سمجھتا تھا اور مجھے ہندی نہیں آتی تھی۔ میں اسے نہرو کی کوٹھی پر لے آیا اور مس وملا سندھی کی مدد سے معلوم کیا کہ یہ بچہ مغربی پنجاب سے آیا ہے۔ اس کا باپ تو پہلے ہی مر چکا تھا اور دہلی آتے وقت راستے میں وہ اپنی ماں سے بھی بچھڑ گیا۔ اب اس کا کوئی نہ تھا۔ میں نے بچے کو جوتے کپڑے دلائے اور اپنے کمرے میں ایک ماہ تک ساتھ رکھا۔ نہرو کی اس کوٹھی کا مالک جو ایک مالدار مگر بے اولاد شخص تھا مجھ سے کہنے لگا کہ میں یہ بچہ اسے دے دوں۔ وہ اسے تعلیم دلائے گا اور بیٹوں کی طرح پالے گا اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور بچے کو ایک نہایت عمدہ سکول میں داخل کرا دیا۔ جہاں بچہ ہوسٹل میں

رہتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اس بچے کی ماں بھی مل گئی۔ جو بچے کو اس حال میں دیکھ کر بیحد خوش ہوئی نہرو کی کوٹھی، ایارک روڈ کے مالک نے اس کی مالی امداد بھی کی۔ بچہ پڑھنے میں زیادہ اچھا نہ تھا مگر کھینچ تان کر اس نے میٹرک کر لیا۔ پھر میں نے اسے وزیراعظم کے سیکرٹریٹ میں بطور کلرک ملازم رکھوا دیا۔ حکومت نے اسے ایک پلاٹ الاٹ کیا جس پر مکان کی تعمیر میں نہرو اور میں نے اس کی مدد کی۔ موہن اب بھی وزیراعظم کے سیکرٹریٹ میں کلرک ہے اور مجھے پتا جی کہہ کر پریشانی میں مبتلا کرتا رہتا ہے۔ ہاں وہ اپنی ماں کا بیحد تابعدار ہے۔

اگست ۱۹۴۶ء کے آغاز میں نہرو نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ مجھے ان کے سیکرٹریٹ میں بھی کام کرنا چاہئیے۔ میں نے ان سے کہا کہ فائلوں سے مجھے نفرت ہے اور میں نہیں جانتا کہ سیکرٹریٹ میں اور کیا کام ہو سکتا ہے۔ نہرو نے کہا کہ میں خود سیکرٹریٹ میں جا کر جائزہ لوں پھر کہا "پندرہ اگست سے ہماری اپنی حکومت قائم ہو رہی ہے۔ اگر تم سیکرٹریٹ سے الگ رہے تو تمہیں معلوم ہی نہ ہو سکے گا کہ کیا ہوا ہے۔ کیوں کہ میرا زیادہ تر کام سیکرٹریٹ میں ہو گا۔ پھر میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ مجھے ہر وقت سرکاری افسر گھیرے رہیں۔" چار و ناچار مجھے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔

نہرو کے ایما پر وزارتِ خارجہ کا سیکرٹری جنرل جے راج شنکر باجپائی ایک شام نہرو کی قیام گاہ پر آیا۔ اور مجھ سے حکومت میں میرے تقرر پر بات چیت کی۔ اس نے بتایا کہ تجویز یہ ہے کہ مجھے وزیراعظم کا پرسنل پرائیویٹ سیکرٹری مقرر کر دیا جائے اور وزیراعظم تک جو بھی فائل جانے والی ہو وہ میرے پاس سے ہو کر جائے۔ پھر میں نہرو کے حکم پر کوئی بھی غیر سرکاری کام کرنے میں آزاد ہوں گا۔ میں نے باجپائی کو بتایا کہ میں وزیراعظم کے سیکرٹریٹ میں اپنے لئے کام خود ہی تلاش کروں گا۔ میں نے یہ شرط بھی پیش کی کہ میری ملازمت وزیراعظم سے ہی منسلک ہو۔ میری تمام شرائط مان لی گئیں۔ پھر باجپائی نے مجھ سے تنخواہ کے بارے میں پوچھا کیونکہ نہرو کی ہدایت تھی کہ میری تنخواہ میری مرضی کے مطابق مقرر کی جائے۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے تنخواہ کی ضرورت نہیں۔ اس نے کہا کہ سرکاری ملازمت میں تنخواہ تو ضرور مقرر

ہو گی۔ چنانچہ میں نے کہا کہ میری تنخواہ عبوری طور پر پانچ سو روپے ماہوار مقرر کر دی جائے اور مجھے کوئی خاص گریڈ نہ دیا جائے۔ اس سے وہ خاصا محظوظ ہوا اس کا خیال تھا کہ میں کوئی سنکی ہوں۔ اس نے تمام معاملہ نہرو کے سامنے پیش کیا۔ نہرو نے اس سے کہا کہ میں جو وہ کہتا ہے کر دو۔ تنخواہ اس کی فرمائش سے زیادہ مت لگانا۔" چنانچہ باجپائی نے مجھ سے مزید بات چیت کئے بغیر میری تنخواہ ساڑھے سات سو روپے مقرر کر دی۔ حالانکہ ایک اسسٹنٹ پرائیویٹ سیکرٹری کی تنخواہ اس سے دوگنا تھی۔ مگر مجھے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ کیوں کہ میرے ذہن میں یہ کبھی نہیں آیا کہ کسی شخص کی قدر و قیمت کا تعین اس کی تنخواہ سے کیا جاتا ہے۔ مجھے دوسرے سرکاری ملازموں کی طرح نہ تو طبی معائنے کے لئے پیش ہونا پڑا اور نہ ہی دوسرے سیکرٹریوں کی طرح حلف نامے پر دستخط کرنے پڑے۔

وزیرِ خزانہ نے جب غیر پیداواری محکموں میں بچت کی اپیل کی تو میں نے ایک سال تک تنخواہ وصول نہ کی۔ اس کے تھوڑے دن بعد کوئی ایسی بات ہوئی جس سے مجھے بیحد غصہ آیا۔ معاملہ ٹرین میں میرے سفر کا تھا۔ وزیراعظم کے سیکرٹریٹ میں ایڈمنسٹریٹو افسر نے مجھے بتایا کہ میں درجہ دوم میں سفر کا حقدار ہوں۔ میں نے اس سے کہا کہ میں سیکنڈ کلاس میں سفر نہیں کرنا چاہتا مجھے تھرڈ کلاس ٹکٹ دیا جائے۔ وہ معاملہ وزیراعظم تک پہنچا۔ انہوں نے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ درجہ اول میں سفر کرنے والے افسر کی تنخواہ کم از کم پندرہ سو روپے ماہوار تک ہونی چاہیئے۔ چنانچہ نہرو نے حکم دیا کہ میری تنخواہ پندرہ سو روپے ماہوار مقرر کر دی جائے۔ اس کے ساتھ ہی میرے ایما پر میرے عہدہ کا نام اسپیشل اسسٹنٹ ٹو پرائم منسٹر (وزیراعظم کا خصوصی معاون) رکھ دیا گیا۔ اس وقت حکومت کے کسی اور افسر کا یہ عہدہ نہ تھا۔ میں نے ا… دورہ منسوخ کر دیا اور اس کے بعد سرکاری خرچ پر کبھی ریل میں سفر نہیں کیا۔

جب این آر پلائی کابینہ کا سیکرٹری مقرر ہوا۔ تو وزیراعظم نے اسے ہدایت کی کہ مجھ سے برابر رابطہ رکھے۔ پلائی نے انڈین سول سروس کے تمام ارکان کی فائلیں مجھے بھیج دیں جن میں ان افسروں کی کارکردگی کے بارے میں رپورٹیں درج تھیں۔ پلائی کا خیال

کہ اس سے مجھے ان لوگوں کے پس منظر کا علم ہو جائیگا۔ جو وزیراعظم کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ میں روزانہ رات گئے تک ان فائلوں کا مطالعہ کرتا۔ دو مہینوں میں یہ کام ختم ہو گیا۔ میں برطانوی افسروں کی اپنے جونیئر افسروں کی رپورٹوں سے بڑا متاثر ہوا۔ یہ رپورٹیں مخصوص مقصد کو سامنے رکھ کر لکھی جاتی تھیں مگر ان میں سیاسی رنگ آمیزی نہیں ہوتی تھی۔

وزیراعظم کے سیکرٹریٹ میں جب سے میں نے فرائض سنبھالے تھے تمام فائل اور کاغذ میرے توسط سے ہی وزیراعظم کو پیش کئے جاتے تھے۔ اگر کوئی فائل سیدھی وزیراعظم کے پاس جاتی تو وزیراعظم اسے خود میرے پاس بھیج دیتے۔ پھر کوئی فائل یا کاغذ دوسرے محکمے کو میرے توسط کے بغیر نہیں جاتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جب تک نہرو کام کرتے رہتے۔ مجھے بھی بیٹھنا پڑتا۔ بلکہ بعض اوقات تو میں ان کے بعد بھی فائلیں نمٹاتا رہتا۔ ایوان وزیراعظم میں اکثر میں کھانا بھی رات گئے اکیلا اپنے مطالعہ کے کمرے میں کھاتا۔ یہاں میں ساتھ ساتھ کام بھی نمٹاتا جاتا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وزیراعظم کی بہترین مدد یہ ہے کہ ہر معاملے میں انہیں صحیح اطلاع بہم پہنچائی جائے۔ میں معاملات اور مسائل کا مطالعہ کرتا اور حکومت کے اندر اور باہر صاحب الرائے اشخاص سے مشورہ لیتا اور وزیراعظم کو تمام اطلاعات بہم پہنچاتا۔ میں خارجہ امور میں خاص طور پر دلچسپی نہیں لیتا تھا کیوں کہ خارجہ امور کا مطلب "تیکوں سے لڑائی" تھا اور میں کرشنا مینن کو "بین الاقوامی تیکہ جگجو" کہا کرتا تھا۔

ولبھ بھائی پٹیل کی وفات کے بعد وزراء ارکان پارلیمنٹ اور سینئر سرکاری افسر مجھے "نائب وزیراعظم" "تخت کے پیچھے اصلی قوت" اور اس طرح کے دوسرے الفاظ سے یاد کرنے لگے۔ اس سے مجھے بڑی پریشانی ہوئی۔ اپنی خود نوشت سوانح میں سی ڈی دیش مکھ نے تو مجھے "وزیراعظم کا طاقت ور ترین معاون" قرار دے دیا۔ چند ایک کے سوا میں وزراء وغیرہ کی کوئی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ کیوں کہ یہ اوسط درجہ کے یا اس سے بھی کمتر لوگ تھے۔ یہ درست ہے کہ کوئی فائل یا کاغذ جس میں کسی نوع کی سفارش کی گئی ہو میرے مطالعہ

کے بعد وزیراعظم کے پاس نہیں جاتی تھی۔ اگر میں کسی فائل یا سفارش پر اظہار رائے ضروری سمجھتا تو ایک الگ کاغذ پر اپنی رائے یا تبصرہ لکھ کر ساتھ لگا دیتا۔ میرے تبصرے یا نوٹ فائل کا حصہ نہیں ہوتے تھے کیوں کہ جب فائل وزیراعظم سے واپس میرے پاس آتی تو ایسے نوٹس یا تبصرے فائل سے الگ کر دیئے جاتے۔

۱۹۵۲ء کے موسم برسات کا ذکر ہے ایک روز میں وزیراعظم کے ساتھ کار میں دفتر جانے کے لئے تیار کھڑا تھا کہ مجھے ایک تار موصول ہوا۔ یہ تار میرے پتاجی کی موت کا تھا۔ ان کا دیہانت ۸۴ سال کی عمر میں ہوا تھا۔ میں نے تار جیب میں رکھ لیا۔ اور چہرے پر کسی قسم کے تاثرات لئے بغیر وزیراعظم کے ساتھ دفتر چلا گیا۔ میں سارا دن بدستور کام کرتا رہا۔ اور کسی کو اس واقعہ کا علم نہ ہو سکا۔ ۱۹۵۰ء میں جب میں چند گھنٹوں کے لئے کیرالہ میں اپنے گھر گیا تھا تو میں نے اپنے بہن بھائیوں سے کہا تھا کہ اگر ماتاجی یا پتاجی کو کچھ ہو جائے تو وہ لوگ یہ اطلاع دیں کہ میں اطلاع ملتے ہی پہنچ جاؤں گا۔ کیوں کہ اس علاقہ میں فضائی سروس بیحد ناقص تھی۔ چار دن بعد — یہ اتوار کا دن تھا — میں وزیراعظم کے ساتھ ہی دفتر سے ایوان وزیراعظم دوپہر کے کھانے کے لئے آیا۔ ایک ملازم سہنا نے مجھے ایک اور تار تھما دیا جس میں میری ماتا کی موت کی اطلاع دی گئی تھی۔ سہنا نے از خود تار کھول کر پڑھ لیا تھا اور اندرا سمیت گھر میں سب لوگوں کو بتا دیا تھا۔ میرا کھانے کو جی نہ چاہا اور میں سیدھا اپنے کمرے میں جا کر لباس تبدیل کئے بغیر بستر پر پڑ گیا۔ شام کو نہرو اور اندرا نچلی منزل میں آئے تو میں حسب معمول مطالعہ کے کمرے میں مصروف تھا۔ میرے چہرے پر نہ تو کرب کے آثار تھے اور نہ حرکات سے بے چینی عیاں تھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ صرف چار روز قبل پتاجی کا بھی انتقال ہو چکا ہے اور یہ کہ پتاجی کے انتقال کے بعد سے ماتاجی بے ہوش تھیں اور کوما میں چل بسیں۔ اس دوران وہ ایک مرتبہ مختصر سے وقفے کے لئے ہوش میں آئیں۔ اس وقت تیز بارش ہو رہی تھی ان کو بڑبڑاتے سنا گیا "سردی ہے۔ اسے سردی

لگ رہی ہو گی۔" اس کے بعد وہ پھر بیہوش ہو گئیں۔ کبھی ہوش میں نہ آنے کے
ان کی عمر ۸۱ سال تھی۔ میرے پتا اور ماتاجی کی شادی ستر سال رہی۔ ان میں جھگڑے بھی ہو
اور انہوں نے سرد و گرم وقت بھی گزارا۔ ان کی خوشیاں اور غم سانجھے تھے۔ دونوں میں
بیحد محبت تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں اس قدر پیار و محبت کسی اور میاں بیوی میں نہیں
دیکھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ موت بھی انہیں ایک دوسرے سے جدا نہ کر سکی۔ اور وہ اکٹھے
ہی مرے۔

وزیراعظم خاموش بیٹھے میری باتیں سنتے رہے اندرا نے کہا "باپو کھانا کھانے کے بعد آپ
کے کمرے میں آئے تھے۔ مگر آپ سو رہے تھے۔" میں نے اپنے کمرے کا غمگین ماحول بدلنے
کے لئے کہا۔ "اس کا مطلب تو یہ ہے کہ میرے ضمیر پر کسی طرح کا کوئی بوجھ نہیں ہے" اندرا نے
برجستہ جواب دیا۔ "مگر اس کا یہ مطلب بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ کا ضمیر ہے ہی نہیں"۔ اس پر نہرو
بہت محظوظ ہوئے۔ اندرا بھی مسکرا دی۔ میں نے بھی جوابی چوٹ کی۔ "یہ واحد ذہانت آمیز فقرہ
ہے جو تم نے اپنی ساری عمر میں کہا ہے"۔ نہرو میرے جواب پر بھی مسکرائے۔

نہرو صرف ایک بار آپے سے باہر ہو کر مجھ پر برسے۔ حالانکہ اس میں میرا کوئی قصور
نہ تھا۔ مجھے بھی غصہ آ گیا اور میں بھی آپے سے باہر ہو گیا۔ میں دو دن تک منہ پھلائے رہا
تیسرے دن نہرو نے مجھے بلا بھیجا۔ میں گیا تو انہوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ یہ اُن کا
روٹھوں کو منانے کا ایک انداز تھا۔ میں نے کہا "مجھے افسوس ہے۔ مجھے ضبط سے کام لینا چاہیے
تھا۔ یقیناً" اس وقت آپ کسی وجہ سے پریشان ہوں گے۔ میں نے پہلے بھی آپ کو غصہ میں آتے
دیکھا ہے۔ مگر ایسا صرف اس وقت ہوا۔ جب آپ نے کسی کی حماقت دیکھی یا اخلاق سے گری
ہوئی بات نوٹ کی۔ پھر میں نے انہیں یونان کے ایک فلسفی کا قصہ سنایا۔ جس نے لائبریرین
پر صرف اس لئے حملہ کر دیا تھا کہ لائبریری میں سقراط کے متعلق وہ کتاب موجود نہ تھی جو وہ فلاسفر
پڑھنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا کہ ذہنی طور پر میں اس فلسفی کی حرکت کو درست سمجھتا ہوں۔" اس پر نہرو مسکرا دئے۔

... ہو گئی۔

ستمبر ۱۹۵۶ء کے بعد سے نہرو کا یہ معمول تھا کہ وہ اتوار کو اور دوسری تعطیلات پر بھی
دفتر میں کام کیا کرتے تھے۔ ان دنوں کام کا رش تھا۔ انہیں رات کو بمشکل پانچ گھنٹے آرام
... ملتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اجلاسوں کے دوران اُونگھ جاتے تھے۔ میں چاہتا
تھا کم از کم اتوار اور دوسری تعطیلات پر وہ دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کر لیا کریں۔ مگر
... کہنے کا کوئی فائدہ نہ تھا کیوں کہ وہ اپنی صحت پر بیحد نازاں تھے۔ چنانچہ میں نے ان
کے انسانی جذبات کو اپیل کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ایک دن نہرو سے کہا کہ دفتر میں ان
کے پرسنل اسسٹنٹ اور دوسرے ملازم بال بچے دار لوگ ہیں اور ان کی خواہش ہو گی کہ وہ
اپنی اہلیہ اور بچوں کو کبھی کبھار گھما پھرا کیں سینما لے جائیں یا کچھ خرید و فروخت کریں۔ آپ کو
ان کی بھلائی اور خوشی کے پیش نظر اتوار اور دوسری تعطیلات پر سہ پہر دفتر نہیں جانا چاہیئے
میں ایسا انتظام کر دوں گا کہ ایک یا دو پی اے ان دنوں وزیراعظم ہاؤس میں موجود رہیں اگر زیادہ کام
ہو تو میں خود بھی موجود ہوں گا۔ نہرو اس پر رضامند تو ہو گئے۔ مگر انہوں نے کہا "آدمی کام کرنے
سے کبھی نہیں مرتا" میں نے جواب دیا۔ "زیادہ کام سے آدمی کی شگفتگی متاثر ہوتی ہے"۔ میری توقع
کے مطابق اس کے بعد نہرو اتوار اور دوسری تعطیلات پر دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کرنے
لگے۔ پھر میں نے پی اے اور دوسرے افسروں سے کہا کہ وہ ہفتہ میں ایک دو دن آرام کریں۔ پھر
میں نے ان کے لئے خاص الاؤنس منظور کرا دیا۔ جو پی اے رات کو ڈیوٹی پر ہوتے اُن کے
لئے میں نے ایوان وزیراعظم کے قریب ہی سرکاری رہائش گاہیں فراہم کیں۔ وہ سب گھڑی دیکھے
بغیر محنت سے اور متواتر کام کرتے تھے۔ بعد میں وزیراعظم نے یہ عادت بنا لی کہ دوپہر کے
کھانے کے بعد وہ نصف گھنٹہ کے لئے لیٹ جاتے تھے۔

نہرو جو اپنے دور میں دنیا کے پانچ بہترین انگریزی لکھنے والوں میں سے ایک تسلیم
کئے جاتے تھے روزمرہ کے سرکاری اعلانات کے سوا کسی دوسرے نوٹ پر دستخط نہیں کرتے

تھے۔ جس کا مسودہ خود ان کا تیار کردہ نہیں ہوتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا بیشتر وقت خطوط لکھوانے، بیانات کے مسودے تیار کرنے اور تقریریں لکھوانے میں صرف ہو جاتا تھا۔ مگر میرے تیار کردہ مسودہ کو وہ عام طور پر پسند کرتے تھے۔ چنانچہ جب وزیراعظم کے دستخطوں کے بعد بیانات وغیرہ میرے پاس آتے تھے تو میں ان میں سے بعض کو روک لیتا تھا۔ یہ خطوط یا بیانات نہرو رات گئے لکھواتے تھے جب وہ کام کرتے کرتے تھک چکے ہوتے تھے۔ میں ان کو دوبارہ لکھتا۔ اور وزیراعظم کے دستخطوں کے لیے بھیج دیتا۔

نہرو کی بعض بہترین تقاریر وہ ہیں جو یا تو انہوں نے فی البدیہہ کی تھیں یا انہوں نے نہایت سکون کے ساتھ خود لکھی تھیں، جب کسی بات پر وہ جذبات میں آئے ہوتے۔ گاندھی جی کے قتل کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے انہوں نے جو یہ فقرہ کہا تھا کہ "روشنی گل ہو گئی ہے"۔ ان کی تقریر میں درج نہ تھا۔

۱۹۵۱ء کے اواخر میں میری خواہش تھی کہ ایس۔ ڈی۔ اوپادھیا کو لوک سبھا کا رکن منتخب کرایا جائے۔ اوپادھیا نے نہرو اور اس سے قبل ان کے والد موتی لال نہرو کی بڑی خدمت کی تھی۔ ایک روز جب میں نہرو کے ساتھ دانتوں کے ڈاکٹر کے کلینک پر جا رہا تھا میں نے راستے میں نہرو سے اس سلسلے میں بات کی تو انہوں نے فوراً ہی رد عمل کا اظہار کیا نہرو نے کہا "بھلا وہ پارلیمنٹ میں جا کر کیا کرے گا۔ وہ اس کام کا ہرگز اہل نہیں"۔ اس پر میں نے کہا کہ اوپادھیا کانگریس کے پچاس فیصد ارکان پارلیمنٹ کی مانند اچھا یا بُرا ثابت ہو گا۔ اس پر نہرو خاموش ہو گئے اور بالآخر اوپادھیا لوک سبھا کا رکن منتخب کر لیا گیا۔ اس کے بعد سے وہ لوک سبھا یا راجیہ سبھا کا رکن منتخب ہوتا رہا اور اب ریٹائرڈ رکن پارلیمنٹ کی حیثیت سے پنشن لے رہا ہے اگر کسی شخص کو اس بات پر انعام دیا جائے کہ اس نے پارلیمنٹ کی طویل رکنیت میں ایک بار بھی منہ نہیں کھولا تو یہ انعام اوپادھیا کو ملنا چاہیے۔

سرکاری ملازمت کے دوران میں نے وزیراعظم، کسی وزیر یا سرکاری افسر سے اپنے

ذاتی مفاد کے لیے کوئی کام نہیں کرایا۔ مجھے اس بات سے شدید نفرت ہے کہ میں کسی کے سامنے اپنی غرض کے لیے عرض مدعا کروں۔ نہ ہی میرے کسی رشتہ دار نے میری وجہ سے سرکاری ملازمت یا کوئی اور مفاد حاصل کیا ہے۔ مگر میں کسی بھی فرد سے ناانصافی ہوتے نہیں دیکھ سکتا اور ایسے مواقع پر خود براہ راست یا وزیراعظم کے توسط سے مداخلت کیا کرتا تھا۔ یہ بات درست ہے کہ لاتعداد وزراء، گورنروں اور غیر سرکاری سفیروں کے تقرر میں میرا ہاتھ رہا ہے۔ مگر ان میں سے کوئی بھی میرا رشتہ دار نہ تھا۔ میرے اور نہرو کے درمیان مکمل مفاہمت اور ہم آہنگی تھی۔ بعض اوقات وہ میرے فیصلے کو رد کر دیتے تھے۔ مگر انہیں کبھی میری نیت پر شبہ نہیں ہوا وہ مجھے اپنا رفیق کار تصور کرتے تھے اور جانتے تھے کہ اس کے سوا میں کوئی دوسری حیثیت برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے بعض اہم افراد کے تقرر میں روڑے بھی اٹکائے۔ نہرو کی بہن مسز وجے لکشمی پنڈت کے سفیر مقرر ہونے کے بعد نہرو نے اپنے بہنوئی ہٹھی سنگھ کو ملایا میں کمشنر مقرر کرنا چاہا۔ ہٹھی سنگھ نے ۱۹۴۸ء میں نہرو کے سیکرٹری کی حیثیت سے نہرو کے ساتھ ملایا کا دورہ کیا تھا اور نہرو کی واپسی پر وہ مزید دو ہفتے ملایا میں ٹھہرے تھے تاکہ اس ملک میں آباد ہندوستانیوں کے حالات کا مطالعہ کر سکیں۔ جب نہرو نے ہٹھی سنگھ کو ملایا میں کمشنر مقرر کرنے کی تجویز پیش کی تو دولت مشترکہ کے شعبے کے دو سینئر افسر خفیہ طور پر مجھ سے ملے انہوں نے استدعا کی کہ میں ہٹھی سنگھ کے تقرر کو رد کروں۔ میں نے راست اقدام کا فیصلہ کیا اور ہٹھی سنگھ سے ملا جو ان دنوں دہلی میں تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ "آپ جیسے پڑھے لکھے اور عظیم پس منظر رکھنے والے شخص کے لیے ایسا تقرر شایان شان نہیں جس کا رتبہ ایک سفیر کے برابر بھی نہیں ہے۔ آپ امیر کبیر شخص ہیں۔ بھلا آپ کیوں خود کو ذلیل کرنا چاہتے ہیں"۔ تیر نشانے پر بیٹھا۔ ہٹھی سنگھ نے کہا "میں آج شام ہی بھائی صاحب سے بات کروں گا کہ مجھے یہ عہدہ نہیں چاہیے"۔ اس طرح ہٹھی سنگھ کا تقرر ٹل گیا۔ جس کے بعد نہرو پر اقربا پروری کا الزام عائد کیا جا سکتا تھا۔ اس کے چند ماہ بعد میں نہرو کے ساتھ ہوائی اڈے پر جا رہا تھا میں نے راستے میں ان سے ہٹھی سنگھ کے معاملہ کا ذکر کیا۔ میں نے ان سے اپنی بڑی بہن کے بیٹے کا بھی ذکر کیا۔ میری بیوہ بہن کا [illegible]

کی تلاش میں آیا تھا مگر میں نے اسے واپسی کا کرایہ اور اخراجات کے لئے کچھ رقم دے کر واپس بھیج دیا۔ حالانکہ وزیرِ اعظم کے سیکرٹریٹ میں ایک آسامی خالی تھی۔ جہاں میرے بھانجے کا تقرر ہو سکتا تھا اس پر میری بہن کو سخت صدمہ پہنچا۔ نہرو بولے کہ "تم نے کوئی عقلمندی کا کام نہیں کیا۔" میں نے کہا کہ ایسے معاملات میں مجھے بیوقوف بننا پسند ہے۔ پھر میں نے وزیرِ اعظم سے پوچھا کہ آپ نے اپنی ایک تقریر میں نہیں کہا تھا کہ "عوامی زندگی کے حامل شخص کو ٹھیک ٹھاک ہونا چاہیئے بلکہ ایسا نظر بھی آنا چاہیئے۔" اس کا نہرو کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

صدی کی چھٹی دہائی کے وسط میں ایک وزیرِ مملکت اپنی حماقت کے باعث مشکل میں مبتلا ہو گیا۔ اسے ملک کی نمائندگی کے لئے اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں بھیجا گیا تھا۔ وہ بال بچے دار امیر شخص تھا۔ مگر جاتے ہوئے وہ اپنے ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی لے گیا۔ وہ نیویارک، لندن اور پیرس کے ہوٹلوں میں "میاں بیوی" کی حیثیت سے ایک ہی کمرے میں قیام کرتے رہے اس کے کچھ عرصہ بعد یہ لڑکی اپنا سامان اٹھا کر دہلی میں وزیر صاحب کے گھر پہنچ گئی اور وہاں قیام پر اصرار کرنے لگی اس نے یہاں تک کہا کہ اسے نوکرانی کی حیثیت میں ٹھہرا لیا جائے اس پر وزیر اور اس کی بیگم بیحد پریشان ہوئے۔ انہوں نے اسے گھر سے تو نکال دیا مگر وہ قریب ہی کوارٹر کرائے کر رہنے لگی اس نے متعدد اہم افراد سے ملاقات کی اور وزیر صاحب سے اپنے تعلقات کے بارے میں بتا کر شکایت کی۔ ایک روز جب میں اور نہرو دفتر جا رہے تھے اس نے راستے میں ہمیں روک لیا۔ اس نے نہرو کے کان میں کچھ کہا جب دوپہر کو ہم گھر گئے تو نہرو نے مجھے وزیر صاحب کو بلانے کے لئے کہا۔ میں نے اسے ٹیلیفون کیا۔ شام کو وہ میرے دفتر میں آیا اور سب کچھ مجھے بتا دیا۔ میں نے فوراً اسے ایک سادہ کاغذ دیا اور کہا کہ کابینہ سے مستعفی ہو جاؤ۔ چنانچہ میرے ایما پر اس نے وزیرِ اعظم کے نام استعفا لکھ دیا جو میں نے اسے لکھوایا۔ میں نے وزیر کو دو دن بعد آنے کے لئے کہا۔ اس روز پیر تھا وہ ایک متمول رکن پارلیمنٹ مسٹر ملیہ کے ساتھ اسمبلی کی عمارت کے اندر میرے دفتر میں آیا میں نے اس سے کہا کہ تم نے اپنا اور اس عورت کا نام میاں بیوی کی حیثیت سے ہوٹل کے رجسٹر میں لکھ کر سخت حماقت کی ہے کچھ

لوگوں کو اس کا علم ہو گیا ہے اور انہوں نے تمہیں بلیک میل کرنے کے لئے اس عورت کو دہلی بھیجا ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ تم اس کو کچھ دے دلا کر خاموش کر دو۔ اسے کتنی رقم دی جائے اس کا فیصلہ مسٹر ملیہ کر دیں گے۔ چنانچہ ملیہ نے فیصلہ دیا کہ وزیر صاحب چونکہ خاصے متمول ہیں لہٰذا اپنی حماقت کی قیمت پچاس ہزار روپے ادا کریں۔ دو دن کے اندر اس عورت کو رقم ادا کر دی گئی اور وہ خاموشی کے ساتھ دہلی سے چلی گئی۔ میں نے وزیرِ اعظم کو سارا ماجرا سنایا اور وزیر کا استعفا بھی دے دیا۔ مگر نہرو نے دو دن بعد استعفا منظور نہ کرنے کا فیصلہ کیا اس طرح یہ وزیرِ مملکت محرومی سے بچ گیا۔ بعد میں ترقی کرتے کرتے وہ اندرا کابینہ میں وزیر بن گیا مگر وہ سب سے کمینہ اور ذلیل وزیر ثابت ہوا اس نے پہلے تو اندرا کے بیٹے سنجے پر ڈورے ڈالے اور اسے اپنے صوبہ میں لے گیا اس طرح سنجے کو سیاست کا چسکا پڑ گیا۔ اس نے سنجے کے اعزاز میں سرکاری خرچ پر ایک جلسے کا اہتمام کیا اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے اس نے کہا کہ میں نے آپ کے نانا (نہرو) کی غلامی کی ہے۔ اب آپ کی ماں کی غلامی میں ہوں اور آئندہ آپ کا بھی غلام رہوں گا۔" تاہم اب پتہ نہیں کہ وہ کس کی غلامی میں ہے۔

خوشامد کرنا میری فطرت کے خلاف، نہرو، رام منوہر لوہیا۔ کامتھ یا راج نرائن کی سرعام نکتہ چینی سے جتنے مشتعل ہوتے تھے۔ میں نے اندرونِ خانہ ان سے زیادہ نہرو کو ناراض کیا ہے۔ ایک مرتبہ انڈیا ہاؤس لندن میں کوئی دعوت تھی۔ اس میں اٹیلی اور دوسرے ممتاز برطانوی رہنما شامل ہوئے۔ نہرو دعوت کے دوران ایک کونے میں کھڑے لیڈی ماؤنٹ بیٹن سے باتیں کر رہے تھے۔ کرشنا مینن نے مجھ سے کہا کہ "لوگ نہرو اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن کے اس طرح الگ تھلگ کھڑے ہو کر باتیں کرنے پر تبصرے کر رہے ہیں۔ آپ جا کر نہرو اور لیڈی کی باتیں ختم کرائیں تاکہ نہرو گھوم پھر کر دعوت کے تمام شرکاء سے مل سکیں۔" میں نے مینن سے کہا کہ یہ میرا کام نہیں۔ اس دعوت کے میزبان آپ ہیں اور یہ آپ کا کام ہے کہ نہرو کو ساتھ لے کر سب سے ملائیں۔ مگر کرشنا مینن میں تو کوئی اچھا کام کرنے کی صلاحیت

ہی نہیں تھی۔ اسی قسم کی دو تین اور دعوتیں آئندہ چند دنوں میں ہونے والی تھیں اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وزیرِاعظم یوں کسی ایک شخصیت سے چپک کر رہ جائیں۔ میں نے رات کو ایک نوٹ لکھا اور وزیرِاعظم کو بھجوا دیا۔ میں نے نہرو کو مطلع کیا کہ ان کی اس حرکت کا ناخوشگوار اثر ہوا ہے اور لوگوں کو خواہ مخواہ باتیں بنانے اور گپ بازی کا موقع ملا ہے۔ میں وزیرِاعظم سے اس معاملہ پر دوبدو بات چیت کر کے انہیں شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرے اس نوٹ کا اچھا اثر ہوا۔ اور دوسری دونوں دعوتیں ٹھیک ٹھاک گزریں۔ دراصل میں اس بات کی پرواہ نہیں کرتا تھا کہ کوئی میرے متعلق کیا کہے گا یا کیا سوچے گا۔ میں دیکھتا تھا کہ میں راستی پر ہوں یا نہیں؟

۱۹۵۹ء میں سرکاری ملازمت سے استعفا کے بعد بھی میں نہرو کے بعض ذاتی کام نمٹاتا رہا ان سے میری آخری ملاقات ۲۷ اپریل ۱۹۶۴ء کو ہوئی۔ میں نے انہیں ایک تحریری نوٹ دیا۔ انہوں نے دو مرتبہ اس کا مطالعہ کیا، مگر کچھ نہ سمجھ پائے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں ان کے لئے تحریری ہدایات چھوڑ دوں گا اور یہ کہ وہ پریشان نہ ہوں۔ نہرو کی حالت اب ایسی تھی کہ وہ زیادہ کام نہیں کر سکتے تھے اس روز میں بےحد مغموم تھا اور میں یہ سمجھ کر شملہ چلا گیا کہ اب نہرو سے میری مزید ملاقات نہ ہو گی۔ ٹھیک ایک ماہ بعد، ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کو دہلی سے میرے ایک دوست نے مجھے ٹیلی فون کیا کہ وزیرِاعظم کی حالت خراب ہے۔ ہماچل پردیش کے لیفٹیننٹ گورنر نے میرے دہلی جانے کا انتظام کر دیا۔ میں بھاگم بھاگ رات گئے دہلی پہنچا۔ اس روز سخت گرمی تھی اور دہلی نہرو کے انتقال کے باعث زلزلہ کی کیفیت سے دوچار تھی۔

باب ۲

کمیونسٹوں کے حملے

۱۹۵۸ء کے موسم سرما میں بعض کمیونسٹ لیڈروں نے مجھ پر حملے شروع کر دیئے میں یہاں ان حملوں کی تفصیلات بیان نہیں کروں گا۔ ان حملوں کے بعد میں نے ۱۲ جنوری ۵۹ء کو اپنے عہدے سے استعفا دے دیا۔ وزیرِاعظم میرا استعفا منظور نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مگر میں نے حکومت سے علٰحدگی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے اس عہدے پر کام جاری نہیں رکھنا چاہیئے۔ جہاں میں اپنا دفاع کرنے سے قاصر ہوں۔ میں نے استعفا ہوا میں نہیں لکھا تھا۔ یہ ایک سوچا سمجھا اقدام تھا جس کے واپس لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وزیرِاعظم نے میرے استعفا پر چھ دن تک کوئی کارروائی نہ کی۔ ۱۸ جنوری ۵۹ء کو میں نے وزیرِاعظم کو ایک نوٹ میں اطلاع دی کہ میں دو دن بعد کام کرنا بند کر دوں گا۔ اور ایوان وزیرِاعظم سے چلا جاؤں گا۔ اسی رات مجھے نہرو کے ہاتھ سے لکھا ہوا ایک نوٹ ملا۔ جس میں بڑے تامل کے بعد میرے استعفے کی منظوری کی اطلاع دی گئی تھی۔ دراصل نہرو کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔

۲۷ جنوری ۵۹ء کو تقریباً چار بجے صبح میں بیدار ہو گیا اور بذریعہ کار الموڑہ جانے کی تیاری کرنے لگا۔ یہ دن اتفاق سے میری سالگرہ بھی ہے مجھے اپنے ایک دوست ڈاکٹر بوشی سین کے ساتھ الموڑہ جانا تھا۔ جو زرعی سائنسدان ہیں۔ وہ میرے کمرے میں موجود تھے کہ تقریباً پانچ بجے نہرو میرے کمرے میں آ گئے اور بوشی سین کے قریب بیٹھ گئے۔ نہرو کو علم

تھا کہ آج میری سالگرہ ہے مگر انہوں نے مجھے مبارکباد نہیں دی۔ کیوں کہ یہ دن میرے یا نہرو کے لئے "مبارک" نہ تھا۔ جب میں روانگی کے لئے تیار ہو گیا تو نہرو نے مجھے گلے لگا لیا اور بوشی سے کہا "بوشی اس کا خیال رکھنا"۔ کافی دیر بعد مجھے یہ جان کر بڑی مسرت ہوئی کہ میرے چلے جانے کے بعد وزیراعظم کے ہاؤس کے مالی اور دوسرے ملازم جلوس کی صورت میں نہرو کے پاس گئے اور نہرو سے مطالبہ کیا کہ مجھے واپس لایا جائے۔

۱۰ فروری ۵۹ء کو نہرو نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا انہوں نے میرے بارے میں کہا کہ مسٹر متھائی متعدی دیانتداری اور اہلیت کی بنا پر خراجِ تحسین کے مستحق ہیں وہ میرے وفادار ساتھی تھے۔ مگر وہ ایسے شخص تھے جو بعض معمولی معاملات میں نہایت احمقانہ اقدام کیا کرتے تھے۔ اور ایسے معاملات میں اپنا پورا "وزن" استعمال کرتے تھے لیکن ان کی دیانت مسلم اور ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ وہ میرے ساتھ منسلک تھے اور ان کی حیثیت ایسی تھی کہ اس کا غلط استعمال ممکن تھا مگر ایسا ہرگز نہیں ہوا۔

۱۶ فروری کو راج کماری امرت کور کی کوٹھی پر لیڈی ماؤنٹ بیٹن مجھ سے ملنے آئیں۔ ان کا خیال تھا کہ نہرو نے پریس کانفرنس میں میرے متعلق جو ریمارکس دیئے ہیں میں ان پر ضرور بھنا اٹھوں گا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ وزیراعظم نے جن معاملات کا ذکر کیا ہے کبھی ان معاملات پر انہوں نے میری سرزنش کی تھی میں نے نفی میں جواب دیا تو لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے کہا "پھر تو نہرو کو سرِعام یہ ریمارکس دینے کا کوئی حق نہ تھا"۔ میں نے لیڈی ماؤنٹ بیٹن سے کہا کہ ممکن ہے میرے چلے آنے سے نہرو پریشان ہو گئے ہوں اور یہ الفاظ ان کے منہ سے اضطراری حالت میں نکل گئے ہوں۔ میں نے لیڈی صاحبہ کو یقین دلایا کہ نہرو کے الفاظ سے میری دل شکنی نہیں ہوئی پھر میں نے انہیں کابینہ کے ایک وزیر کے نام اپنے طویل خط کی نقل دی۔ اس وزیر نے نہرو کے ریمارکس کی مذمت میں مجھے خط لکھا تھا جس کا میں نے جواب دیا تھا۔ لیڈی ماؤنٹ بیٹن میرے خط کی نقل ساتھ لے گئیں تاکہ وہ اس کا تفصیلی مطالعہ کر سکیں۔ بعد میں لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے مجھے بتایا

کہ نہرو کی پریس کانفرنس کے بعد وزارت خارجہ کے سیکرٹری جنرل این۔ آر پلائی اور تین دوسرے سیکرٹریوں نے ایک مشترکہ نوٹ نہرو کو بھجوایا جس میں کہا گیا تھا کہ میں نے کبھی ان کے کام میں مداخلت نہیں کی اور نہ ہی کسی معاملہ میں ناجائز طور پر پاپا دباؤ استعمال کیا اس کے برعکس میں ان کے فرائض کی انجام دہی میں مفید تعاون کرتا رہا ہوں۔ لیڈی نے پنڈت نہرو کے حملے سے یہ بھی بتایا کہ پریس کانفرنس میں میرے متعلق انہوں نے جو کچھ کہا تھا بعد میں وہ اس پر بیحد متاسف تھے۔ میں نے لیڈی صاحبہ سے کہا کہ وہ نہرو سے کہیں کہ وہ اس معاملے کو بھول جائیں۔ دوسرے روز وہ پھر مجھ سے ملنے آئیں اور بتایا کہ میں نے کابینہ کے وزیر کو جو خط لکھا ہے۔ وہ اس سے بیحد متاثر ہوئی ہیں انہوں نے نہرو کو بھی یہ خط دکھایا جب نہرو نے اس کا مطالعہ کیا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

الموڑہ میں مجھے وزیراعظم کا ایک پیغام موصول ہوا جس میں مجھے اطلاع دی گئی تھی کہ نہرو نے پارلیمنٹ میں اپوزیشن کے بعض ارکان کے شور شرابہ کے پیشِ نظر دوسرے وزراء کے مشورے سے کابینہ کے سیکرٹری کو ہدایت کی ہے کہ وہ مجھ سے مل کر ان الزامات کی حقیقت معلوم کریں۔ جو مجھ پر ارکانِ پارلیمنٹ نے لگائے تھے۔ وزیراعظم نے اس پیغام میں مجھے دہلی آنے کو کہا تھا۔ چنانچہ میں دہلی آ گیا۔ اور راج کماری امرت کور کا مہمان ہوا۔ دہلی پہنچ کر میں نے وزیراعظم کو اطلاع دی کہ میں کابینہ کے سیکرٹری سے پورا تعاون کروں گا بشرطیکہ میری تین شرائط تسلیم کی جائیں۔ میری شرائط یہ تھیں (۱) تحقیقات کے دوران سنٹرل بورڈ آف ریونیو کے چیئرمین کو کابینہ کے سیکرٹری کے ساتھ شامل کیا جائے (۲) کابینہ کا سیکرٹری جو رپورٹ پیش کرے۔ اس پر وزیرِ خزانہ غور کریں اور تبصرہ کریں اور (۳) تحقیقاتی رپورٹ پر کسی غیر جانبدار اتھارٹی کا فیصلہ حاصل کیا جائے۔ میں نے اس سلسلے میں آڈیٹر جنرل کا نام تجویز کیا۔ وزیراعظم نے ان امور پر غور کرنے کے بعد مجھے اطلاع دی کہ میری تینوں شرائط تسلیم کر لی گئی ہیں۔ چنانچہ میں نے تیرہ سال کے دوران اپنے مالی معاملات کے سلسلے میں حقائق فراہم کر دیئے۔ اگرچہ یہ ایک مشکل کام تھا تاہم میں نے اپریل ۵۹ء کے ختم ہونے سے قبل

اسے مکمل کر لیا۔ میرے خلاف کوئی بات ثابت نہ ہو سکی۔

نہرو کابینہ کے سب سے سینئر وزیر جی بی پنت نے مجھ سے پوچھا کہ آیا میں ایوانِ وزیراعظم میں واپس آنے کو تیار ہوں؟ اس پر میں نے صرف ایک جملہ کہا "صرف کتا ہی اپنی قے پر دوبارہ آتا ہے"۔ پنت نے اسی طرح نہرو کو بتا دیا۔ بعد میں نہرو نے بھی مجھ سے کہا کہ ملک کے اندر یا باہر کوئی سرکاری ملازمت قبول کر لوں۔ مگر میں نے صاف انکار کر دیا۔ جب میرے خلاف اٹھنے والا شور دب گیا تو میرے ایک دوست نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا ان دوسرے درجہ کے سیاست دانوں نے جو میرے خلاف دن رات الزام تراشی کر رہے تھے تحقیقات کے بعد اخلاق کا مظاہرہ کیا ہے اور مجھ سے معذرت کی ہے۔ میں نے اس کے جواب میں یہ پرانی ضرب المثل دہرائی کہ "کیا کسی نے کوے میں صفائی، جواری میں دیانتداری، شرابی میں صداقت، سانپ میں رحم اور بادشاہی میں دوستی دیکھی ہے۔" یہی حال دوسرے درجہ کے سیاستدانوں کا ہے۔

باب ۳

باغی کی پریشانی

۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو جب وائسرائے ہاؤس دہلی میں عبوری حکومت نے حلف اٹھانا تھا۔ نہرو کو سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ وزیر کی حیثیت سے انہیں شاہ جارج ششم کی وفاداری کا عہد کرنا تھا اور یہ عہد بھی کرنا تھا کہ "میں اپنے شاہ کی دل و جان سے خدمت کروں گا۔" نہرو بھنائے تو بہت مگر انہوں نے اپنی پریشانی پر قابو پا لیا اور حلف پر دستخط کر دیئے جس میں کہا گیا تھا کہ "میں جواہر لال نہرو یقین دلاتا ہوں کہ میں شاہ معظم شاہ جارج ششم کا وفادار رہوں گا۔ اور قانون کے مطابق ان کی خدمت کروں گا۔"

اس کے بعد کئی دن تک نہرو اس حلف نامے پر غم و غصہ کا اظہار کرتے رہے۔ وہ کہتے تھے کہ میں نے اس حلف نامے کے لئے تو حکومت میں شمولیت نہیں کی تھی۔ ان کا ضمیر انہیں بار بار چمکے لگاتا تھا۔ مگر سردار پٹیل، راجندر پرشاد اور راج گوپال اچاریہ کے ضمیر نے انہیں ملامت نہیں کی حالانکہ انہوں نے بھی اسی حلف نامہ پر دستخط کئے تھے۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب ڈومینین حکومت وجود میں آ گئی تو نہرو شاہ ہندوستان کے وزیراعظم بن گئے اور شاہ سے ان کی خط و کتابت براہ راست ہونے لگی۔ اب نہرو نے دیکھا کہ شاہ نے ان کی خط و کتابت کا انداز لیا ہے کہ انہیں شاہ کے مقابلے میں اپنے لئے "واحد غائب" کا صیغہ استعمال کرنا ہے اس پر بھی وہ بہت بھنائے اور جب اس سلسلے کا پہلا خط دستخطوں کیلئے انہیں پیش کیا گیا تو انہوں نے اسے اٹھا کر دور پھینک دیا۔ تاہم بعد میں انہوں نے اس "بھیڑیا دستاویز" پر دستخط کر دیئے۔

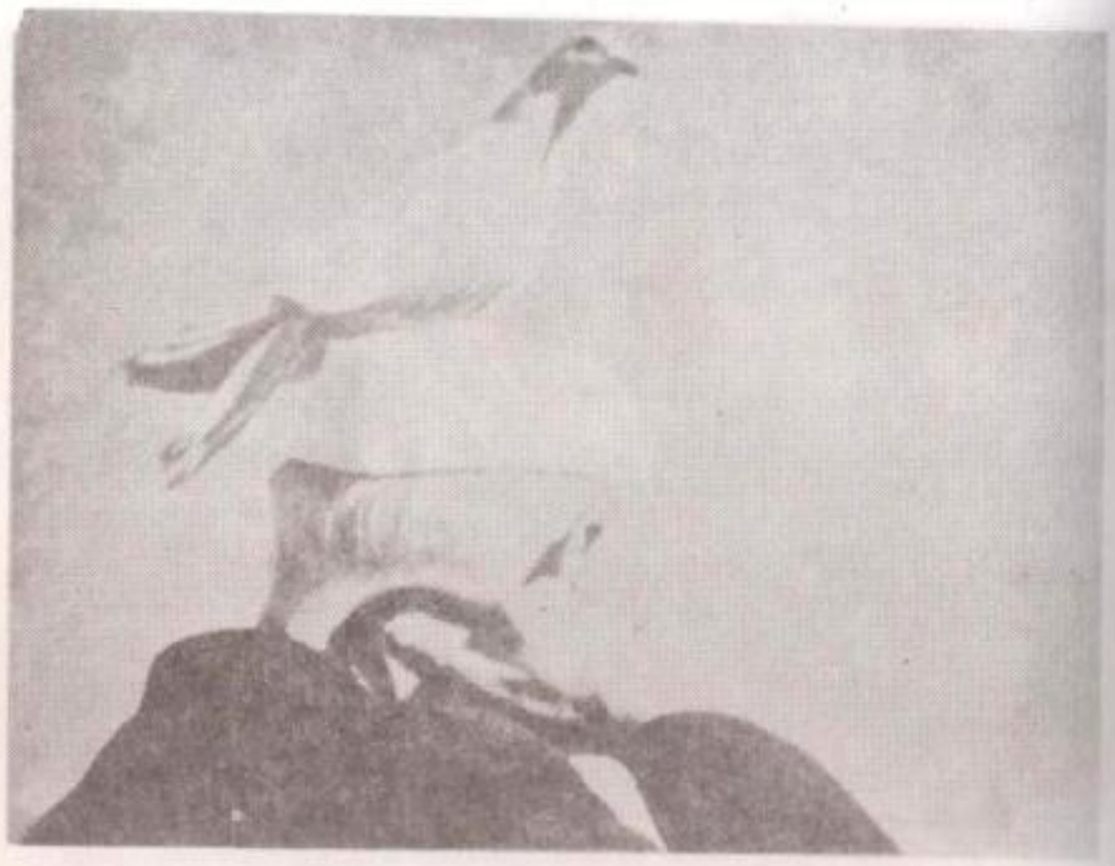

Nehru with a dove perched on his head

A study of Nehru, 1949

باب ۴

نہرو اور رجعت پسند

دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں جو ۹ دسمبر ۴۶ء سے ۲۶ نومبر ۴۹ء تک دہلی میں ہوا، راجندر پرشاد اور بعض دوسرے رجعت پسند نے مطالبہ کیا کہ "ہندوستان کا نام "بھارت" رکھا جائے۔ اور آئین میں انڈیا (ہندوستان) کے بجائے بھارت کا لفظ لکھا جائے۔ اس پر نہرو نے کہا کہ اگر انڈیا کا نام بھارت رکھ دیا جائے تو بین الاقوامی سطح پر انڈیا کو سلطنت برطانیہ کا وارث تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ اور ہمیں اقوام متحدہ اور دوسرے عالمی اداروں کی رکنیت کے حصول کے لئے از سر نو بات چیت کرنا ہو گی۔ نہرو نے راجندر پرشاد اور ان کے ہمنواؤں کو بتایا کہ "میں انڈیا کو بین الاقوامی طور پر حقیر نہیں بنانا چاہتا۔" نہرو نے کہا کہ ان لوگوں کی تجویز پر پاکستان بہت خوش ہو گا۔ راجندر پرشاد اور ان کے ساتھیوں نے اس پر شور تو بہت مچایا۔ مگر نہرو نے ان کی ایک نہ سنی۔ تاہم نہرو نے کہا کہ آئین میں کسی جگہ "انڈیا جو بھارت ہے" کے الفاظ لکھ لئے جائیں۔ جب راجندر پرشاد صدر مقرر ہوئے تو انہوں نے حکم دیا کہ صدر کے اے ڈی سی اپنے بازو پر جو مخصوص بیج لگاتے ہیں اس پر "انڈیا" کی جگہ بھارت لکھا جائے! اور یہ روایت اب تک جاری ہے۔

لیکن نہرو کو اسی منڈلی کے ایک اور مطالبہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ یہ مطالبہ آئین میں "گائے کا تحفظ" تھا۔ اگر نہرو کے بس میں ہوتا تو وہ آئین کو اس قسم کی دفعات سے آلودہ نہ کرتے نہرو کا سارا زور اس بات پر تھا کہ سب کو کام کرنے کا حق ہے۔ مگر رجعت پسند ملک کو پیچھے کھینچنے پر تلے ہوئے تھے۔ بعض لوگوں نے تو بندروں کو آئینی تحفظ دینے کا بھی مطالبہ کیا تھا جو ہندو دیو مالا کے حوالے سے ہنومان جی

کی اولاد ہیں۔

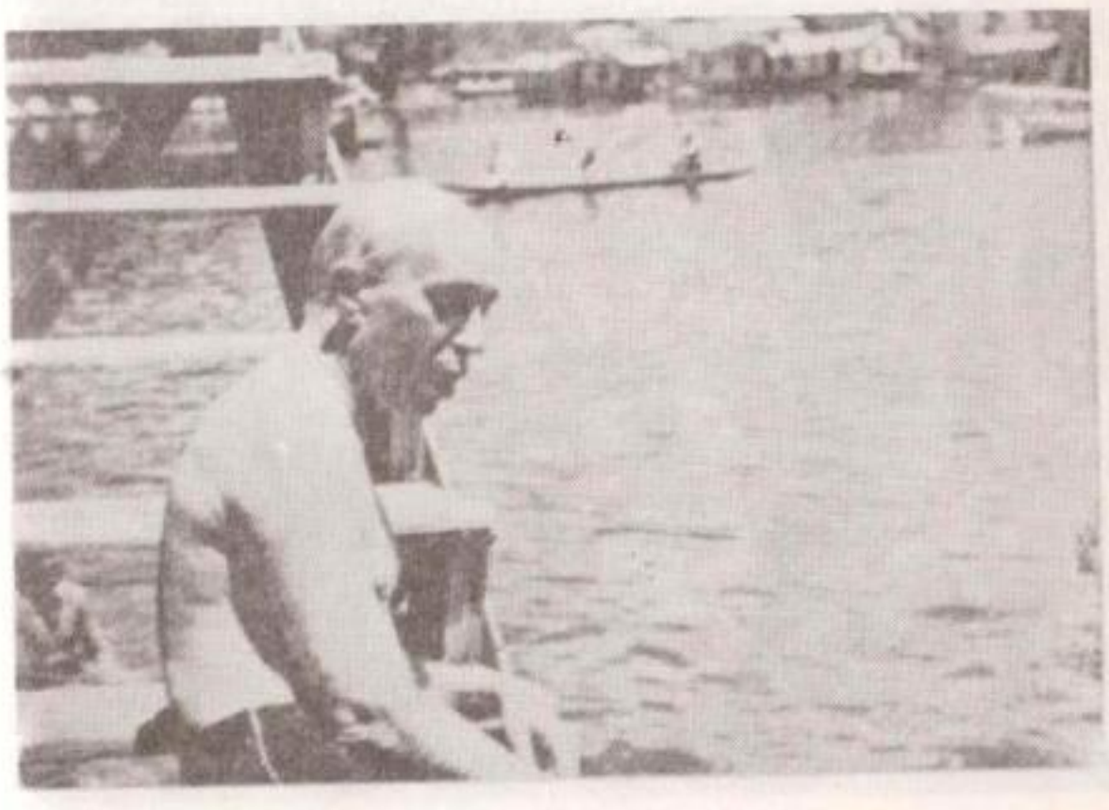

راجندر پرشاد ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو صدر جمہوریہ مقرر ہوئے۔ چند دن بعد ہی انہوں نے ایوانِ صدر میں متعدد موٹے تازے بندر چھوڑ دیئے۔ ایک دن چند بندر ایک بالکنی سے ہوتے ہوئے، جس کا دروازہ ایوان صدر کی طرف کھلتا تھا۔ وزیرِاعظم کے دفتر میں آگئے اس وقت میں نہرو کے کمرے میں موجود تھا۔ میں اور نہرو نے مل کر ان بندروں کو بھگایا۔ پھر بھی ایک بندر وزیرِاعظم کی میز پر سے ایک پیپر ویٹ اٹھا کر لے گیا۔ میں نے نہرو کو بتایا کہ یہ بندر راجندر بابو کا کارنامہ ہے۔ اس پر وہ خوب ہنسے۔ چند روز بعد برلا مندر میں بھی بہت سے بندر چھوڑ دیئے گئے اس سے دہلی میں بندروں کی آبادی کافی بڑھ گئی۔ برلا مندر کے بندر بعض اوقات ایوان صدر بھی آجاتے جہاں لوگ پہلے ہی بندروں سے تنگ تھے۔ وہ سبزیاں اور پھل اٹھا کر لے جاتے اور بچوں اور خواتین کو زخمی کر دیتے۔

میرے ایک دوست پی۔ کے پانیکر ہیں۔ جو سنسکرت کے جید عالم ہیں انہیں مذہب سے بھی گہرا لگاؤ ہے۔ ان کی وساطت سے اچھوت رہنما بی آر امبیدکر نے مجھ میں دلچسپی لینی شروع کی۔ میں نے پانیکر سے کہا تھا کہ میں امبیدکر کو بہت پسند کرتا ہوں۔ مگر وہ بڑا آدمی بنتے بنتے رہ گیا ہے۔ کیوں کہ وہ فرقہ وارانہ تلخی سے دامن نہیں بچا سکا لیکن میں اسے اس کے لئے معذور سمجھتا ہوں کیوں کہ اس نے اپنی زندگی میں جو ذلت آمیز سلوک برداشت کیا ہے اس سے تلخی پیدا ہونا قدرتی امر ہے۔ پانیکر اور امبیدکر روزانہ ہی ملتے تھے۔ یقیناً پانیکر نے میرے ریمارکس سے امبیدکر کو آگاہ کیا ہو گا۔ اگلے اتوار کی صبح کو ہی امبیدکر نے مجھے فون کیا اور شام کو اپنے ساتھ چائے پینے کی دعوت دی۔ اس نے مجھے بتایا کہ پانیکر بھی چلے آرہے ہیں۔ میں مقررہ وقت پر پہنچ گیا۔

امبیدکر پہلے تو گپ شپ کرتا رہا۔ پھر ہنستے ہوئے بولا "تو آخر تم نے بھی مجھ میں کیڑے نکالنے شروع کر دیئے ہیں۔ مگر میں تمہاری نکتہ چینی برداشت کرنے کو تیار ہوں۔" پھر اس نے چھوت چھات پر بات شروع کی اور کہنے لگا "دیوے اور فیلز یڈل نے چھوت چھات کو ختم کرنے میں گاندھی سے زیادہ

Nehru playing with "Bhimsa" the Himalayan Cat-bear

Nehru at Dal Lake, Srinagar

موثر کردار انجام دیا ہے۔ اس نے کہا کہ اچھوتوں کا اصل مسئلہ فاقہ کشی ہے۔ ہندوؤں کے مندروں میں عبادت کی اجازت نہیں۔ جیسا کہ گاندھی کہتے ہیں۔ امبیدکر نے کہا "ہمارے آئین میں کاغذی طور پر چھوت ختم کر دی جائے گی۔ مگر چھوت کا زہر مزید ایک سو سال تک ہندوستانی معاشرے میں پھیلا رہے گا۔ یہ لعنت لوگوں کے ذہنوں میں جڑ پکڑ چکی ہے"۔ اس نے امریکہ میں غلامی کے خاتمے کی آئینی دفعات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ڈیڑھ سو سال گزر جانے کے باوجود آج بھی کالوں کی ترقی کی رفتار نہایت سست ہے۔

میں نے کہا کہ میں تمہاری بات سے بالکل متفق ہوں۔ پھر میں نے اسے اپنی ماں کا قصہ سنایا وہ مذہباً عیسائی تھیں۔ میں نے کہا کہ عیسائیت کو دو ہزار سال ہو چکے ہیں مگر میری ماں اس قدیم مذہب کی پجاری ہونے کے باوجود چھوت چھات کی زبردست قائل تھی۔ وہ پنڈت مدن موہن مالویہ کی طرح اچھوتوں کو دور رکھتی تھی۔ وہ تو سخت گرمی کے موسم میں جب پانی کمیاب ہو جاتا ہے کسی ہریجن کو اپنے کنوئیں سے پانی نہیں لینے دیتی تھی اور اگر کوئی اچھوت اس سے بیس فٹ دور سے بھی گزر جاتا تو وہ فوراً گھر جا کر غسل کرتی تھی۔

پھر امبیدکر نے کسی قدر فخر سے کہا "ہندوؤں کو ویدوں کی ضرورت تھی تو انہوں نے ویاس کو بلایا جو اونچی ذات کا ہندو نہیں تھا۔ جب ہندوؤں کو ایک اساطیری داستان کی ضرورت ہوئی تو انہوں نے بالمیک سے امداد طلب کی جو اچھوت تھا (بالمیک ہندوؤں کی مذہبی کہانی رامائن کا مصنف ہے) اب انہیں آئین کی ضرورت ہے تو انہوں نے امبیدکر کو طلب کیا ہے"۔ اس نے کہا کہ ہندی بولنے والے علاقے کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس علاقے کے لوگوں نے بالمیک کو نظرانداز کر دیا۔ اور اس کا مقام تلسی داس (رامائن کا ایک اور مصنف جو ہندو تھا) کو دے دیا۔ اس علاقے کے لوگ اس وقت تک پس ماندہ اور رجعت پسند رہیں گے جب تک وہ بالمیک کو تلسی داس کی جگہ نہیں دیتے۔ اس نے بتایا کہ بالمیک کی رامائن کے مطابق جب رام اور لچھمن بھردواج کے آشرم میں آئے تو آشرم کے کرتوں دھرتوں نے متعدد بچھڑے

ان کے سامنے پیش کئے تاکہ وہ ان میں سے کسی کا انتخاب کر لیں۔ رام اور لچھمن نے بچھڑے منتخب کئے جن کو ذبح کر کے رام اور لچھمن اور ان کے ساتھیوں کی ضیافت کی گئی۔ تلسی داس نے رامائن سے یہ حصہ نکال دیا ہے۔ میں نے امبیدکر کو بتایا کہ کاماسوترا کے مصنف نے لکھا ہے کہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو شادی سے قبل چھ ماہ تک گائے کے بچھڑے کا گوشت خوب کھلایا جانا چاہیئے۔

اچانک امبیدکر نے میری طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا "دراصل تم ملیالی بڑے دہ ہو اور تم نے اس ملک کو شدید ترین نقصان پہنچایا ہے"۔ میں اس پر مبہوت رہ گیا اور پوچھا کہ وہ کیسے؟ اس نے کہا "تم نے ہی شنکراچاریہ کو اس علاقے میں بھیجا جس نے یہاں بدھ مت کا دیوالہ نکال دیا۔ حالانکہ مہاتما بدھ ہندوستان کی تاریخ کی عظیم ترین ہستی ہے"۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ہند میں موجودہ دور کی عظیم ہستی گاندھی نہیں سوامی وویکانند تھا۔ میں نے امبیدکر کو بتایا کہ گاندھی نے ہی نہرو سے کہا تھا کہ امبیدکر کو حکومت میں شامل کرو۔ یہ بات امبیدکر کے لئے "خبر" سے کم نہ تھی۔ مگر میں نے جلد ہی اپنی بات اس طرح بدل دی کہ نہرو اور گاندھی کو بیک وقت تمہیں حکومت میں لینے کا خیال آیا تھا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ امبیدکر ہی نے آئین ساز اسمبلی میں آئین کا بل پیش کیا تھا۔ امبیدکر نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے پیروکاروں سمیت بدھ مت اختیار کرنے والے ہیں۔ دہلی میں قیام کے دوران امبیدکر مجھ سے برابر ملتے رہے وہ نہایت قابل انسان تھے۔ اور ہندوستان کے عوام کے خراج تحسین کے بجا طور پر مستحق تھے۔

باب ۵

مہاتما گاندھی

گاندھی جی سے ملاقات کے مواقع مجھے اکثر ملتے رہے۔ مگر میں ذہنی طور پر ان کے قریب نہ ہو سکا۔ میں ان کی عظمت تو تسلیم کرتا ہوں، مگر ان کی بہت سی باتوں نے مجھے حیران و پریشان کیا۔ ان سے میرا ذاتی رابطہ نہرو کے اہم خطوط انہیں پہنچانے تک محدود تھا۔ ۱۹۴۷ء کے اوائل میں مجھے ایک دوست نے بڑا خوبصورت ٹرانزسٹر ریڈیو کا تحفہ دیا۔ ابھی ٹرانزسٹر نیا نیا ایجاد ہوا تھا۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ بس آن کرتے ہی آواز آنی شروع ہو جاتی ہے۔ نہرو نے بھی اسے دیکھا اور وہ اس طرح مبہوت ہو گئے گویا کسی بچے نے جدید ترین کھلونا دیکھ لیا ہو۔ میں نے یہ تحفہ نہرو کو پیش کر دیا۔ وہ اسے اپنے کمرے میں لے گئے اور روزانہ صبح کو شیو کرتے وقت وہ اس پر خبریں سنتے تھے۔ کھانے کے وقت نہرو یہ ٹرانزسٹر ساتھ لے آتے اور کھانا کھانے کے دوران خبریں یا کوئی بھی دوسرا پروگرام سماعت کرتے۔ نہرو نے اس ٹرانزسٹر کا ذکر گاندھی جی سے کیا اس موقع پر میرا تذکرہ بھی ہوا۔ گاندھی جی نے میرے بارے میں راجکماری امرت کور سے بھی سن رکھا تھا۔ نہرو نے مجھے کہا کہ "گاندھی جی نے آج تک ریڈیو نہیں سنا۔ تم یہ ریڈیو لے کر برلا ہاؤس چلے جاؤ۔ جہاں گاندھی جی مقیم ہیں اور انہیں شام چھ بجے کی خبریں اس پرسناؤ۔" میں چھ بجے سے چند منٹ پہلے برلا ہاؤس پہنچ گیا۔ اور گاندھی کے روبرو حاضر ہوا۔ انہوں نے مجھے اپنے سامنے فرش پر بٹھالیا۔ چھ بجے میں نے ٹرانزسٹر کھول دیا۔

گاندھی جی ایک منٹ تک خبریں سنتے رہے پھر بولے "بند کرو اسے، کیا آج کل کوئی معقول کی بات بھی کرتا ہے؟" ان دنوں بھارت میں شدید فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے تھے۔

گاندھی کی بہت سی باتوں سے میں پریشان بھی ہوا، اور متعجب بھی۔ وہ ہندو دیومالائی رام راج کی تلقین کرتے تھے۔ جبکہ لاکھوں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ گاندھی کے رام راج کے مسلسل بھاشن سے زچ ہو کر یہ لوگ گاندھی سے دُور ہو گئے تھے۔

گاندھی جی گائے کی پرستش کے زبردست حامی تھے۔ اور اس سلسلے میں اپنے اخبار "ہریجن" میں مسلسل مضامین لکھتے رہتے تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ لاکھوں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے علاوہ ہریجن (اچھوت) آدی باسی قبائل اور بے شمار پڑھے لکھے ہندو بھی گاندھی جی سے دور ہوتے چلے گئے۔ کیونکہ وہ گائے تو کیا کسی کی بھی پرستش کے قائل نہ تھے یا کم از کم گائے سے کسی بہتر چیز کی ستش کرنا چاہتے تھے۔

وہ شادی شدہ جوڑوں کو تجرد کی تلقین کرتے تھے مگر مرارجی ڈیسائی اور چند دوسرے افراد کے سوا کسی نے ان کی "نصیحت" پر کان نہ دھرا۔ جن چند لوگوں نے ان کی تجرد پسندی کو خوش آمدید کہا تھا۔ بالآخران کا ضبط کا بند ٹوٹ گیا اور وہ اس سے منحرف ہو گئے۔ تجرد پسندی کے شوق میں بعض لوگ نفسیاتی مریض بن چکے تھے۔

گاندھی جی ہندوستان میں تحریک خلافت کی حمایت کرتے تھے۔ مگر یہ گاندھی جی کی ان چند مہمات میں سے ایک تھی جو ابن الوقتی اور مصلحت پسندی پر مبنی تھیں۔ جب کمال اتاترک برسر اقتدار آ گئے اور خلافت کو منسوخ کر دیا تو گاندھی نرے احمق محسوس ہوتے تھے۔ گاندھی جی سر کنے والی ریت پر ہندو مسلم اتحاد کی بنیادیں استوار کرنا چاہتے تھے۔

میں اس بات پر بھی بڑا حیران ہوا کہ بہار میں ہولناک زلزلے کے بعد گاندھی جی نے

یہ بیان دیا کہ یہ زلزلہ چھوت چھات پر عمل کی سزا ہے۔ پھر انہوں نے لنکاشائر (برطانیہ) کی ٹیکسٹائل صنعت کے ان ورکروں میں سگریٹ نوشی کے رجحان کی مذمت کی جنہیں انڈیا میں برطانوی کپڑے کے بائیکاٹ کے سبب بے روزگار ہونا پڑا تھا۔

کانگریس کے ایک ورکر کے ساتھ ان کا ظالمانہ سلوک بھی میری سمجھ میں نہ آسکا۔ اس ورکر کی تحویل میں ایک حقیر سی رقم دی گئی تھی۔ وہ اس کے اخراجات کا پورا حساب نہ رکھ سکا گاندھی کو ذاتی طور پر یقین تھا کہ یہ ورکر بد دیانت نہیں۔ پھر بھی انہوں نے اسے یہ سزا سنائی کہ وہ گرمی کے موسم میں اپنے گاؤں پیدل جائے جو تقریباً سو میل دور تھا۔ سی ایف اینڈریوز نے اس ورکر کو خفیہ طور پر کچھ رقم دی تاکہ وہ ٹرین میں سفر کر سکے۔

انہوں نے ہندی کی نہایت متعصبانہ طریقہ پر حمایت کی۔ حالانکہ ہندی انڈیا کی پسماندہ ترین زبان ہے۔ ہندی کی حمایت میں ان کا جارحانہ انداز اس زبان کے تمام حامیوں پر بازی لے گیا تھا۔

جان کو ٹگزٹ کی طرح مہم جوئی کے جوش میں انہوں نے دنیا کو دکھانے کے لیے بزعم خویش ایک مثالی شخصیت کو ہندوستان کا گورنر جنرل منتخب کیا۔ یہ شخصیت ایک موٹی تازی "مضبوط دل، کبھی نہ جھکنے والے اور شیشے کی طرح بے داغ" ایک نوجوان بھنگن تھی مگر جب گورنر جنرل کے تقرر کا وقت آیا تو گاندھی جی نے اندرون خانہ ماؤنٹ بیٹن کو مشورہ دیا کہ وہ کانگریس کی پیش کش قبول کرے اور آزاد ہندوستان کا پہلا گورنر جنرل بن جائے۔ گاندھی نے ماؤنٹ بیٹن کو یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ وائسرائے ہاؤس سے نکل کر کسی چھوٹے سے مکان میں رہائش اختیار کرے۔ جہاں کوئی ملازم بھی نہ ہو۔ گاندھی وائسرائے ہاؤس میں ہسپتال قائم کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے گورنر جنرل کو یہ مفت مشورہ بھی پیش کیا کہ وہ اپنے لیے خود ہی سبزیاں اگائے اور اپنے گھر کے بیت الخلا بھی خود ہی صاف کیا کرے۔

مجھے گاندھی جی کے اس خط پر بھی بڑی حیرت ہوئی جو انہوں نے جون ۱۹۴۰ء میں وائسرائے لارڈ لنلتھ گو کو لکھا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب ہٹلر نے ہالینڈ کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ اور بلجیم کو اس کی افواج قاہرہ پامال کر رہی تھیں۔ گاندھی جی نے اپنے خط میں لکھا۔" انسانوں کا قتل عام بند کرو۔ تم جنگ ہار رہے ہو۔ اگر تم اپنی ہٹ پر قائم رہے تو مزید خونریزی ہوگی۔ ہٹلر کوئی برا آدمی نہیں۔ اگر تم جنگ بند کرنے کا اعلان کر دو تو ہٹلر بھی ضرور جنگ بند کر دے گا۔ اگر تم چاہو تو میں بھی جرمنی جانے کو تیار ہوں۔ تم میرے بارے میں برطانوی کابینہ کو بھی اطلاع دے سکتے ہو۔"

یہ علم نہیں ہو سکا کہ گاندھی کے اس خط کا کیا بنا۔

گاندھی جی کے معاشی نظریات ازلی پس ماندگی اور ابدی غربت حاصل کرنے کا نادر نسخہ ہیں۔ آزادی کے وقت ہندوستان میں خوراک کی حالت نہایت نازک تھی۔ مگر گاندھی جی اناج اور دوسری اشیاء پر کنٹرول ختم کرنے اور راشن کارڈ پھاڑ کر پھینک دینے پر مصر تھے۔ نہرو کی ہدایت پر جان میتھائی نے گاندھی جی سے ملاقات کی اور راشننگ کے سوال پر ان سے بات چیت کی۔ بعد میں میتھائی نے نہرو کو بتایا کہ گاندھی جی سے ایک گھنٹہ کی بات چیت کے دوران میں نے محسوس کیا کہ میں کسی دیوار سے مخاطب ہوں۔ اب اس معاملے کو کابینہ میں پیش کیا گیا۔ تصف وزیر گاندھی جی کے مطالبہ کے مخالف تھے۔ آخر نہرو نے کاسٹنگ ووٹ دے کر فیصلہ گاندھی کے مطالبہ کے حق میں کر دیا۔ مگر اس کے نتائج نہایت تباہ کن ثابت ہوئے اور ملک کے عوام کو گاندھی جی کے معاشی نظریات اپنانے کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ سروجنی نائیڈو نے ایک بار کہا تھا۔" اکثر لوگوں کو شاید یہ کبھی نہ معلوم ہو سکے گا کہ اس بڈھے کو غربت میں پیش کرنے پر کتنا خرچ اٹھتا ہے۔"

گاندھی جی نے ایک مرتبہ مرن برت رکھا۔ اس دوران انہوں نے کہا کہ میرے پیشاب میں جو تیزابیت ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ رام پر میرا ایمان نامکمل ہے۔

پنجاب میں فسادات کے دوران جن عورتوں کو جنسی تشدد کا سامنا کرنا پڑا ، گاندھی نے ان کو نصیحت کی کہ وہ اپنی زبانیں کاٹ ڈالیں اور بقیہ عمر خاموشی سے گزار دیں۔ مگر کنفوشش نے نوجوان لڑکیوں کو کچھ اور ہی نصیحت کی تھی۔ اُس نے کہا تھا:

"جب تم دیکھو کہ جنسی تشدد سے تحفظ ناممکن ہے تو پھر اُس سے حظ اٹھاؤ۔"

گاندھی جی آبادی میں کمی کے لیے برتھ کنٹرول کے جدید طریقوں کے مخالف تھے۔ وہ صرف اپنے طریقے "جنسی تجرد" کے حامی تھے۔

گاندھی جی عدم تشدد، حصول مقصد کے ذرائع دشمنوں سے پیار اور اسی نوع کی دوسری عجیب و غریب باتوں کا پرچار کرتے تھے۔ مگر میں ان کے وعظ سے کبھی متاثر نہیں ہوا۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ نے بھی انہی باتوں کا پرچار کیا تھا۔ ان کے پیروکار ان باتوں کو ناقابلِ عمل ہی سمجھتے رہے ہیں۔ قصہ کوتاہ گاندھی جی کے بارے میں میرے یہ تاثرات تھے۔ میں ان کا چیلہ کبھی نہ بن سکتا تھا۔

گاندھی جی ہندوستان کی تقسیم کے مخالف تھے اور اس کے لیے انہوں نے جدوجہد بھی کی، مگر ان کا یہ رویّہ حقیقت پسندانہ نہیں تھا۔ اگر اُن کے ماضی پر غور کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ان کے اپنے بعض اقدامات سے تقسیم ہند ناگزیر ہوگئی تھی۔ مجھے اس پر کوئی تعجب نہیں کہ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے باقاعدہ قرارداد کے ذریعے گاندھی کو تقسیم ملک کے فیصلے سے بری الذمّہ قرار دیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ گاندھی کے آخری ایام خصوصاً جنوری ۱۹۴۸ء نہایت تابناک تھے۔ کئی ہفتوں سے نیشنلسٹ مسلمانوں کے "نمائندے" اُن سے مشورہ طلب کر رہے تھے کہ وہ جان کی بازی لگا کر ڈٹے رہیں یا جدوجہد ترک کر کے پاکستان چلے جائیں۔ گاندھی جی نے انہیں مشورہ دیا کہ:

"بھاگنے سے یہ بہتر ہے کہ قدم جما کر جان کی بازی لگا دی جائے۔"

اُن دنوں دہلی اور آس پاس کے علاقے ہندو اور سکھ شرنارتھیوں سے پٹے پڑے تھے اور یہ لوگ مسلمانوں سے انتقام لینے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ انہوں نے مساجد پر زبردستی قبضہ کر لیا تھا۔ اور مسلمانوں سے ان کے گھر چھین لیے تھے۔ گاندھی چاہتے تھے کہ شرنارتھی مسلمانوں کے گھر خالی کر دیں اور اپنے کیمپوں کو لوٹ جائیں۔

انہی دنوں ہندوستانی کابینہ نے فیصلہ کیا کہ تقسیم ملک کے تحت پاکستان کو ۵۵ کروڑ روپے کی جو ادائیگی کی جانی تھی، وہ روک دی جائے۔ گاندھی جی نے کابینہ کے اِس فیصلے کو غیر اخلاقی قرار دیا اور شرنارتھیوں سے مسلمانوں کے مکان خالی کرانے اور پاکستان کو رقم کی ادائیگی کے سوال پر مرن برت کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے ۱۳ر جنوری کو مرن برت رکھا جو ۱۸ر جنوری تک جاری رہا۔ مرن برت کے دوران سردار پٹیل گاندھی جی سے بات چیت کرنے گئے۔ گاندھی نے پٹیل کی بات سننے سے انکار کر دیا اور کہا:

"تم وہ آدمی نہیں رہے جسے میں جانتا تھا۔"

سردار پٹیل نے انہی دنوں لکھنؤ اور جے پور میں دو عام جلسوں سے خطاب کرتے ہوئے گاندھی جی پر شدید نکتہ چینی کی تھی۔ گاندھی کے مرن برت کے صرف تین دن بعد حکومت نے پاکستان کو ادائیگی کا اعلان کر دیا۔

۱۸ر جنوری کو سکھوں، ہندوؤں، مسلمانوں، مہاسبھائیوں، آر ایس ایس کے نمائندے اور بہت سے سادھو گاندھی جی کے پاس حاضر ہوئے اور

یقین دلایا کہ وہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ امن قائم رکھیں گے۔ اس موقع پر پاکستانی ہائی کمشنر بھی موجود تھے۔ گاندھی جی نے مرن برت ختم کر دیا۔ یہ ان کی زندگی کا آخری مرن برت تھا۔ جنوری کے آواخر میں انہیں قتل کر دیا گیا تھا۔

گاندھی جی دوسروں کے متعلق بات چیت کرتے ہوئے تباہ کن انداز بھی اختیار کر لیتے تھے۔ اس کا اندازہ ان کے ایک خط سے ہوتا ہے جو انہوں نے راج کماری امرت کور کو لکھا تھا۔ اس خط میں گاندھی لکھتے ہیں :-

"تم نے گوبند داس کے بارے میں میری رائے پوچھی ہے مگر اس کا کیا فائدہ تم کو جو کرنا تھا وہ پہلے ہی کر چکی ہو۔ تاہم سنو۔ گوبند داس کے بارے میں میرا تجربہ بڑا تلخ ہے۔ وہ ایک مکار، فریبی، مغرور، لالچی اور لفنگا شخص ہے۔ اس کی مہم جوئی اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی ہے۔ مَیں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ ایک زمانے میں وہ مجھے بیٹے کی طرح عزیز تھا۔ مگر جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ سازشی انسان ہے۔ اب وہ کبھی کبھار ہی ملتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میری رائے اس کے بارے میں اچھی نہیں۔ تم اُسے محسوس نہیں کرو گی۔"

نہرو نے ایک مرتبہ اس خیال کا اظہار کیا کہ مسائل کے بارے میں گاندھی جی کی سوچ کا انداز نسوانی ہے۔ وہ منطقی دلائل کے بجائے مسائل کو ذاتی ردعمل کی روشنی میں دیکھتے ہیں راج کماری امرت کور کے نام ایک خط میں نہرو نے لکھا :-

"گذشتہ روز مجھے پٹیل سے ملنے کا اتفاق ہوا، اور ان سے کافی باتیں ہوئیں، اس سے بعض مسائل تو واضح ہو گئے مگر میں مزید گہرائی میں جا کر یہ سراغ لگانا چاہتا ہوں کہ ان کا ذہن فی الحقیقت کس نہج پر سوچ رہا ہے۔ میرا

خیال ہے کہ مسائل کے بارے میں ان کی سوچ نسوانیت لیے ہوئے ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ یہ تاثراتی سوچ ہے جو دلائل اور منطق کے بجائے ذاتی ردِ عمل پر مبنی ہے۔ اگرچہ اس موضوع پر اور بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے مگر نہ بابا یہ خطرناک معاملہ ہے۔"

ہر شخص جانتا ہے کہ نہرو کانگریس کے "محرر" تھے۔ کانگریس کا صدر خواہ کوئی بھی ہو اس کی قراردادیں، بیانات اور برطانوی حکومت سے خط و کتابت سب نہرو خود تحریر کرتے جب مولانا ابوالکلام آزاد کانگریس کے صدر تھے تو ہر قسم کی خط و کتابت وغیرہ تحریر کرنا نہرو کے سپرد تھا۔ پھر گاندھی جی اس میں تصحیح کرتے اور مولانا ابوالکلام آزاد صرف دستخط کر دیتے تھے۔

ذیل میں لارڈ ویول کے نام نہرو کا ایک خط دیا جا رہا ہے۔ یہ خط نہرو نے اپنے ہاتھ سے لکھا اور پھر گاندھی جی نے اس میں تصحیح کی۔ (یہ خط ہندو کی مخصوص ذہنیت کا حامل ہے۔ مترجم)

ڈیر لارڈ ویول !

"مجھے افسوس ہے کہ آپ نے آج مجھے جو خط لکھا ہے اس کا جواب دینے میں معمولی تاخیر ہو گئی ہے۔ آپ نے مجھے آج شام آپ کے اور مسٹر جناح کے ساتھ عبوری حکومت کے بارے میں صلاح مشورہ کی دعوت دی ہے۔ اس سے مَیں مخمصے میں پڑ گیا ہوں۔ مَیں کسی وقت بھی آپ سے ملنے کو تیار ہوں۔ مگر اس معاملے میں ہمارے ترجمان تو مولانا ابوالکلام آزاد ہی ہو سکتے ہیں۔ جو کانگریس کے صدر ہیں۔ وہ پورے اختیارات کے ساتھ بات کر سکتے ہیں اور اس کے مجاز ہیں۔ جو میرے اختیار میں نہیں ہے۔ مناسب یہی ہے کہ عبوری حکومت کے سلسلے میں جو بھی صلاح مشورہ ہو، ہماری طرف سے

مولانا آزاد ہی اس میں شرکت کریں۔ چونکہ آپ نے مجھے یاد کیا ہے اس لیے میں آؤں گا تو ضرور لیکن، مجھے امید ہے، آپ میری پوزیشن کو مدنظر رکھیں گے۔ میں خالی بات چیت ہی کر سکتا ہوں۔ مجھے اختیار حاصل نہیں۔ اختیار صرف کانگریس کے صدر اور ورکنگ کمیٹی کے پاس ہے۔"

عام لوگوں کا خیال ہے کہ گاندھی جی کو پہلی بار نہرو نے "بابائے قوم" کا خطاب دیا تھا۔ یہ صحیح نہیں۔ یہ سروجنی نائیڈو تھیں۔ جنہوں نے گاندھی کے لیے "بابائے قوم" کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ ہوا یوں کہ دہلی میں ایشیائی تعلقات کے بارے میں کانفرنس ہو رہی تھی۔ سروجنی نائیڈو اس کی صدر تھیں۔ ۲۸ر مارچ ۴۷ء کا ذکر ہے۔ گاندھی جی کانفرنس سے خطاب کرنے کے لیے مائیک کی طرف آئے تو سروجنی نائیڈو نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں کہا "حضرات بابائے قوم" مگر اس خطاب کے بعد کی سنیے۔ بعض لوگوں نے اس کا مذاق بنا لیا اور وہ گاندھی جی کے بیٹے دیوداس گاندھی کو "قوم" کہنے لگے۔ مگر یہی سروجنی نائیڈو تھیں۔ جنہوں نے کسی اور پس منظر میں گاندھی جی کو "چوہے" کا خطاب دیا تھا۔

گاندھی جی اپنے سامنے تین باتیں لکھ کر رکھا کرتے تھے۔ "بری بات نہ کہو، بُری بات نہ سنو، اور بری بات نہ دیکھو" بری بات نہ کہو یہ تو میری سمجھ میں بھی آتا ہے۔ مگر دوسری دونوں باتیں فضول ہیں۔ ذرا آپ تصور کیجیے کہ ہندوستان کی راجیہ سبھا کے اجلاس میں جہاں ارکان پارلیمنٹ، راجیہ سبھا کے چیئرمین اور اخبار نویس موجود ہیں۔ بھوپیش گپتا تقریر کے لیے آئیں۔ اب گاندھی جی کے مقولے کے حوالے سے اخبار نویسوں سمیت ایوان میں موجود تمام افراد کان بند کر لیں (برائی نہ سنو) تو یہ ایک المیہ ہوگا۔ ایوان کے حاضرین نہایت خوبصورت آواز سننے سے محروم رہیں گے اور اگلے دن عوام (بذریعہ اخبارات) بھوپیش گپتا کے بھاشن سے لطف اندوز نہ ہو سکیں گے

نہرو ساری زندگی ایک طرح کی محرومی میں مبتلا رہے۔ یہ محرومی تھی چھوٹے پن کی وہ چاہتے تھے کوئی ان کا بڑا ہو۔ جس کے سامنے وہ چھوٹوں کی طرح رہ سکیں۔ ان کے اس رویہ کا اظہار گاندھی جی سے ان کے تعلقات سے ہوتا ہے۔ نہرو گاندھی جی سے کچھ نہ چھپاتے نہ تھے۔ اور اپنا دل کھول کر ان کے سامنے رکھ دیتے تھے۔ گاندھی جی کے بعد کوئی ایسی ہستی نہ رہی جس سے نہرو کھل کر بات کر سکتے۔ چنانچہ وہ ذہنی طور پر حجرہ نشین ہو گئے تھے۔ وہ سردار پٹیل اور راجہ جی سے بعض معاملات پر بات کرتے اور بعض دیگر مسائل پر آزاد، پنت، رادھا کرشنن یا آئن گر سے تبادلہ خیال کرتے تھے۔ یہ سب لوگ نہرو سے عمر میں بڑے تھے۔ اور نہرو نے وزیر اعظم کی حیثیت میں انہیں کبھی بات چیت کے لیے طلب نہیں کیا تھا۔ جب بھی وہ ضرورت محسوس کرتے ان لوگوں کے گھر جا کر ان سے تبادلہ خیال کرتے۔

گاندھی کی موت

گاندھی جی کو ۳۰ر جنوری ۴۸ء کو شام سوا پانچ بجے قتل کیا گیا۔ اس روز جمعہ کا دن تھا۔ وزیر اعظم کی رہائش گاہ ۱۷ پارک روڈ پر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون اٹھایا تو برلا ہاؤس سے کسی کا فون تھا جس نے اطلاع دی کہ گاندھی جی کو قتل کر دیا گیا ہے۔ نہرو اس وقت اپنے دفتر میں کام کر رہے تھے۔ میں نے انہیں فون پر اطلاع دی تو وہ بھاگم بھاگ برلا ہاؤس پہنچے۔ میں بھی وہاں چلا گیا۔ نہرو آل انڈیا ریڈیو پر گاندھی جی کے قتل کا اعلان کرنے کے لیے جانے والے تھے کہ انہوں نے ہجوم میں مجھے دیکھا اور قریب آنے کا اشارہ کیا۔ میں بھیڑ میں راستہ بناتا ہوا بمشکل ان کے پاس پہنچا، تو انہوں نے مجھے ہدایت کی کہ میں ان کے ساتھ رہوں۔ وہ بے حد گھبرائے ہوئے تھے اور کانپ رہے تھے۔ جب ہم کار میں بیٹھ کر روانہ ہوئے تو نہرو نے بھانپ لیا، کہ

میں ان سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دبایا یہ مجھے خاموش رہنے کا اشارہ تھا۔ نہرو گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میں ان کے ساتھ ساتھ رہا حتیٰ کہ ریڈیو کے سٹوڈیو میں بھی میں ان کے ساتھ تھا۔ وہ مائیک کے سامنے بیٹھے تھے انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں مختصر سی دل دوز تقریر کی جس کا آغاز اس جملے سے ہوا۔ "آج ہماری زندگی سے روشنی گُل ہو گئی ہے۔" اس رات نہرو کی رہائش گاہ پر کسی نے کھانا تک نہیں کھایا۔

رات گئے امریکی صحافی اور مصنف ونسنٹ شین مجھے ملنے آیا۔ وہ گاندھی کی موت پر بلک بلک کر رو رہا تھا۔ میں کافی دو قدح کے بعد اس کے فلیٹ تک جانے پر رضامند ہوا۔ ونسنٹ نے گاندھی جی کی سوانح حیات لکھی تھی۔ اپنے فلیٹ پہنچ کر اس نے شراب کی بوتل کھول لی۔ یہ اس کا غم ہستی کو ڈبونے کا انداز تھا۔ میں نے معذرت کی اور واپس آ گیا۔ گاندھی کے قتل کے چند دن بعد سروجنی نائیڈو نے کچھ لوگوں کو خوب ڈانٹ پلائی۔ یہ لوگ گاندھی کے قتل پر واویلا کر رہے تھے۔ سروجنی نے کہا "گاندھی کے لیے قتل ہونا ہی صحیح موت تھی۔ کیا تم چاہتے ہو کہ گاندھی جی بد ہضمی میں مبتلا ہو کر مرتے"

گاندھی جی روزانہ پرارتھنا کی مجلس میں شریک ہوتے تھے۔ مگر وہ اپنی زندگی کی آخری مجلس میں تاخیر سے پہنچے تھے۔ راج کماری امرت کور نے مجھے بعد میں بتایا کہ اس تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ گاندھی جی سردار پٹیل سے گرما گرم گفتگو میں مصروف تھے۔ وہ نہرو کے ایک "نوٹ" پر بات چیت کر رہے تھے جو صرف گاندھی جی اور سردار پٹیل کو بھیجا گیا تھا۔ قصہ یہ تھا کہ نہرو اور پٹیل میں سخت ناراضگی تھی۔ اور نہرو پٹیل سے لکھ کر گاندھی جی کے توسط سے بات چیت کیا کرتے تھے۔ راج کماری کا کہنا ہے اگر اس روز گاندھی جی قتل نہ ہو جاتے تو یقیناً وہ سردار پٹیل سے کابینہ چھوڑ دینے کے لیے کہتے۔ گاندھی کے قتل نے ہر

اور پٹیل کو اپنے اختلافات ختم کر کے مل کر کام کرنے پر مجبور کر دیا۔

گاندھی جی کے قتل کے کوئی چھ ماہ بعد میں وزیر اعظم کے سیکرٹریٹ میں نہرو کے کمرے میں داخل ہوا۔ نہرو میز پر سر جھکائے رو رہے تھے۔ اُن کے رخساروں پر آنسو رواں تھے۔ میں خاموشی سے اُلٹے پاؤں واپس آ گیا۔ نہرو نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ یقیناً وہ باپو کی یاد میں آنسو بہا رہے تھے۔

Nehru, Upadhyaya and the author, 1946

Lady Mountbatten, Lord Mountbatten, Nehru and Radhakrishnan

باب ۶

لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور "فریڈم ایٹ مڈنائٹ"

۱۹۷۲ء میں مجھے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے لکھا کہ میں لیری کولنز اور ڈومینک لیپری سے ملوں۔ مجھے علم تھا کہ ان دونوں مصنفوں کو ماؤنٹ بیٹن نے ۳۲ گھنٹے تک اپنا انٹرویو ریکارڈ کرایا ہے۔ یہی دونوں "فریڈم ایٹ مڈنائٹ" کے مصنف ہیں۔ لیری کولنز نے مجھ سے دوبار ملاقات کی اور مجھ سے بعض ایسے معاملات کے بارے میں گفتگو کی جن کا انکشاف لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنے انٹرویو میں کیا تھا۔ میں نے دو یا تین معاملات میں ماؤنٹ بیٹن کے موقف کی تردید کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب کتاب "فریڈم ایٹ مڈنائٹ" شائع ہونے والی تھی تو کولنز نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو میرے ساتھ ہونے والی گفتگو سے مطلع کیا۔ اِس کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے بی بی سی کو انٹرویو دیا۔ اپنے انٹرویو میں اس نے ان امور کا ذکر کیا۔ جن کی میں تردید کر چکا تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا:

> "اگست ۴۷ء کے اواخر اور ستمبر کے اوائل میں جب پاکستان اور ہندوستان کے درمیان سرحدی افواج کی تقسیم عمل میں آ چکی تھی۔ میں جان بوجھ کر شملے چلا گیا تھا۔ کیونکہ اب بظاہر میرا کوئی کام باقی نہ تھا۔ میں آزاد ہندوستان کا محض آئینی سربراہ تھا۔ میں دہلی سے دور اِس لیے بھی رہنا چاہتا تھا کہ لوگ سمجھ لیں کہ اب اُن کی اپنی حکومت ہے اور ساری قوت دہلی میں مرکوز ہے۔ میرا کام صرف یہ ہے کہ حکومت کے احکامات

پر محض دستخط کروں۔ شملے میں ابھی دو تین دن ہی گزرے تھے کہ میرے سٹاف کے بہترین افسر وی پی مینن نے مجھے ٹیلی فون کیا۔ "فسادات دہلی تک پھیل گئے ہیں۔ دارالحکومت خطرے میں ہے۔ آپ فوراً واپس آجائیں۔" مَیں نے اس سے پوچھا کہ میری واپسی کے لیے کس نے کہا ہے اس پر مینن نے جواب دیا کہ وزیراعظم اور ڈپٹی وزیراعظم دونوں آپ کی واپسی کے خواہشمند ہیں۔ میں نے مینن کو جواب دیا۔ "مَیں نہیں آرہا۔" "کیوں" اس نے پوچھا۔ مَیں نے کہا کہ "مَیں تو دنیا کو واضح طور پر یہ دکھانے کے لیے شملے آیا ہوں، کہ وہ (نہرو اور رفقا) اپنے معاملات میں آزاد اور خود مختار ہیں۔ میں دہلی آکر اُن کے سروں پر مسلط نہیں ہونا چاہتا۔" اس پر وی۔ پی۔ مینن نے کہا۔ "اگر آپ ۲۴ گھنٹے میں نہیں آسکتے تو پھر آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ معاملہ ختم ہو چکا ہوگا اور ہم ہندوستان سے ہاتھ دھو چکے ہوں گے۔" تب مَیں نے کہا "وی پی تم بڈھے سوئر ہو، بالآخر تم نے مجھے دہلی واپسی پر آمادہ کر لیا ہے۔"

"مَیں فوراً شملے سے دہلی پہنچا اور سیدھا گورنمنٹ ہاؤس گیا۔ وہاں وزیراعظم اور نائب وزیراعظم میرے منتظر تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ صورت حال کتنی سنگین ہے اور مجھ سے پوچھا کہ کیا میں ملک کا نظم و نسق سنبھال لوں گا مَیں نے جواب دیا کہ ابھی ابھی تو آپ لوگوں نے حکومت سنبھالی ہے۔ اب مَیں کیسے ملک کا انتظام سنبھالوں۔ اس پر وہ دونوں بولے۔ "آپ کی بات ٹھیک ہے مگر ہم لوگ تو صرف ایجی ٹیشن کرانا جانتے ہیں ایڈمنسٹریشن کو چلانا ہمارے بس میں نہیں۔ ہم معاملات کو سنبھالنے سے قاصر ہیں۔ آپ کو ہی کچھ کرنا ہوگا۔"

مَیں نے دیکھا کہ وہ دونوں سنجیدگی سے یہ سب کچھ کہہ رہے تھے۔ چنانچہ میں نے

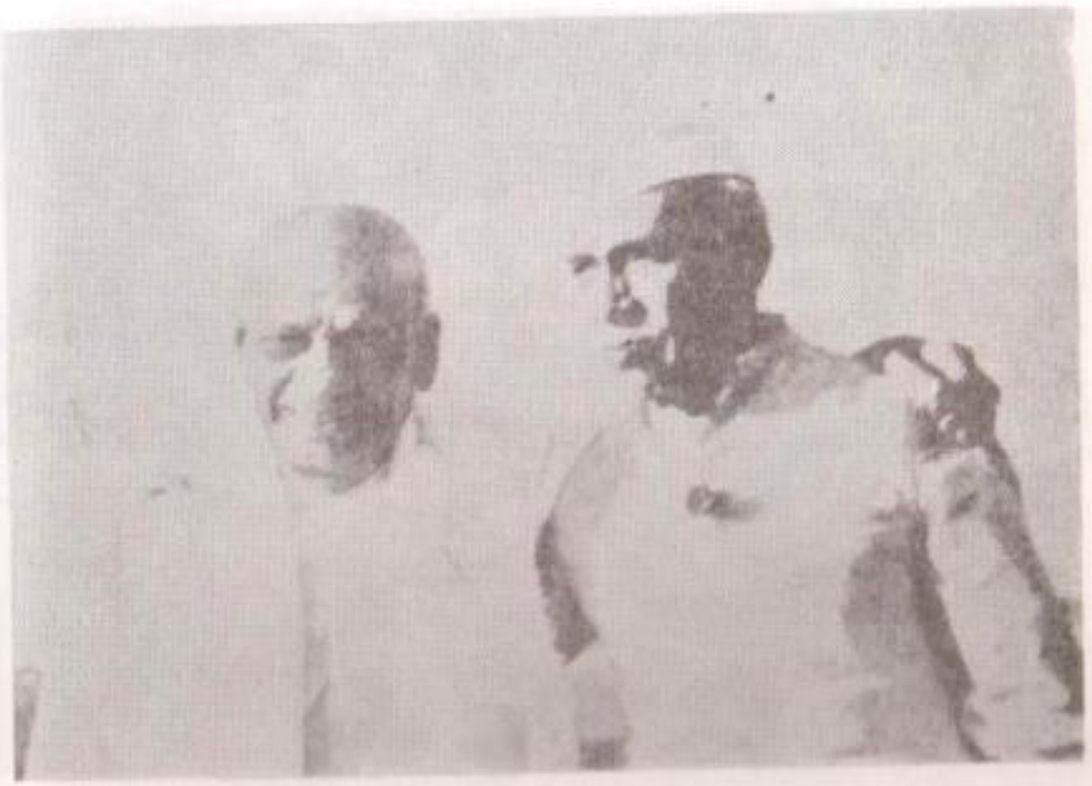

Patel and Nehru (late forties)

Rajendra Prasad and Nehru

لیکن میں صرف ایک شرط پر آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔ وہ یہ کہ ہم کوئی ایسا طریقہ اختیار کریں جس سے دنیا کو یہ معلوم نہ ہو کہ ملک کا نظم و نسق میرے ہاتھ میں ہے بلکہ ایسا معلوم ہونا چاہیئے کہ سارا کام آپ لوگ ہی کر رہے ہیں اور ہم یہ سب راز رکھیں گے اور اپنی زندگی کی آخری سانس تک اس کی حفاظت کریں گے۔ کیونکہ آپ لوگوں کی نیک نامی اور بھلائی اسی میں ہے۔

اب میں نے انہیں اس کا طریق کار بتایا۔ میری تجویز تھی کہ ہم ایک ہنگامی کمیٹی قائم کریں گے۔ اس کے ارکان کا انتخاب میری پسند سے ہوگا اور اس کا پہلا اجلاس آج ہی پانچ بجے شام ہوگا۔ میں اس کانفرنس کے لیے اپنا سیکرٹری متعین کروں گا۔ جو کانفرنس کی کارروائی کی رپورٹ تیار کرے گا، اور ہم نہایت تیزی سے کام کریں گے۔ کانفرنس میں وزیر اعظم میری دائیں طرف اور نائب وزیر اعظم بائیں طرف بیٹھیں گے میں تم دونوں سے مشورہ کروں گا اور پھر کہوں گا:

"آپ کے خیال میں ہمیں یہ اقدام نہیں کرنا چاہیئے۔" آپ دونوں کہیں۔

"بالکل کرنا چاہیئے۔" اسی طرح میں مختلف اقدامات کے بارے میں پوچھوں گا اور آپ صرف ہاں کہتے جائیں گے۔"

اسی طرح ماؤنٹ بیٹن نے یہ تاثر دیا کہ اسے آزادی کے دو ہفتے بعد ہی منتیں کر کے شملہ سے بلایا گیا تھا تاکہ وہ ہندوستان کا نظم و نسق سنبھال سکے۔ مگر ماؤنٹ بیٹن کا یہ دعویٰ حقائق کے برعکس ہے۔ میں نے اس سلسلے میں ماؤنٹ بیٹن سے حال ہی میں کچھ خط و کتابت بھی کی ہے تاہم اس سے قطع نظر میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے شملہ سے دہلی آنے کے بارے میں حقائق بیان کرتا ہوں۔

درحقیقت یہ سارا ڈرامہ وی۔ پی مینن نے رچایا تھا۔ جس کی ذمہ داری فقط اسی پر عائد ہوتی ہے۔ مینن کی سرشت میں سچ بولنا شامل ہی نہیں۔ اس نے ۴ ستمبر ۴۷ء کو دہلی سے شملہ میں ماؤنٹ بیٹن کو از خود فون کیا۔ اس سلسلے میں نہرو یا پٹیل (نائب وزیر اعظم) سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا تھا۔ ۵ ستمبر کی صبح کو مینن ہانپتا کانپتا میرے پاس پہنچا۔ تاکہ میں اس سلسلے میں وزیر اعظم کو ہموار کروں۔ میں نے مینن سے پوچھا کہ کیا دریائے جمنا کے کنارے او کھلو میں کوئی بحری جنگ چھڑ گئی تھی۔ جس کے لیے تم نے ارل ماؤنٹ بیٹن کو بلایا ہے۔ (ماؤنٹ بیٹن برطانوی بحری بیڑے کے کمانڈر رہ چکے تھے۔) میں نے مینن سے کہا کہ تم سردار پٹیل کے پاس جا کر سارا معاملہ بیان کرو مینن کے جانے کے بعد میں نے وزیر اعظم کو اس کی حرکت سے آگاہ کیا۔ میری توقع کے مطابق نہرو بہت سیخ پا ہوئے اور مجھ سے کہا کہ میں ابھی مینن سے ٹیلی فون پر بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ مینن کو نہرو پسند نہیں کرتے۔ چنانچہ میں نے وزیر اعظم سے کہا کہ اس وقت سردار پٹیل اس سے اسی موضوع پر بات کر رہے ہوں گے۔ نہرو فوراً اٹھے اور بے صبری کے عالم میں سردار پٹیل کے گھر جا دھمکے۔ مگر خوش قسمتی سے مینن وہاں سے جا چکا تھا۔ نہرو نے واپسی پر مجھے بتایا کہ پٹیل نے مینن کو نہایت سخت سست کہا ہے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ گورنر جنرل کو خوش آمدید کہا جائے اور دہلی میں جو صورت حال پیدا ہو گئی ہے، اور جس کو مینن نے مبالغہ آرائی سے کچھ کا کچھ بنا دیا ہے۔ اس سے نمٹنے کے لیے گورنر جنرل کو شریک کار بنا لیا جائے۔ یہ تھا سارا قصہ جس کا افسانہ بنا دیا گیا۔

۱۴ ستمبر ۷۶ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے میرے نام ایک خط میں میرے اس دعوے کو چیلنج کیا ہے کہ وی پی مینن نے دہلی کی صورتِ حال بتانے میں مبالغہ آرائی سے کام لیا تھا مینن کے الفاظ جو اس نے ٹیلی فون پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے کہے تھے کہ:

"اگر آپ ۲۴ گھنٹے میں نہیں آ سکتے تو پھر آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ معاملہ ختم ہو چکا ہوگا۔ اور ہم ہندوستان سے ہاتھ دھو چکے ہوں گے۔"

اگر یہ مبالغہ آرائی نہیں تو پھر میں مبالغہ آرائی کے معنوں سے واقف نہیں ہوں۔ میں نے لارڈ

ماؤنٹ بیٹن کو بتایا کہ میرے نزدیک مینن کے یہ الفاظ ہسٹیریا میں مبتلا کسی عورت کی بکواس سے زیادہ نہیں ہیں۔ تاہم اپنے خط میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے یہ اعتراف کیا کہ مینن نے اسے گمراہ کیا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن نے لکھا:

"اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ وی پی مینن نے جھوٹ بول کر مجھے یقین دلا دیا تھا کہ وزیر اعظم اور نائب وزیر اعظم میری دہلی واپسی کے خواہش مند ہیں۔ حالانکہ اس نے ان دونوں سے کوئی مشورہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ انہیں اس وقت مینن کے اقدام کا علم ہوا جب میں شملہ سے واپسی پر رضامند ہو چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب نہرو اور پٹیل دہلی میں مجھ سے ملنے آئے تو وہ حد درجہ مضطرب دکھائی دے رہے تھے۔"

ماؤنٹ بیٹن نے ۱۹۶۹ء میں بھی میرے سامنے اعتراف کیا تھا کہ مینن نے اسے گمراہ کیا تھا۔ اس کے باوجود اکتوبر ۷۵ء میں اس نے بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے سامعین کو یہ تاثر دیا کہ وہ نہرو اور پٹیل کی درخواست پر شملہ سے دہلی آیا تھا۔ اس کا یہ دعویٰ صداقت سے یکسر عاری ہے۔

شملہ سے واپسی پر ماؤنٹ بیٹن سے نہرو اور پٹیل کی جو ملاقات ہوئی میں اس میں موجود نہ تھا۔ اس ملاقات کے بارے میں ماؤنٹ بیٹن نے جو کچھ کہا ہے وہ ماؤنٹ بیٹن کی ڈرامہ بازی کی عادت کی وجہ سے دلچسپ ضرور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نہرو نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بتایا تھا کہ "آپ نے کروڑوں افراد پر مشتمل فوجوں کی کمان کی ہے۔" ماؤنٹ بیٹن جنوبی ایشیا میں برطانوی افواج کے سپریم کمانڈر رہ چکے تھے۔ مگر ان کی کمان کوئی قابل رشک نہ تھی۔ بلکہ اس پر سرے سے کوئی توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ پھر مجھے تو کوئی علم نہیں، کہ ماؤنٹ بیٹن نے کہاں کروڑوں افراد کی کمان کی ہے۔ ہندوستان کی فوج جو اس ملک میں مقیم تھی۔ ماؤنٹ بیٹن کی کمان میں نہیں تھی۔ امریکی اسے منہ نہ

لگاتے تھے بلکہ وہ تو اس کی کمان کو "گیدڑ پروانہ" قرار دیتے تھے۔ کیونکہ ایشیا میں جاپان سے نمٹنے کا کام ماؤنٹ بیٹن کے بجائے امریکی جنرل میکارتھر کے سپرد کیا گیا تھا۔ جنوبی ایشیا میں امریکیوں کی دلچسپی فضا اور زمینی راستوں سے جنگی ساز و سامان کی سپلائی تک محدود تھی۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ہندوستان، برما اور چین کو ملانے والی سڑک تعمیر کی اور وہ خود ہی اس کی دیکھ بھال بھی کرتے تھے۔ امریکی یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ ان کی امداد سے نوآبادیاتی ملک برطانیہ، ہالینڈ اور فرانس جنوب مشرقی ایشیا میں اپنی نوآبادیوں کو پھر سے غلام بنالیں۔

کہا جاتا ہے کہ نہرو نے ماؤنٹ بیٹن کو بتایا کہ "تم اعلیٰ درجہ کے ایڈمنسٹریٹر ہو"۔ مگر یہ کوئی بات نہ ہوئی۔ میں نے تو ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ لینن کے اس مقولے میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہے کہ "ایک باورچی بھی کسی ملک کا نظم و نسق چلا سکتا ہے۔" میں نے کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ ہندوستان منقسم پنجاب اور دہلی پر مشتمل ہے۔ جس کا نظم و نسق ماؤنٹ بیٹن کو سنبھالنا تھا۔ نہ ہی میں سمجھتا ہوں کہ کسی گورنر جنرل کا ایسی کمیٹی کی صدارت کرنا جو غیر اخلاقی معاملات کو نمٹانے کے لیے وجود میں لائی گئی ہو، ملک کا نظم و نسق سنبھالنے کے مترادف ہے۔ گورنر جنرل حکومت کا ایک حصہ بھی ہوتا ہے اور اس سے بالاتر بھی، لہٰذا کسی اقدام میں اسے شریک کرنے سے نہرو یا پٹیل کی نیک نامی کو کوئی خطرہ لاحق نہ تھا۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ وی پی مینن کی شرارت سے قطع نظر محض صورت حال کے پیش نظر، گورنر جنرل کو دہلی بلانا ضروری تھا تو میرا جواب نفی میں ہوگا۔ آخر کار پاکستان بھی تو تھا جس کے حالات ہندوستان سے یقیناً بہتر نہ تھے اور وہ ان حالات سے عہدہ برا ہوا۔

یہ حقیقت ہے کہ دہلی اور پنجاب میں جو کچھ ہوا وہ بالکل غیر متوقع نہیں تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تقسیم کے مابعد اثرات نہایت ہولناک تھے اور اس دوران میں لارڈ اور

لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے جو خدمات انجام دیں۔ اس پر وہ ہندوستانی عوام کے خراجِ تحسین کے مستحق ہیں۔ وہ دونوں دہلی سے چلے جانے کے بعد بھی ہندوستان کے دوست رہے۔

اب "فریڈم ایٹ مڈنائٹ" کتاب کو لیجئے۔ ماؤنٹ بیٹن نے جو سب سے خوفناک غلطی کی وہ یہ تھی کہ وہ شہید سہروردی کی باتوں میں آگئے اور انہوں نے برطانوی حکومت کو "آپریشن بلقان" کا منصوبہ بھجوا دیا۔ ماؤنٹ بیٹن کو یہ تک معلوم تھا کہ جناح اِس معاملہ میں مخالفت نہیں کریں گے۔ لیکن اس نے یہ معلوم کرنے کی زحمت گوارہ نہ کی کہ آیا نہرو بھی اس معاملہ میں موافقت کریں گے۔ اگر اس کا یہ خیال تھا کہ وہ نہرو کو ہموار کرلے گا تو یہ اس کی بھول تھی۔ یہ مئی ۴۷ کا ذکر ہے۔ نہرو شملہ میں وائسرائے لاج میں موجود تھے۔ مَیں ان کے ساتھ تھا۔ اچانک ماؤنٹ بیٹن کو خیال آیا کہ نہرو سے آپریشن بلقان پر مشورہ کیا جائے۔ جب نہرو کو اس کا علم ہوا تو وہ آگ بگولا ہو گئے۔ وہ آدھی رات کو کرشن مینن کے کمرے میں جا دھمکے۔ اب ماؤنٹ بیٹن کو ساری رات بیٹھ کر اپنے منصوبے کو بدلنا پڑا۔ نہرو ماؤنٹ بیٹن سے بددل ہو گئے اور اسے نہرو کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے خاصی جدوجہد کرنا پڑی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ماؤنٹ بیٹن یہ سب کچھ بھول گیا۔ اسے اپنی غلطی تو یاد نہیں رہی مگر نہرو سے مشورہ کرنے کے "خیال" کو وہ اپنا اعزاز بنائے پھرا۔

باب

ماؤنٹ بیٹن

لارڈ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے، گورنر جنرل اور تاج برطانیہ کے نمائندے کی حیثیت سے ۲۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو دہلی آئے۔ ان کا مشن انڈیا میں برطانوی شہنشاہیت کو ختم کرنا تھا جس کی بنیاد ان کی پڑنانی ملکہ وکٹوریہ نے رکھی تھی۔ لمبے قد کا نیلی آنکھوں والا وجیہہ اور خوش رو ماؤنٹ بیٹن جس کے نام کے ساتھ القابات اور خطابات کی طویل لائن تھی۔ شاہی خاندان کا فرد ہونے پر نازاں تھا۔ میں جب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ برصغیر ہند میں تاجِ برطانیہ سے دو خود مختار ملکوں کو انتقالِ اقتدار کا ہوش ربا حد تک عظیم کام صرف پانچ ماہ میں کیوں کر مکمل ہوا۔ جہاں تک کام کرنے کا تعلق ہے ماؤنٹ بیٹن میں بجلی بھری ہوئی تھی۔ وہ ہر بات کی تفصیل جانتا اور جاننا چاہتا تھا۔ وہ اپنے عملہ سے جس کا انتخاب وہ نہایت احتیاط سے کرتا تھا، کام لینا خوب جانتا تھا۔ اس میں عمدہ منتظم کی ساری صلاحیتیں موجود تھیں اور وہ اس طرح کام کا اہتمام کرتا کہ دفتر کا سارا عملہ محسوس کرتا کہ وہ کسی بڑی مہم میں گورنر جنرل کے ساتھ برابر کا شریک ہے۔

ماؤنٹ بیٹن چرچل کا پروردہ تھا۔ یہ چرچل ہی تھا جس نے چکر چلا کر جنوب مشرقی ایشیا کی سپریم کمان ماؤنٹ بیٹن کو دلوائی تھی۔ ایشیا اور خصوصاً ہندوستان میں قیام کے دوران ماؤنٹ بیٹن کو جو تجربات حاصل ہوئے۔ ان کی وجہ سے وہ آزاد خیال ہو گیا تھا حالانکہ اس کا تعلق انگلستان کے شاہی خاندان سے تھا اور وہ چرچل کا بے حد وفادار تھا

لیڈی ماؤنٹ بیٹن اپنے شوہر سے بھی زیادہ آزاد خیال تھیں اور انسان دوستی کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ دونوں میاں بیوی میں یہ خوبی تھی کہ وہ جن لوگوں سے ملتے ان کے دلوں میں گھر کر لیتے۔ تاہم وہ محمد علی جناح کو متاثر نہ کر سکے۔

ہندو قوم لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی شکر گزار تھی۔ اسی لیے اُسے آزاد ہندوستان کا پہلا گورنر جنرل بننے کی پیش کش کی گئی۔ اس پیش کش پر نہ صرف برطانوی عوام بلکہ تاج برطانیہ کو بھی بے حد مسرت ہوئی۔ خود ماؤنٹ بیٹن بھی اس پیش کش سے بے حد متاثر ہوا اس نے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آزاد ہندوستان کے پہلے آئینی سربراہ کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔

ماؤنٹ بیٹن کو جب متحدہ ہندوستان کا وائسرائے مقرر کیا گیا تو تاج برطانیہ کی طرف سے اسے وائی کاؤنٹ کا خطاب بھی دیا گیا تھا۔ اور ہندوستان کی آزادی کے موقع پر اس کا اعزاز بڑھا کر "ارل" کر دیا گیا۔ ماؤنٹ بیٹن خطابات اور تمغوں پر جان چھڑکتا تھا۔ جب اسے بھارت کا گورنر جنرل بنے کئی ماہ گزر گئے تو اس نے نہرو کو ترغیب دی کہ وہ انگلستان کے بادشاہ کے حضور درخواست گزارے کہ ماؤنٹ بیٹن کو "مارکوئیس" کا خطاب دیا جائے۔ میں نے وزیر اعظم کو اس سفارش سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ میری دلیل یہ تھی کہ شاہ انگلستان نہرو کی سفارش رد کر دے گا کیونکہ اصولاً کسی ایک شخص کو یکے بعد دیگرے خطابات نہیں دیئے جاتے۔ نہرو نے کہا کہ اگر بادشاہ میری سفارش رد بھی کر دے تو میرا کیا جائے گا۔ اور نہرو نے ماؤنٹ بیٹن کی خواہش کے مطابق بادشاہ کو درخواست گزاری جو مسترد کر دی گئی۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے بارے میں ایک بات کی مجھے سمجھ نہیں آئی۔ وہ اپنے خاندان کی بڑائی پر بیشتر وقت صرف کرتا تھا۔ گویا یہ اس کا مشغلہ بن گیا تھا۔ وہ یورپ اور روس میں اپنی موجودہ اور سابقہ خالاؤں، پھوپھیوں، خالہ زاد بہنوں، چچا زاد بھائیوں اور دوسرے رشتہ داروں کا ذکر کرتے نہ تھکتا۔ اس کے رشتہ داروں کی فہرست شیطان کی آنت تھی۔ ان کا تعلق جرمن آباو اجداد سے تھا۔ جیسے نیپال سپاہی برآمد کرتا ہے۔ اسی طرح ایک زمانے میں جرمنی شہزادے اور شہزادیاں برآمد کیا کرتا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے شروع میں ایک بار جارج برنارڈ شا نے کہا تھا:

"یہ جنگ جرمنی کے قیصر اور جرمن زار روس اور جرمن شاہ انگلستان کے درمیان ہے۔"

مئی ۱۹۴۸ء میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے نہرو کو شملہ میں اپنے ہاں مدعو کیا۔ نہرو شملہ گئے اور وائسرائے لاج میں قیام کیا۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس دوران کوئی رسمی تقریبات نہیں ہوئیں۔ بلکہ ہم جب شملہ سے دور پہاڑوں میں نارکنڈہ کے مقام پر پکنک منانے گئے تو کار خود ماؤنٹ بیٹن چلا رہا تھا۔ وہ ہمیں کفری بھی لے گیا، جو ایک اور خوبصورت مقام ہے۔ ایک رات کا ذکر ہے کہ کھانے کے بعد لیڈی اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن، کیپٹن نریندر سنگھ، لیڈی پامیلا۔ کیپٹن سکاٹ نہرو اور میں گول میز کے گرد بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ ماؤنٹ بیٹن نے افواہوں کا ذکر چھیڑ دیا کہ لوگ کس طرح افواہوں پر یقین کر لیتے ہیں۔ اُس نے کہا کہ اگر سچی بات بھی متعدد افراد سے ہو کر آئے تو اس میں اس قدر تحریف ہو جاتی ہے کہ اس کی شناخت بھی ممکن نہیں رہتی۔ ماؤنٹ بیٹن نے ہم سب سے کہا کہ آیئے اس سلسلے میں ایک کھیل کھیلیں۔ جس کا نام اس نے "افواہ" رکھا۔ کھیل یہ تھا کہ تمام افراد ایک خاتون کا خاکہ بنائیں، جو کرسی کے سامنے بیٹھی اپنے کتے سے کھیل رہی ہے۔ طریقہ یہ تھا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن یہ خاکہ بنانے کی ابتدا کرے گا۔ اور ایک خط کھینچے گا۔ اسے دیکھ کر دوسرا شخص اپنے کاغذ پر لکیر لگائے گا، اور تیسرا شخص دوسرے شخص کے خط کو دیکھ کر اپنا خاکہ شروع کر دے گا۔ اسی طرح سب ایک دوسرے کے خط کو دیکھ کر خط کھینچیں گے اور

بالآخر خاکے مکمل ہو جائیں گے۔ جب یہ خاکے مکمل ہوئے تو عجیب و غریب تھے۔ ایک کا خاکہ دوسرے سے نہیں ملتا تھا۔ حالانکہ یہ خاکے ہر ایک نے دوسرے سے نقل کر کے بنائے تھے۔

آزاد بھارت کا پہلا گورنر جنرل اور وائسرائے رہنے کے بعد ماؤنٹ بیٹن امریکہ میں برطانوی سفیر مقرر ہو سکتا تھا مگر اس نے واپس بحریہ میں جانا پسند کیا اور اکتوبر ۱۹۴۸ء میں اُسے مالٹا میں تباہ کن جہازوں کے ایک سکویڈرن کا کمانڈر بنا دیا گیا۔ دراصل ماؤنٹ بیٹن برطانوی بحریہ کا کمانڈر انچیف بننا چاہتا تھا۔ یہ وہ عہدہ تھا جس سے اس کے باپ کو پہلی جنگ عظیم شروع ہوتے ہی عوام اور اخبارات کے شور و غوغا پر برطرف کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ وہ جرمن النسل تھا۔ مالٹا میں ماؤنٹ بیٹن کا عہدہ بادشاہ کے بعد دوسرا تھا آخر ماؤنٹ بیٹن اپنی خواہش پوری کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ۸ر اپریل ۵۵ء کو اُسے برطانوی بحریہ کا کمانڈر انچیف اور پھر ۵۸ء میں برطانیہ کی مسلح افواج کا سربراہ مقرر کر دیا گیا۔ ۱۹۶۵ء میں ماؤنٹ بیٹن فوج سے سبکدوش ہو گیا۔ اسے لیبر پارٹی اور ٹوری دونوں نے وزارت کی پیش کش کی مگر ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ وہ سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہتا۔ لیڈی ماؤنٹ بیٹن کا انتقال ۲۱ر فروری ۶۰ء کو ہوا، اور اس کی وصیت کے مطابق اس کی لاش سمندر کے سپرد کر دی گئی۔ ماؤنٹ بیٹن کو جنون کی حد تک اس بات کی خواہش تھی کہ تاریخ میں اس کا قد کاٹھ اونچا دکھائی دے۔ اُس نے خود تو اپنے بارے میں کبھی کچھ نہیں لکھا تھا۔ مگر اپنی ذات پر لکھوانے کے لیے اس نے دوسروں کی مدد اور حوصلہ افزائی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ مورخ کی طرح غیر جانبدار رہنے کی صلاحیت سے یکسر عاری تھا۔

باب ۵

چرچل، نہرو اور انڈیا

چرچل بھی خوب آدمی تھے۔ جب برطانوی دارالعوام میں پہلی خاتون رکن لیڈی آسٹر منتخب ہو کر آئیں تو چرچل بڑے پریشان ہوئے۔ انہوں نے اپنے دوستوں کی ایک محفل میں کہا۔ "مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کوئی خاتون اس وقت میرے غسلخانے میں داخل ہو گئی ہے جب میں نہا رہا ہوں اور میرے پاس ستر پوشی کے لئے اسفنج کے ایک ٹکڑے کے سوا کچھ نہیں"۔ ہندوستان چرچل کی کمزوری تھی اور وہ برطانوی راج کے بغیر ہندوستان کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ جب ہندوستان کو آزادی دینے کا فیصلہ کیا گیا تو چرچل اپوزیشن کے راہنما تھے۔ انہوں نے ۶ر مارچ ۴۷ء کو ہندوستان میں انتقال اقتدار کے سوال پر دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے کہا "وائسرائے کی کونسل کے ہندوستانی ارکان کو برطرف کر کے اقتدار نہرو کو تھمانا برطانوی حکومت کی بہت بڑی غلطی تھی۔ نہرو کی حکومت مکمل تباہی سے دوچار ہے اور اس سے حکومت کی مشینری میں جو پہلے ہی کمزور تھی زبردست انحطاط اور بددلی پھیل گئی ہے۔ ہندوستان کے دو بڑے مذہبی فرقوں کے درمیان لڑائی میں تیس چالیس ہزار افراد قتل کر دیئے گئے ہیں۔ بدعنوانی اور رشوت ستانی کا دور دورہ ہے وہ (حکومت) ہندوستان کو آزادی دینے کی باتیں کر رہے ہیں۔ مگر جب سے نہرو کی حکومت برسر اقتدار آئی ہے۔ ہندوستان میں آزادی محدود کر دی گئی ہے۔ ملک میں کمیونزم اس تیزی سے بڑھ رہا ہے کہ کمیونسٹوں کو دبانے کے لئے ان کے مرکزوں پر چھاپے مارنا ضروری سمجھا گیا ہے۔

حالانکہ برطانیہ میں بھی کمیونسٹوں کو اس طرح نہیں دبایا گیا۔ اب تک وہاں آزادی کی سمت میں کام کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ عام افراد کی نقل و حرکت بھی محدود کر دی گئی ہے۔ نہرو کو حکومت سونپنا بھی بنیادی غلطی تھی۔ وہ آزاد ہندوستان اور دولتِ مشترکہ کے درمیان کسی بھی قسم کے رابطے کا شدید مخالف ہے۔ ان حالات میں ہم حکومت کی ہندوستان کے متعلق پالیسی سے اظہار بریت کرتے ہیں اور پالیسی کے جو بھی نتائج ہوں گے۔ ان کی ذمہ داری ہم پر نہیں ہوگی۔"

۲۲ اکتوبر کو لندن میں برطانیہ کے زیرِ انتداب حکومتوں کے وزرائے اعظم کی کانفرنس منعقد ہوئی۔ کانفرنس کی صدارت برطانیہ کے وزیرِ اعظم ایٹلی کر رہے تھے۔ قبل ازیں اس کانفرنس کو برطانوی دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس کہتے تھے۔ اس کانفرنس میں پہلی بار پاکستان ہندوستان اور لنکا کے وزرائے اعظم نے شمولیت کی اس کانفرنس کے بعد کسی رسمی اعلان کے بعد لفظ "برطانوی" ختم کر دیا گیا۔ اس کانفرنس کو دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس کہا جانے لگا۔ کانفرنس میں شرکت کے وقت میں بھی نہرو کے ساتھ تھا۔ ہمارا قیام کالریجز ہوٹل میں تھا ایک صبح کو انڈیا ہاؤس کا ایک سیکرٹری جو کانفرنس کے سلسلے میں ہمارے ساتھ والبتہ تھا گھبرایا ہوا میرے پاس آیا اور بولا کہ اپوزیشن کے قائد ونسٹن چرچل ٹیلی فون پر ہیں اور وزیرِ اعظم سے بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔ میں ٹیلیفون اٹھا کر وزیرِ اعظم کی نشست کے کمرے میں لے گیا۔ چرچل نے سمجھا کہ نہرو بات کر رہے ہیں اور وہ بولنے لگا۔ میں دو منٹ تک تو سنتا رہا۔ وہ نہایت نرم لہجے میں بات کر رہا تھا۔ اس نے التجا کی کہ نہرو دوسرے روز اس کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھائیں۔ پھر اس نے پوچھا "مسٹر نہرو کیا آپ میرے لئے وقت نکال سکتے ہیں" اس مرحلے پر نہرو غسلخانے سے برآمد ہوئے اور میں ٹیلی فون انہیں تھما دیا اور مختصر الفاظ میں بتا دیا کہ چرچل کیا چاہتے ہیں۔ میں نے وزیرِ اعظم سے کہا کہ کل کی بعض غیر اہم مصروفیات کو ترک کر کے چرچل کی دعوت قبول کر لی جائے۔ نہرو نے مختصر سی بات چیت کے بعد چرچل کی دعوت قبول کر لی۔ اگلے دن دعوت سے واپسی پر نہرو نے مجھے بتایا کہ چرچل سے کوئی اہم بات چیت نہیں ہوئی۔ البتہ چرچل کی ان کے قریب ہونے کی کوشش کرتے ہے۔

ملکہ الزبتھ ثانی کی تاجپوشی کے فوراً بعد ۳۰ جون ۵۳ء سے لندن میں دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی ایک اور کانفرنس ہوئی۔ اس وقت چرچل برطانیہ کے وزیرِ اعظم تھے کانفرنس کی صدارت انہوں نے کی۔ میں بھی حسب معمول کانفرنس میں نہرو کے ساتھ شریک تھا۔ جب چرچل کانفرنس روم میں آئے تو ایٹلی کے برعکس ان کی موجودگی میں سب کو یہ احساس ہوا کہ کوئی بڑا آدمی سامنے آگیا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اور ٹھہر کر بولتے تھے۔ چرچل کی بڑا مقرر بننے کی خواہش تو پوری نہ ہو سکی۔ مگر وہ ایک عمدہ قلم کار ضرور بن گئے۔ ان کی تحریر میں بے پناہ قوت تھی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ تقریر میں بالکل کورے تھے۔ وہ تقریر خوب کرتے البتہ مختصر نوٹس سامنے رکھتے تھے۔ پھر انہیں دوسروں کے فقرے اور ضرب الامثال چرا کر استعمال کرنے میں بھی ملکہ حاصل تھا۔ مگر نہرو نے کبھی کسی دوسرے کا جملہ یا فقرہ نہیں چرایا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کمیونسٹ ممالک کے لئے "آہنی پردہ" کی اصطلاح چرچل نے وضع کی ہے۔ مگر یہ درست نہیں۔ یہ الفاظ پہلے پہل ایتھل سٹوڈون کی کتاب "بالشویک روس میں" استعمال کئے گئے تھے جو ۱۹۲۰ء میں طبع ہوئی۔ مگر اس اصطلاح کا روس کے زیرِ اثر ملکوں کے لئے استعمال نازی پروپیگنڈہ کے ماہر گوئبلز نے ایک مضمون میں کیا۔ جو ۲۵ فروری ۱۹۴۵ء کو "پارلیمنٹ" نامی جریدے میں طبع ہوا۔ یہ ہفت روزہ جریدہ گوئبلز کی ادارت میں شائع ہوتا تھا گوئبلز نے لکھا تھا۔ "اگر جرمن عوام ہتھیار رکھ دیں تو روزویلٹ، چرچل اور سٹالن کے معاہدہ کے مطابق روس پورے مشرقی اور جنوب مشرقی یورپ پر قبضہ کرے گا۔ اس کے ساتھ ہی جرمنی کا ایک بڑا حصہ بھی روس کے قبضہ میں چلا جائے گا۔ پھر دنیا کے اس بڑے حصہ پر روس "آہنی پردہ" ڈال دے گا۔"

چرچل الفاظ کے مناسب استعمال پر بیحد زور دیتے تھے۔ ایک مرتبہ رات کے کھانے کے دوران چرچل نے اپنی اہلیہ سے کہا "یہ جو تم کہتی ہو کہ فلاں چیز بہت مزیدار ہے صحیح نہیں

صرف "مزیدار" کہنا ہی کافی ہے۔ پھر "بیحد نایاب" کہنا بھی درست نہیں۔ محض نایاب یا بیمثال کہنا ہی کافی ہے۔" الفاظ کے صحیح استعمال کے حق میں چرچل نے ایک مرتبہ یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے ایک لطیفہ سنایا۔

ایک بار تھامسن نامی ایک شخص ڈاکٹر کے پاس گیا اور اسے کہا "مجھے آختہ کر دیجئے۔" ڈاکٹر نے اسے ٹالنا چاہا، مگر تھامسن کا اصرار جاری رہا۔ آخر ڈاکٹر بڑے تامل کے بعد رضامند ہو گیا اور اسے ہسپتال میں داخل کر لیا گیا۔ اگلے دن اس کا مطلوبہ آپریشن کیا گیا۔ تھامسن رات بھر تو دواؤں کے زیر اثر سوتا رہا۔ صبح کو اس کی آنکھ کھلی تو اس کے ساتھ والے بستر پر ایک نوعمر لڑکا کراہ رہا تھا۔ تھامسن نے اس سے پوچھا۔ "بھئی تمہیں کیا ہوا ہے۔" "میرا ختنہ کیا گیا ہے۔" لڑکے نے جواب دیا۔ اب تھامسن سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور بڑبڑایا۔ "ہت تیرے کی۔ مجھے بھی تو ختنہ ہی کرانا تھا۔ مگر یہ لفظ ہی میرے ذہن میں نہیں آیا۔"

ایک دن چرچل اپنے بستر میں بیٹھا چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ "بھئی گرم پانی کی بوتل لاؤ۔" نوکر بھاگتا ہوا اس کے کمرے میں گیا اور کہا "جناب آپ گرم پانی کی بوتل پر بیٹھے ہوئے ہیں۔" "یہ کوئی اچھی بات نہیں۔" اس پر چرچل مسکرایا اور بولا "بھئی یہ تو محض حسن اتفاق ہے۔"

چرچل نہرو کے بڑے مداح بن گئے تھے۔ دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس کے بعد مشترکہ اعلامیہ جاری ہونا تھا۔ دونوں وزرائے اعظم اس کے مسودے پر غور کر رہے تھے۔ نہرو نے جہاں جہاں بھی اعلامیہ کے مسودے میں تبدیلیوں کی تجویز کی چرچل سر ہلا ہلا کر اس کی تائید کرتے رہے۔ ایک دن برطانوی کابینہ کے سیکرٹری لارڈ نارمن بروک نے مجھے بتایا کہ کل ایک محفل میں کسی نے نہرو کے خلاف باتیں کیں۔ تو چرچل نے اسے ملامت کی اور کہا کہ نہرو وہ شخص ہے۔ جس نے نفرت اور خوف دونوں پر فتح پائی ہے۔ ہمارے لندن سے روانہ ہونے سے قبل چرچل نے نہرو کو اپنے ہاتھ سے مختصر سا خط لکھا۔ "یاد رکھو تم ایشیا کی روشنی ہو۔" چرچل کتنا بدل گیا تھا۔

عام خیال کے برعکس چرچل اور نہرو کا مطالعہ زیادہ وسیع نہ تھا انہوں نے اپنی زندگیوں میں مطالعہ کی نسبت لکھنے اور بولنے میں زیادہ وقت گزارا۔ نہرو اور چرچل دونوں امریکی وزیر خارجہ جان فاسٹر ڈلس کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ مخصوص محفلوں میں چرچل ڈلس کو غبی اور بے تکا حرامی کہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے کہا کہ ڈلس کسی پادری کی طرح تبلیغ کرتا رہتا ہے اور اس کے وعظ کی تان اس بات پر ٹوٹتی ہے کہ مالنکوف (روسی وزیر خارجہ) سے بات چیت کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ ایک اور موقع پر چرچل نے کہا کہ ڈلس اتنا ہوشیار تو ہے کہ اسے اُلو کا پٹھا نہیں کہا جا سکتا۔ نہرو بھی چرچل سے پیچھے نہ تھے وہ ڈلس کو "ڈل" "ڈلر" اور ڈلس (غبی، نسبتاً غبی اور بالکل غبی) کہہ کر مزے لیتے تھے۔ نہرو نے ایک بار کہا "میری طرف سے کرشنا مینن ڈلس کا جواب ہے۔" نہرو مغرور شخص تھے۔ انہوں نے خود مجھے ایک بار کہا تھا کہ وہ اپنی ذات پر نازاں ہیں اور مغرور ہیں۔ گو وقت آنے پر میں انکساری بھی اختیار کر سکتا ہوں۔ نہرو بہت کم گالی دیتے تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ ایک شخص کے لئے "ملعون" کا لفظ استعمال کیا تھا مگر چرچل تو ایسے الفاظ کا بکثرت استعمال کرتے تھے۔

چرچل نپولین سے بہت متاثر تھے۔ ان کی خوابگاہ میں نپولین اور نیلسن کے مجسمے رکھے ہوئے تھے ایک دن لارڈ موران چرچل سے ملنے آئے۔ ملاقات چرچل کی خوابگاہ میں ہوئی لارڈ موران نپولین کا مجسمہ دیکھ رہے تھے کہ چرچل نے کہا کہ "آہ یہ کیسا خوبصورت چہرہ تھا جس میں سے ایک جابغہ نے نوع انسانی کو دیکھا۔ نپولین کمال کا آدمی تھا بلکہ نسل انسانی میں انتہائی بلندیوں پر نظر آتا ہے۔" مگر نہرو نے اپنی کتاب "تاریخ کی جھلکیاں" میں نپولین کی سطحی سی تصویر کھینچی ہے۔ حالانکہ مشہور مؤرخ لارڈ ریکٹن نے کیمبرج میں نپولین پر لکچر دیتے ہوئے کہا تھا۔ "نپولین بنی نوع انسان کا قابل ترین فرد تھا۔"

نہرو میں چرچل کی طرح کی فولادیت نہ تھی اور وہ مشکلات میں چرچل کے سے عزم و حوصلہ سے بھی عاری تھے۔ جب ۱۹۶۲ء میں چین نے بھارت پر حملہ کیا تو نہرو خزاں رسیدہ

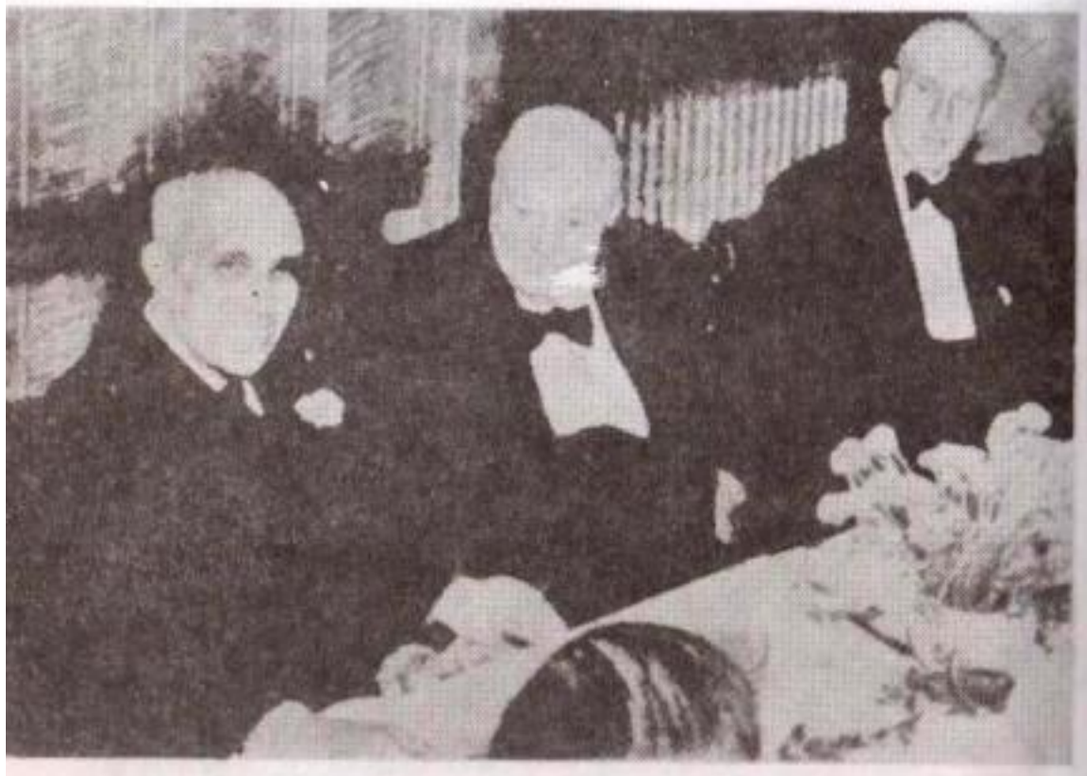

Nehru and Churchill, 1953

Nehru, Indira and the kids Rajiv and Sanjay in Switzerland with the author, 1953

پتے کی طرح زرد ہو گئے تھے۔ ان کی صحت اس ذہنی جھٹکے کو برداشت کرنے کے قابل نہ تھی۔ بہت سی چیزیں جن کی وہ قدر کرتے تھے ان کے سامنے ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئی تھیں اور ان کی صحت بھی جواب دے گئی تھی چینی حملے کے باعث نہرو کی موت قریب آگئی۔

نہرو اور چرچل اپنی تقریریں دوسروں سے نہیں لکھواتے تھے۔ جیسا کہ آج کل بھارت میں دستور ہے اگرچہ نہرو آتش بیان مقرر نہ تھے۔ تاہم انہوں نے متعدد ایسی تقریریں کی ہیں۔ جو ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ ان میں فی البدیہہ تقریریں بھی شامل ہیں۔

باب ۹

برنارڈ شا سے نہرو کی ملاقات

میری اور نہرو کی جارج برنارڈ شا سے ملاقات ۲۹ اگست ۱۹۴۹ء کو ہوئی اس وقت شا کی عمر ۹۳ سال تھی اور اگلے سال ہی اسے قید حیات سے نجات مل گئی۔ ملاقات سے قبل شا نے ہمیں لینے کے لئے اپنی کار بھیجنے پر اصرار کیا۔ اس نے لندن میں بھارتی ہائی کمیشن کو ایک چھپا ہوا کاغذ بھیجا جس میں اس کے گھر کا راستہ درج تھا اس کے نچلے حصے میں شا نے لکھا "میری کار جمعہ کو ساڑھے نو بجے کلیرجز ہوٹل پہنچ جائے گی۔ یہ ایک رولز رائس لیموسین ہے، جس میں چار پتلی یا تین موٹی سواریاں بیٹھ سکتی ہیں۔ یہ کار سارا دن آپ لوگوں کے لئے وقف رہے گی اور اسی میں آپ واپس بھی جا سکیں گے آپ کی سہولت کے لئے عرض کر دوں۔ لندن میں صرف ایک ٹیکسی ڈرائیور ہے، جسے میرے گھر کا راستہ معلوم ہے اس کا فون نمبر ۵۲۵۷ ہے لیکن اس کی ضرورت صرف حادثہ کی صورت میں پیش آ سکتی ہے۔"

میں نہرو کے ساتھ شا کے گھر گیا جو ایٹ سینٹ لارنس میں واقع ہے۔ ہم برنارڈ شا کی کار میں سوار تھے۔ اور ہمارے پیچھے پیچھے کرشنا مینن کی رولز رائس خالی آ رہی تھی کیونکہ ہمیں اس کار میں واپس آنا تھا۔ شا کا گھر سادہ مگر کشادہ تھا۔ ہماری ملاقات لائبریری میں ہوئی۔ وہ اپنی عمر کی نسبت زیادہ صحت مند دکھائی دیتا تھا۔ بات چیت میں یہ کھلا کہ اس کا ذہن نہایت چاق و چوبند ہے۔ ملاقات کے دوران نہرو خاموش رہے۔ وہ صرف ایک بار بولے۔ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے شا نے گاندھی جی سے اپنی ملاقات کا ذکر

Nehru, Indira and her children at Burgenstock, Switzerland, 1953

Nehru, Shaw and the author, 1949

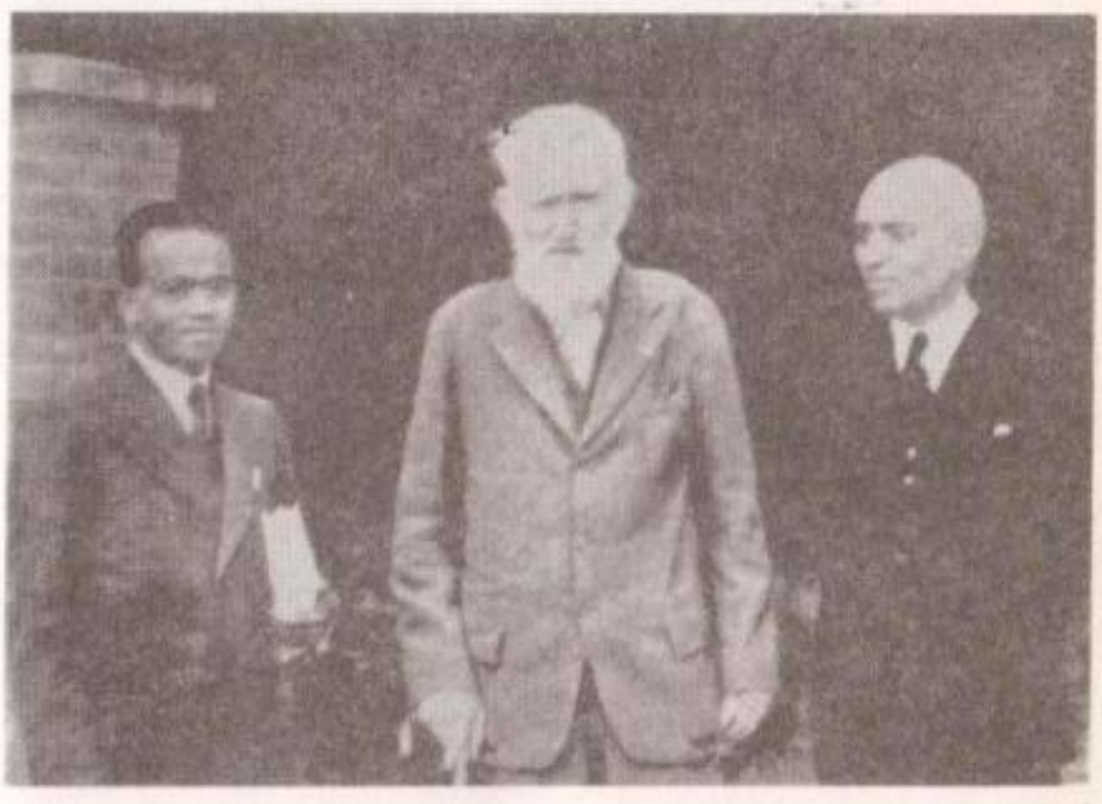

یہ جو ۱۹۳۰ء کے کچھ بعد ہوئی تھی۔ شا نے بتایا کہ وہ گاندھی جی کو خود ملنے گیا تھا۔ گاندھی فرش پر بیٹھے تھے۔ مگر انہوں نے شا کو کرسی پیش کی۔ ملاقات کے بعد شا کو ایسی کار میں واپس بھیجا گیا۔ جسے ایک باریش ہندوستانی شوفر چلا رہا تھا۔ اس نے پگڑی باندھ رکھی تھی۔ شا نے کار سے اتر کر شوفر کو نصف گنی ٹپ دی جو شوفر نے ایسی دلآویز مسکراہٹ اور شان دربائی سے قبول کی۔ جس کا مظاہرہ ڈرائیور عام طور پر نہیں کیا کرتے۔ تب شا نے بڑے فخر اور انبساط سے بتایا کہ اسے بعد میں معلوم ہوا کہ کار کا شوفر تو ہندوستان کا کوئی مہاراجہ تھا۔ پھر شا اس بات پر دیر تک ہنستا رہا۔

برطانیہ کی لیبر حکومت کا ذکر کرتے ہوئے شا نے کہا کہ مجموعی طور پر یہ اچھی جا رہی ہے اس نے وزیراعظم ایٹلی کو بے رنگ شخصیت قرار دیا۔ لیکن یہ کہا کہ وہ کمیٹیوں کی صدارت کرنے کا ماہر ہے اس نے کہا کہ وزیر خارجہ بیون توڑنے کی بیماری ہے اسے تاریخ کا ذرا سا بھی شعور نہیں حقیقت تو یہ ہے کہ کسی لیبر لیڈر کو کبھی ملک کا وزیر خارجہ نہیں بنانا چاہیئے۔ بیون بڑا خود سر اور اکھڑ ہے اکثر ایٹلی اس کی جھاڑ جھپاڑ کرتا رہتا ہے۔ شا نے مزید کہا کہ کونی ذیلاکس کو برطانیہ کا وزیر خارجہ ہونا چاہیئے تھا۔ یہ لیبر پارٹی کا ہی ایک لیڈر تھا مگر اس کا تعلق بائیں بازو کے انتہا پسندوں سے تھا اسے لیبر پارٹی سے خارج کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ اس نے چیکوسلاوکیہ پر روسی قبضے کا خیر مقدم کیا تھا۔ شا نے امریکہ کا بھی ذکر کیا اور امریکی حکومت کو حد درجہ ناپختہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ امریکہ ناپختگی کی وجہ سے بے حد خطرناک ہے۔ شا کا پختہ یقین تھا کہ اب کبھی ایٹم بم استعمال نہیں کیا جائیگا۔

شا انکم ٹیکس کے معاملہ میں برطانوی حکومت پر گرجتا برستا رہتا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ چرچل نے شا کے بارے میں کہا تھا کہ ”جارج برنارڈ شا دولت کو ہر شکل میں، ریاست کی ملکیت قرار دینے کی تبلیغ کرتے ہیں۔ لیکن جب وزیر خزانہ لارڈ جارج نے بجٹ میں دولت پر معمولی سپر ٹیکس لگایا تو شا نے پورے برطانیہ میں سب سے زیادہ شور شرابہ کیا۔ شا بیک وقت بوالہوس سرمایہ دار اور نہایت مخلص اشتراکی بھی ہے۔ وہ آخر دم تک انکم ٹیکس لگنے پر چیختا رہا“۔

نہرو کی تعریف کرتے ہوئے شا نے کہا کہ نہرو اور سٹالن سے دنیا کی امید یں وابستہ ہیں اس نے نہرو سے کہا کہ وہ ہندوستان میں روسی نظام حکومت نافذ کرے اس کے تحت تیزی سے کام کیا جا سکتا ہے۔ وہ پارلیمانی نظام کا شدید مخالف تھا اس نے بار بار حکومت کرنے پر زور دیا تو نہرو بولے۔ ”شا حکومت کیسے کرنی چاہیئے“ اس پر شا نے برجستہ کہا ”تم پسند کرو یا نہ کرو، بہرحال تمہیں حکومت کرنا ہے۔“

شا کو اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ لوگ اسے پاگل سمجھتے ہیں۔ اس نے کہا کہ وہ میری بات نہیں سنتے۔ اس نے ایک ہندوستانی کا قصہ سنایا۔ جس نے شا کو اپنی انگریزی نظموں کا مجموعہ ارسال کیا اور اس پر شا کی رائے طلب کی۔ شا نے پہلی نظم پڑھی تو سوچا کہ یہ محض شاعری تو کیا انگریزی بھی صحیح نہیں لکھ سکتا۔ مگر شا اس کا دل بھی نہیں توڑنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے ایک پوسٹ کارڈ پر لکھ بھیجا کہ ”میں نے ایسی چیز پہلے کبھی نہیں دیکھی۔“ اب شا ہنسنے لگا اور ہنستے ہوئے بتایا کہ اس احمق نے نہ صرف اپنی نظمیں چھاپ دیں۔ بلکہ ان پر میری رائے بھی طبع کر دی۔ شا کافی دیر تک ہنسی پر قابو نہ پا سکا۔ یہ شخص پروفیسر ودراسوامی آئر تھا۔ شا نے بمبئی میں اپنے قیام کا بھی ذکر کیا مگر اسے بمبئی جانے کی تاریخ یاد نہ تھی۔

آخر میں شا میری طرف متوجہ ہوا اور مجھ سے پوچھا کہ میں کون سی کتاب بطور تحفہ لینا پسند کروں گا۔ میں نے شا کی ایک پرانی کتاب کا نام لیا۔ شا نے کہا کہ یہ تو بہت پرانی کتاب ہے اور نایاب ہے۔ تاہم اگر میری لائبریری میں کوئی نسخہ ہے تو میں بھیج دوں گا وہ لائبریری میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ جب کتاب نہ ملی تو اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے یہی کتاب کیوں پسند کی ہے میں نے شا کو بتایا کہ جب میں کالج میں پڑھتا تھا تو میں نے کالج کی انجمن مباحثہ میں ایک قرارداد پیش کی کہ ہم شیکسپیئر کو بہت پڑھ چکے ہیں۔ میں نے اپنی قرارداد کی حمایت میں اس کتاب سے بہت سے دلائل دیئے۔ شا دلچسپی سے میری بات سن رہا تھا فوراً بولا ”تو پھر کیا ہوا۔“ ہونا کیا تھا۔ میں نے بتایا میری قرارداد کو مسترد کر دیا گیا۔ یہاں تک

کہ جس طالب علم نے اس قرارداد کی تائید کی تھی اس نے تائید واپس لے لی۔ اور قرارداد کے حق میں صرف میرا ووٹ آیا اس پر شا خوب ہنسا اور پھر اپنی ایک اور کتاب نکال کر اس پر دستخط کر کے مجھے دے دی۔ شا نے نہرو کو بھی ایک کتاب دی۔ یہ کتاب شا کی زندگی کے خاکوں پر مشتمل تھی۔ جو شا نے خود تحریر کئے تھے اس پر شا نے دستخط کرتے ہوئے نہرو کا نام "جواہری لال" لکھا تو میں نے ٹوکا۔ اس پر شا نے۔ اپنے ہجے درست قرار دیئے میں نے اصرار کیا تو اس نے اپنی کرسی کے قریب پڑی ہوئی ایک گھومنے والی الماری سے نہرو کی خود نوشت سوانح نکالی۔ جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو میری طرف شرارت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا: "چلو یونہی رہنے دو۔ اس طرح تلفظ خوب ہوتا ہے" چنانچہ اس نے "جواہری لال" ہی لکھا رہنے دیا۔

ہم شا کے لئے چونسا آم لے گئے تھے جب شا کو آم پیش کئے گئے تو اس نے گھنٹی بجا کر اپنے گھر کے مہتمم کو بھی بلا لیا۔ شا اور اس کا ملازم دونوں آم کی گٹھلی کھانے لگے۔ چنانچہ نہرو نے انہیں آم کاٹ کر کھانے کا طریقہ بتایا اور یہ بھی کہ گٹھلی کھانے کی چیز نہیں، بلکہ گودا کھایا جاتا ہے۔ پھر ہم شا کے دارالمطالعہ سے باہر آئے جہاں شا نے ہمارے ساتھ تصویر اتروائی۔ اور ہم واپس آ گئے۔

باب ٹ

راج گوپال اچاریہ

راج گوپال اچاری نہایت فطین شخص تھے اور ان کا ذہن ہر بات کی تہہ تک پہنچ جاتا تھا۔ وہ بال کی کھال اتارتے اور یہ دیکھنے کی کوشش کرتے کہ بال اصل میں کیا ہے۔ انہیں لوگوں کو دور رکھنے میں "خاص ملکہ" حاصل تھا۔ ان کے ملاقاتی اکثر یہ محسوس کرتے کہ وہ بڑے بے وقوف ہیں جو راجہ جی سے ملنے آئے۔ یہ خصوصیت انسان کو ہر دلعزیز نہیں بنا سکتی۔ مگر اس معاملے میں راجہ جی بڑے جی دار تھے۔ انہوں نے گاندھی جی سے "کٹی" کرنے میں بھی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ سروجنی نائیڈو نے ایک بار مجھ سے بات چیت کے دوران راجہ جی اور نہرو جی کا موازنہ کرتے ہوئے کہا "مدراس کا یہ لومڑ ایک خشک منطقی ہے جبکہ نہرو ایک شریف اور جذبات سے معمور "بدھ" ہے"۔ ایک مرتبہ اندرا نے بھی مجھے بتایا کہ اس کے دادا موتی لال نہرو کی راجہ جی کے بارے میں رائے کیا تھی۔ اندرا کے بقول دادا نے کہا "میں سیاہ چشمے میں چھپی ہوئی آنکھوں کی گہرائی نہیں ناپ سکا اور نہ راجہ جی کے ذہن کو سمجھ سکا ہوں"۔

راجہ جی اندرا کی کوئی پرواہ نہ کرتے تھے۔ انہوں نے ایک بار مجھے بتایا کہ وہ اندرا کو اس وقت سے جانتے ہیں جب وہ دو سال کی بچی تھی اور اندرا اپنی ماں کی گود میں کھیلتی رہتی تھی۔ دو سال کی عمر کے بعد اندرا نے ذہنی طور پر کوئی ترقی نہیں کی۔ اور وہ اپنے باپ کی تمام صفات سے بھی کلی طور پر محروم ہے۔ نہرو نے گاندھی جی کے ایما پر راجہ جی کو عبوری کابینہ میں شامل کیا جس نے ۲ ستمبر ۴۶ء کو کام شروع کیا تھا۔ حالانکہ اس وقت بھی راجہ جی کانگریسی لیڈروں میں خاصے غیر مقبول

تھے۔ ۱۵ اگست کو جب آزاد ہندوستان کی حکومت وجود میں آئی تو راجہ جی نہرو کے کہنے پر مغربی بنگال کے گورنر مقرر ہو گئے تاکہ وہاں ہندو مسلم فسادات کی صورت حال کو سنبھال سکیں۔

راجہ جی کے گورنر جنرل کے عہدے سے ہٹ جانے کے بعد نہرو اور پٹیل کے درمیان تعلقات بے حد کشیدہ ہو گئے۔ نہرو پٹیل سے مزید کشیدگی کے حق میں نہ تھے۔ اس موقع پر انہیں گاندھی جی بہت یاد آئے جو ان دونوں میں اکثر صلح کراتے رہتے تھے۔ بڑی سوچ بچار کے بعد انہوں نے راجہ جی کو کلکتہ سے فوراً دہلی پہنچنے کو کہا۔ وہ فوراً ہی دہلی پہنچ گئے اور نہرو سے علیحدگی میں بات چیت کی۔ معلوم ہوا کہ راجہ جی وزیر بے محکمہ کی حیثیت سے مرکزی کابینہ میں شامل ہو گئے ہیں۔ اس حیثیت میں ان کا سب سے بڑا کام نہرو اور پٹیل میں صلح صفائی کرائے رکھنا تھا۔ پٹیل کی موت کے بعد راجہ جی ان کی جگہ وزیر داخلہ مقرر ہوئے۔

نہرو کو ایک دن پیکنگ میں بھارت کے سفیر کے۔ ایم پانیکر کا ذاتی خط ملا جس میں شکایت کی گئی تھی کہ پریس ٹرسٹ آف انڈیا کا ایک نمائندہ ہانگ کانگ میں بیٹھ کر پیکنگ کی "ڈیٹ لائن" سے خبریں ارسال کرتا رہے۔ یہ خبریں چین کے خلاف افواہوں اور گپ شپ پر مشتمل ہوتی ہیں۔ جس سے چین کو شکایت پیدا ہو سکتی ہے۔ چنانچہ نہرو کی ہدایت پر میں نے پریس ٹرسٹ آف انڈیا کے چیئرمین کو بلایا اور اسے بتایا کہ نہرو اس طریق کار کو غیر اخلاقی حرکت تصور کرتے ہیں۔ اسے فوراً ختم ہونا چاہیے۔ اس نے مجھے بتایا کہ راجہ جی نے بھی اسے طلب کیا تھا۔ راجہ جی کا کہنا تھا۔ "ہانگ کانگ میں بیٹھ کر پیکنگ کی ڈیٹ لائن سے خبروں کی ترسیل خطرے سے خالی نہیں۔ کیونکہ ایک دن چینی یہ خبریں بین الاقوامی مجالس میں پیش کر کے چین میں آزادی صحافت کا ڈھنڈورا پیٹیں گے۔ یہ خبریں فی الفور بند ہونا چاہئیں"۔ یہ واقعہ دو بڑے لیڈروں کے اندازِ فکر میں فرق کو واضح کرتا ہے۔ ایک کا انداز فکر شریفانہ ہے مگر دوسرے سے مکاری عیاں ہے۔

راجہ جی ۱۹۵۲ء تک کابینہ میں رہے۔ اس کے بعد عام انتخابات کے نتیجہ میں جو کابینہ

بنی راجہ جی اس میں شامل نہ کئے گئے تو وہ نہرو کے مخالف بن بیٹھے۔ ان کے دہلی چھوڑنے سے قبل میں نے ان سے ملاقات کی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ اخلاقیات اور چھوٹی چھوٹی باتوں کے بارے میں لکھیں گے۔ مثلاً سائیکل سواروں کو سڑک پر سائیکل کیسے چلانی چاہئے۔ سڑکوں پر اور پارکوں میں تھوکنا نہیں چاہیئے وغیرہ۔ اس پر میں ہنس دیا۔ راجہ جی نے مجھ سے پوچھا "کیا تم میرے منصوبے سے خوش ہو؟" میں نے کہا ہاں میرا خیال ہے کہ تمام سیاست دان گلہری کی طرح چالاک ہیں اور آپ اس سے مستثنیٰ نہیں۔ پھر میں نے انہیں ملیالم زبان کی ایک کہاوت سنائی کہ گلہری خواہ کتنی بوڑھی ہو جائے درختوں پر اترنا چڑھنا ترک نہیں کرتی۔ اس پر راجہ جی خوب ہنسے۔

نہرو سے علیحدگی کے بعد راجہ جی نہرو کی پالیسیوں کے مخالف ہو گئے۔ آخر کار انہوں نے سوتنتر اپارٹی کی بنیاد رکھی۔ اور بڑی سرگرمی سے نہرو کی پالیسیوں کو ہدفِ تنقید بنایا۔ وہ واقعی گلہری ثابت ہوئے۔ جب چین نے بھارت پر حملہ کیا تو راجہ جی نے کہا۔ "نہرو نے ہی اپنا بستر بچھایا تھا اب وہ خود ہی اس پر لیٹے گا"۔ اس کے فوراً بعد راجہ جی دہلی آئے اور نہرو سے علیحدگی میں گفتگو کے دوران کابینہ میں شامل ہو کر نہرو کی مدد کرنے کی پیش کش کی جو حیران کن بات تھی۔ مگر نہرو نے یہ کہہ کر موضوع بدل دیا کہ "آپ تو کابینہ سے باہر رہ کر بھی میری مدد کرتے رہے ہیں"۔ راجہ جی نہرو کا مطلب سمجھ گئے اور یہ ملاقات ختم ہو گئی۔

باب ۱۱

بھارت کے صدر کی آئینی حیثیت

مارچ ۷۷ء میں بھارت میں لوک سبھا کے انتخابات ہوئے اندرا گاندھی کی کانگریس نو صوبوں میں شکست فاش سے دوچار ہوئی۔ مگر بھارت کے قائم مقام صدر پی ڈی۔ جٹی نے ڈیسائی کابینہ کی ہدایت پر ان صوبوں کی اسمبلیاں کالعدم قرار دیتے ہوئے حکم جاری کرنے میں پس وپیش کی حالانکہ اس سلسلے میں ہی چار صوبائی حکومتوں کی رٹ درخواست سپریم کورٹ مسترد کر چکی تھی۔ اس پر جے پرکاش نرائن نے صدر جٹی کی گو مگو پر نکتہ چینی کرتے ہوئے ایک بیان جاری کیا۔ اس بیان میں جے پرکاش نرائن نے بتایا کہ صاحب صدر راجندر پرشاد نے صدر کے اختیارات کے بارے میں بعض سوالات اٹھائے تھے تو نہرو نے ان سوالات کو ایم سی سیتل وادا اٹارنی جنرل اور سرالادی کرشنا سوامی آئر جیسے ممتاز قانون دانوں کو بھیج دیا تھا۔ ان دونوں نے رائے دی تھی کہ صدر کابینہ کے مشورے پر عمل کا پابند ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہرو نے ایسا کوئی اقدام نہیں کیا تھا۔ اصل واقعات یہ ہیں۔

دستور سازی کے وقت بابو راجندر پرشاد نے دستور ساز اسمبلی کے اجلاس کی صدارت کی اور معزز ایوان کے ارکان کے طرز فکر کا اسے پوری طرح علم تھا۔ مگر خدا جانے کیوں جب راجندر پرشاد صدر کے عہدے پر فائز ہو کر راشٹرپتی بھون پہنچا تو اسے صدر کے فرائض اور اختیارات کے بارے میں غلط فہمی ہو گئی۔ حالانکہ نہرو اور امبیدکر کی دستور ساز اسمبلی میں یہ بات واضح کر چکے تھے کہ آئین کی رو سے صدر کابینہ کے مشورے کا پابند محض ایک آئینی سربراہ

ہے۔ راجندر پرشاد نے سپریم کورٹ کے تمام ججوں کو باری باری طلب کیا اور اس معاملے میں ان کی رائے پوچھی تمام ججوں نے صدر کو اپنے ردِ عمل سے آگاہ کیا مگر کوئی رائے تحریری طور پر دینے سے انکار کر دیا۔ بلکہ یہ کہا کہ اگر صدر تحریری طور سپریم کورٹ کی رائے طلب کرے تو وہ سوچ سمجھ کر رائے کا اظہار کریں گے۔ مگر راجندر پرشاد ایسا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ سپریم کورٹ کو کوئی ریفرنس کابینہ کی منظوری کے بعد ہی بھیجا جا سکتا تھا۔ صدر کا ملٹری سیکرٹری میجر جنرل بی چیٹرجی جو فوجی سے زیادہ سیاسی ذہن کا شخص تھا مجھے صورت حال سے آگاہ رکھے ہوئے تھا۔ پھر راجندر پرشاد نے اٹانی جنرل کو طلب کیا اور اس کی رائے طلب کی تو اٹارنی جنرل نے صدر کو ایک نوٹ لکھ دیا۔ میجر جنرل چیٹرجی نے خفیہ طور پر اس نوٹ کی ایک نقل مجھے فراہم کر دی۔ اٹارنی جنرل نے اپنے نوٹ میں بڑی وضاحت سے لکھا تھا کہ وزیر اعظم اور اس کی کابینہ سے الگ صدر کا کوئی آئینی وجود نہیں ہے۔ سادہ الفاظ میں اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اٹارنی جنرل نے راجندر بابو کو بتا دیا تھا کہ آئین میں جہاں کہیں بھی صدر کا لفظ آیا ہے اس سے مراد صرف وزیر اعظم ہے۔

میں نے اٹارنی جنرل کے نوٹ کی نقل نہرو کو پیش کی اور انہیں مختصراً راشٹرپتی بھون میں رونما ہونے والے حالات سے بھی آگاہ کیا۔ نہرو نے اٹارنی جنرل کی رائے کا بغور مطالعہ کیا اور مسکراتے ہوئے نوٹ مجھے لوٹا دیا۔ وہ اس پر ناراض کم اور محظوظ زیادہ ہوئے۔ نہرو کو اپنی آئینی پوزیشن اور ملک میں اپنے وقار پر اس قدر اعتماد تھا کہ انہوں نے راجندر پرشاد کی بے راہروی کو نظر انداز کرنا ہی مناسب سمجھا۔ ان واقعات کی روشنی میں جٹی کا اقدام درست تھا۔ اس نے کابینہ سے یہی کہا تھا کہ وہ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرے۔

باب ۱۲

راجندر پرشاد اور رادھا کرشنن

۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو جب عبوری حکومت قائم ہوئی تو نہرو نے راجندر پرشاد کو بھی کابینہ میں لے لیا اور اسے خوراک و زراعت کا محکمہ دیا مگر بابو راجندر پرشاد خوراک و زراعت کی ترقی سے زیادہ گئو آشرم کی ترقی میں دل چسپی رکھتے تھے بعد میں گاندھی اور سردار پٹیل کے مشورے سے نہرو نے صدر کانگریس کی حیثیت سے راجندر پرشاد کو دستور ساز اسمبلی کا صدر مقرر کرنے کا فیصلہ کیا جس کا اجلاس ۹ دسمبر ۱۹۴۷ء کو ہونے والا تھا۔ نہرو نے راجندر پرشاد کو جسے وہ پیار سے راجندر بابو کہا کرتے تھے، دستور ساز اسمبلی کا صدر منتخب کرانے سے کافی دیر پہلے بتا دیا کہ وہ وزارت سے مستعفی ہو جائیں کیونکہ نہرو نہیں چاہتے تھے کہ دستور ساز اسمبلی جیسے خود مختار ادارے کا چیئرمین ان کا کوئی ماتحت ہو۔ مگر راجندر پرشاد کا اصرار تھا کہ وہ وزارت سے الگ نہیں ہوں گے۔ جب بات نہ بنی تو گاندھی جی نے مداخلت کی اور راجندر پرشاد کو بلا کر ان کی ایک سیکرٹری راج کماری امرت کور کے سامنے اسے خوب ڈانٹا۔ گاندھی جی نے کہا "راجندر میرا خیال تھا تم نے مجھ سے ضرور کچھ سیکھا ہوگا۔ مگر یہ میری بھول تھی۔ تمہیں دو عہدوں پر قبضہ کرنے کا کوئی حق نہیں۔ تمہیں دونوں سے استعفادے کو میرے ساتھ آجانا چاہیئے۔" اس کے فوراً بعد راجندر پرشاد وزارت سے الگ ہو گئے۔

ابھی بھارت جمہوریہ قرار نہیں پایا تھا اور راج گوپال اچاری گورنر جنرل کے عہدے پر براجمان تھے۔ یہ وہی تخت تھا جس پر وارن ہیسٹنگز، این۔ لارڈ کرزن اور بہت سے

دوسرے لوگ براجمان رہ چکے تھے۔ راجہ جی کی زندگی سادہ مگر باوقار تھی۔ غیر ملکی خصوصاً سفارتی نمائندے ان سے بڑے متاثر ہوتے تھے۔ نہرو چاہتے تھے کہ راجہ جی جمہوریہ بھارت کے پہلے صدر بنیں۔ دراصل نہرو یہ روایت قائم کرنا چاہتے تھے کہ ملک کا وزیر اعظم اگر شمالی بھارت کا ہو تو صدر جنوب سے ہونا چاہیئے یا اس کے برعکس جو بھی صورت حال ہو۔ نہرو نے اضطراری طور پر راجہ جی کو صدارت کی پیش کش کی تھی۔ نہرو راجندر پرشاد کو صدر بنانا نہیں چاہتے تھے۔ کیونکہ راجندر بابو بڑے قدامت پسند اور روایات پرست اور بڑی حد تک رجعت پسند تھے۔ انہوں نے راجندر پرشاد کو مرکزی کابینہ میں وزارت کے ساتھ ساتھ منصوبہ بندی کمیشن کے چیئرمین کی کرسی بھی پیش کی۔ راجندر پرشاد اس پیش کش پر راضی نہ تھے جلد ہی نہرو کو معلوم ہوا کہ ارکان پارلیمنٹ کی اکثریت راجہ جی سے ناخوش ہے۔ سردار پٹیل بظاہر غیر جانب دار تھے مگر ان کی پسند کا سب کو علم تھا۔ وہ راجہ جی کے حق میں نہ تھے۔ تاہم اگر نہرو ڈٹ جاتے تو راجہ جی ضرور صدر منتخب ہو جاتے۔ مگر نہرو اہم معاملات کو انتہا تک لے جانے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ وہ ڈھیلے پڑ گئے اور راجہ جی منتخب نہ ہو سکے۔ جس پر راجہ جی نہرو سے ناراض بھی ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کی سبکی ہوئی ہے۔

راجندر پرشاد نے ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو بھارت کے پہلے صدر کا عہدہ سنبھالا۔ مگر کس قدر افسوس کی بات ہے کہ صدر بنتے ہی اس نے سب سے پہلا جو کام کیا وہ یہ تھا کہ راشٹرپتی بھون (ایوان صدر) سے تمام مسلمان ملازموں کو نکال باہر کیا۔ نہرو کو اس حرکت پر بہت غصہ آیا۔ انہوں نے مجھے حکم دیا کہ ان تمام مسلمان ملازموں کو جنہیں راشٹرپتی بھون سے نکالا گیا ہے سرکاری مہمانداری کی تنظیم میں تبدیل کرا دوں۔ چنانچہ ان مسلمان "مہاجروں" کو وزیر اعظم کی سرکاری رہائش گاہ پر تعینات کر دیا گیا۔ گو اس سے سیکولرٹی کے ہندو حکام ناخوش تھے۔ ایک اور چیز جس پر نہرو بہت ناراض ہوئے وہ یہ تھی کہ صدر کا عہدہ سنبھالتے ہی راجندر پرشاد سادھوؤں کے پاؤں دھونے کے لئے کاشی کی یاترا پر گیا اور اس کے بعد سادھوؤں کے پاؤں چھونا تو

گویا ایک مقدس رسم بن گئی۔ نہرو کو اگر کسی چیز سے نفرت تھی تو وہ دوسروں کے پاؤں چھونا تھا۔
ایک اور بات جس پر نہرو ناخوش ہوئے یہ تھی کہ راجندر پرشاد سومنات گئے اور مندر میں عین اس جگہ شولنگ کا بت نصب کیا جہاں کبھی وہ بت ہوتا تھا جسے مسلم فاتح (محمود غزنوی) نے توڑا تھا وزیر خوراک کے ایم منشی نے سردار پٹیل کی ملی بھگت سے چینی کی قیمت میں اضافہ کر دیا تھا اور کارخانہ داروں سے یہ طے کیا کہ جتنی قیمت بڑھے گی اس کا نصف وہ سومنات کے مندر کی تعمیر کے لئے دیں گے۔ مگر نہرو کو اس اقدام کا علم کافی دیر بعد ہوا۔ جب اس کا کوئی علاج ممکن نہ تھا۔

آئین کی عبوری دفعات کے تحت صدر بھارت کو وہ تمام مالی مراعات ورثے میں ملی تھیں جو انگریز وائسرائے کو حاصل تھیں۔ ان میں مہمانداری الاؤنس کی خطیر رقم بھی شامل تھی۔ راجندر پرشاد کو جب صدارت سنبھالے پانچ سال گذر گئے تو صدر کے ملٹری سیکرٹری نے مجھے ایک ذاتی نوٹ ارسال کیا جس میں بتایا گیا تھا کہ راجندر پرشاد نے مہمانداری پر ۲۲۵/ روپے ماہانہ سے زائد رقم صرف نہیں کی البتہ اس نے باقی تمام رقم اپنے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کے نام بچت کی سکیموں میں لگا دی ہے۔ میں نے یہ نوٹ وزیر اعظم کو دکھا دیا۔ جگ جیون رام نے راجندر پرشاد تک یہ بات پہنچا دی اور وہ مجھ سے ناراض ہو گیا۔ جب ٹی۔ ٹی کرشنما چاری نے بجٹ میں دولت ٹیکس، اخراجات پر ٹیکس اور تحائف پر ٹیکس عائد کیا تو راجندر پرشاد نے بڑا شور مچایا اور نہرو سے شکایت کی کہ اس بجٹ سے ان کی ذات متاثر ہوئی ہے۔ نہرو نے راجندر پرشاد کو خط لکھ کر پوچھا کہ اس نے مہمانداری الاؤنس کی جو رقم صرف نہیں کی کیا وہ حکومت کو واپس کر دی گئی ہے؟ اس پر راجندر پرشاد خاموش ہو گیا مگر اس کے بعد اس کے پوتوں وغیرہ کی بچت میں اضافہ نہ ہو سکا۔

۱۹۵۷ء کے اوائل میں نہرو نے نائب صدر رادھا کرشنن کو صدارت کی پیش کش کی۔ نہرو کا خیال تھا کہ سات سال کرسیٔ صدارت کے مزے لوٹنے کے بعد عمر کے آخری حصہ میں اب راجندر پرشاد ریٹائر ہو کر آرام کرنا پسند کرے گا۔ مگر راجندر پرشاد تو مزید پانچ سال کے لئے صدارت کا امیدوار تھا۔ نہرو نے دیکھا کہ پنت اور متعدد دوسرے صوبائی لیڈر جن میں کامراج بھی شامل تھا راجندر بابو کو دوبارہ صدر منتخب کرانے کے حق میں ہیں۔ اس بار بھی نہرو خاموش رہے اور راجندر پرشاد دوسری بار صدر منتخب ہو گئے۔ اس پر رادھا کرشنن کو بڑا رنج ہوا اور وہ تلخ سے ہو گئے۔ اس پر نہرو نے حفظِ مراتب کی فہرست میں تبدیلی کر کے نائب صدر کو ملک کا دوسرا معزز ترین شہری قرار دے دیا۔ قبل ازیں اس کا نمبر تیسرا تھا۔ نہرو نے نائب صدر کو ملک کے اندر سفر کے لئے فضائیہ کے طیارے استعمال کرنے کا بھی اختیار دے دیا۔ اور پھر رادھا کرشنن خوش ہو گیا نہرو نے یونیسکو میں بھارتی وفد کی قیادت رادھا کرشنن کے سپرد کی اور اسے اس ادارے کی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لینے پر اکسایا۔ نہرو نے نائب صدر کو بیرونی ملکوں کے دوروں پر بھیجنے کے انتظامات بھی کئے۔ نہرو نے ایک مرتبہ راجندر پرشاد سے کہا کہ وہ رادھا کرشنن کو صدر کے بعض رسمی فرائض انجام دینے کی اجازت دیدے۔ راجندر پرشاد نے نہرو کو جواب دیا کہ وہ تو ایسا کرنے کو تیار ہے مگر ملک کا آئین یہ راستہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

پارلیمنٹ میں جب ہندوؤں کے عائلی قوانین کا بل پیش ہوا تو راجندر پرشاد نے پارلیمنٹ کے ارکان کو جتا دیا کہ وہ اس بل کے مخالف ہیں۔ اس موقع پر راجندر پرشاد نے نہرو سے بات بھی کی اور کہا کہ ملک کے آئین کے مطابق صدر پارلیمنٹ کا جزو ہے اس لئے وہ جب بھی چاہے صدر کی گیلری میں بیٹھ کر پارلیمنٹ کی کارروائی سن سکتا ہے۔ اس پر نہرو نے راجندر پرشاد کو سخت جواب دیا۔ نہرو نے کہا کہ آئین کی منشا یہ ہے کہ صدر سال میں ایک مرتبہ دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کریں اور ایوان میں صدر کی جو گیلری ہے وہ محض ایک اعزاز ہے جس کا مقصد غیر ملکی معزز مہمانوں اور صدر کے مہمانوں کو پارلیمنٹ کی کارروائی دکھانا ہے۔ تاہم نہرو نے وعدہ کیا کہ وہ ایسا انتظام کر دیں گے کہ صدر اپنے مطالعہ کے کمرے میں بیٹھ کر دونوں ایوانوں کی کارروائی سن سکیں بعد میں ایسا ہی انتظام پارلیمنٹ ہاؤس میں نہرو کے اور میرے دفتر میں بھی کر دیا گیا۔

ملک کے پہلے صدر اور پہلے وزیر اعظم کے درمیان تعلقات رسمی سے تھے۔ وزیر اعظم ملک اور حکومت کے حالات سے باخبر رکھنے کے لئے صدر سے ہفتہ وار ملاقات کرتے۔ یہ ایک آئینی ذمہ داری تھی۔ دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے کوئی گرمجوشی نہ تھی۔ دونوں کے نقطہ نظر میں بڑا فرق تھا۔ راجندر پرشاد نہرو کی شخصیت سے مرعوب تھے مگر نہرو سرعام ہمیشہ اس کی عزت کرتا تھا اور صدر سے ادب سے پیش آتا تھا۔

جب رادھاکرشنن صدر بنا تو نہرو سے اس کے تعلقات نہایت پُرتپاک تھے۔ نہرو رادھاکرشنن کے سادہ اور بے تکلف طرز عمل سے خاصے متاثر تھے۔ نہرو نے ایک بار مجھے بتایا کہ جب رادھاکرشنن روس میں بھارت کا سفیر تھا۔ تو مارشل سٹالن سے اولین ملاقات میں ہی اس نے بڑی بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سٹالن کی پیٹھ پر تھپکی دی اور پوچھا سنایئے کیا حال چال ہے۔ ملکہ الزبتھ سے بھی رادھاکرشنن نے کچھ ایسے انداز میں ملاقات فرمائی تھی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آتش بیان مقرر، ادیب اور فلاسفر رادھاکرشنن بھارت کا بہترین صدر ثابت ہوا۔ اور وہ بھارت کی قدیم روایات اور کلچر کا بہترین سفیر تھا۔ بھارت کا بدترین صدر فخرالدین علی احمد تھا جس نے ۱۹۷۵ء میں کابینہ کی منظوری کے بغیر بھارت میں اندرونی ہنگامی حالت کا اعلان کر دیا۔ اور اس طرح خود کو صدارت سے برطرفی کا "اہل" قرار دے لیا۔ مگر یہ کہنا ہی پڑے گا کہ فخرالدین یہ جانتا تھا کہ اس کے مرنے کا بہتر موقع کونسا ہے۔

باب ۱۳

وزیر اعظم کا سیکرٹریٹ

بھارت میں وزیر اعظم کا سیکرٹریٹ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو عبوری بنیادوں پر قائم کیا گیا تھا۔ ایک سینئر آئی سی۔ ایس ایچ وی آر آئنگر وزیر اعظم کے پرنسپل پرائیویٹ سیکرٹری مقرر ہوئے جو سیکرٹریٹ کے سربراہ تھے۔ وہ مختصر سے وقت کے لئے اس عہدے پر فائز رہے۔ وہ چھا جانے والی شخصیت کے حامل تھے اور اُن کی اہلیت میں کوئی کلام نہ تھا لیکن پتہ نہیں کیا ہوا سردار پٹیل آئنگر سے ناراض ہو گئے۔ چیٹی اور جان میتھائی بھی اس کے مخالف تھے۔ ان تینوں نے آئنگر کی کابینہ کے اجلاس میں شمولیت پر اعتراض کیا۔ بالآخر پٹیل نے ناپسندیدہ افراد کو "لات مار کر دھکیلنے" کی تکنیک استعمال کی اور نہرو سے کہا کہ وہ آئنگر کو ہوم سیکرٹری متعین کرنا چاہتے ہیں۔ نہرو نے حامی بھر لی۔ آئنگر کی جگہ اے وی پائی کو نہرو کا پرنسپل پرائیویٹ سیکرٹری مقرر کر دیا گیا جو نہایت شریف النفس اور قابل افسر تھے۔ آئنگر کے بعد پائی ہی نہرو کو بہترین سیکرٹری ملا تھا۔

۱۹۴۸ء میں ہم لندن گئے۔ نہرو نے وزیر اعظم اٹیلی سے درخواست کی کہ وہ مجھے برطانوی آئین میں وزیر اعظم کی پوزیشن اور وزیر اعظم کے سیکرٹریٹ کے مطالعہ لئے سہولتیں فراہم کریں۔ لارڈ اٹیلی نے کابینہ کے سیکرٹری اور وزارت خزانہ کے سیکرٹری کو مجھے تمام سہولتیں فراہم کرنے کے لئے کہا۔ میں ان دونوں اصحاب سے ملا اور ان سے نہایت مفید معلومات حاصل کیں برطانیہ کے وزیر اعظم کے اختیارات روائتی ہیں۔ وہ دفاع اور امور خارجہ کا حقیقی ذمہ دار ہے اور وزیر خارجہ

یا وزیر دفاع کے تقرر سے اس کی پوزیشن متاثر نہیں ہوتی۔ چونکہ وزیر اعظم کے پاس رسمی طور پر کوئی وزارت نہیں ہوتی اس لئے اس کا سیکرٹریٹ بھی کوئی لمبا چوڑا نہیں ہے بس مختصر سے عملہ سے کام چلایا جاتا ہے۔

وزیر اعظم نہرو کا سیکرٹریٹ بھی بتدریج برطانوی وزیر اعظم کے سیکرٹریٹ کی طرز پر منظم کیا گیا اور پرنسپل پرائیویٹ سیکرٹری کا عہدہ جوائنٹ سیکرٹری کر دیا گیا تاہم اس سے کارکردگی متاثر نہیں ہوئی۔ جب لال بہادر شاستری وزیر اعظم مقرر ہوئے تو وہ کے ایل جھا کو پرنسپل پرائیویٹ سیکرٹری مقرر کرنا چاہتے تھے۔ جھا کی خواہش تھی کہ وزیر اعظم کے سیکریٹ کو دوسری وزارتوں کی طرح باقاعدہ محکمہ کا درجہ دیا جائے اور انہیں وزیر اعظم کا سیکرٹری مقرر کیا جائے جس کا عہدہ کیبنٹ سیکرٹری کے مساوی ہو۔ لال بہادر شاستری نے جھا کے یہ مطالبات غور کئے بغیر تسلیم کر لئے چنانچہ جھا توسیع پسندی کے پروگرام پر عمل پیرا ہوئے۔ ایک سیکرٹری کی عام طور پر اس وقت تک تسکین نہیں ہوتی۔ جب تک اس کے ماتحت جوائنٹ سیکرٹری نہ ہوں۔ اور جوائنٹ سیکرٹری کا ڈپٹی سیکرٹری نہ ہو تو وہ بھی واویلا کرے گا۔ اور اسی طرح یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا جائے گا۔ شاستری کے بعد اندرا وزیر اعظم بنی تو اس نے اس طریق کار کی تکمیل کر دی۔ ۵۹-۱۹۵۸ء میں وزیر اعظم کا سیکرٹریٹ چپراسیوں سمیت ۱۲۹ افراد پر مشتمل تھا اور اس کا بجٹ چھ لاکھ پچہتر ہزار روپے تھا۔ ۷۷-۱۹۷۶ء میں عملہ کی تعداد ۲۴۲ ہو گئی اور اخراجات بڑھ کر تیس لاکھ سات ہزار روپے ہو گئے۔ ۱۹۵۰ء میں میرا خیال تھا کہ وزیر اعظم کے لئے برطانیہ کی طرز پر ایک افسر تعلقات عامہ مقرر کر دیا جائے مگر کابینہ کے سیکرٹری اور وزارت خارجہ کے سیکرٹری جنرل میری تجویز کے مخالف تھے۔ وہ مجھ سے ملے اور کہنے لگے کہ کسی خفیہ کاغذات تک کسی صحافی کی رسائی خطرناک ثابت ہوگی۔ میں نے ان کے خیال سے تو اتفاق نہ کیا مگر اپنی تجویز ترک کر دی۔ مجھے یقین تھا کہ نہرو افسر تعلقات عامہ کی خدمات سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نہرو خود ہی اپنے رابطہ افسر تھے اور انہیں اپنی شخصیت کو ابھارنے کے لئے کسی کی مدد کی ضرورت نہ تھی۔

ایک بار میں نے نہرو سے کہا کہ پریس کانفرنس امریکنوں کی ایجاد ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ صدر کو اظہارِ خیال کے لئے کوئی پلیٹ فارم میسر ہو۔ پارلیمانی طرز حکومت میں پارلیمنٹ کی شکل میں وزیر اعظم کو فورم میسر ہے اور وہ جو چاہے پارلیمنٹ میں کہہ سکتا ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ چرچل اور اٹیلی پریس کانفرنسیں نہیں کیا کرتے تھے۔ میں نے نہرو کو تجویز پیش کی کہ وہ بھی پریس کانفرنسوں کا طریقہ ترک کرنے پر غور کریں۔ اگرچہ انہوں نے میری تجویز پر صاد کیا مگر ان کی انا میری تجویز کی راہ میں حائل ہو گئی۔ وہ نمود و نمائش کو پسند کرتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے بعض بیانات اور پریس کانفرنسوں میں بلا سوچے سمجھے کئے گئے اعلانات سے فائدے کے بجائے الٹا نقصان ہوا تھا۔

باب ۱۴

ایوان وزیر اعظم

جواہر لال نہرو جب ۲ ستمبر ۴۶ء کو عبوری حکومت میں شامل ہوئے تو انہیں ۷، یارک روڈ پر چار بیڈ روم پر مشتمل بنگلہ الاٹ کیا گیا۔ وہ اس میں بہت خوش تھے۔ تقسیم سے قبل اور اس کے بعد صورت حال ہنگامی نوعیت کی تھی اور نہرو کی زندگی کو واقعی خطرہ لاحق تھا۔ سردار پٹیل کو نہرو کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ وہ نہرو کے تحفظ کے لئے پولیس اور سیکورٹی گارڈ میں اضافہ کرنا چاہتے تھے خواہ نہرو اس پر ناراض ہی کیوں نہ ہوں۔ پٹیل نے مجھ سے بھی بات کی تاکہ میں نہرو کو اس مقصد کے لئے ہموار کروں۔ جلد ہی ۷، ۱۔ یارک روڈ کی گراؤنڈ میں ہر طرف پولیس نے چھاؤنی ڈال لی۔ جب نہرو وزیر اعظم بن گئے تو حفاظتی انتظامات میں مزید اضافہ کر دیا گیا۔ اب کوٹھی کے باہر سڑک پر بھی پولیس والوں نے خیمے گاڑ دیئے۔ اور یہ علاقہ بھدا سا پولیس کیمپ معلوم ہونے لگا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ نہرو کو اب کسی اور جگہ منتقل ہونا چاہیئے۔ پٹیل کے ایما پر میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملا اور اس سے بھی اس معاملہ میں بات کی۔ اس نے کہا کہ نہرو کو کمانڈر انچیف والی کوٹھی میں منتقل کر دیا جائے جہاں حفاظتی انتظامات اتنے نمایاں نہیں ہوں گے۔ میں نے ماؤنٹ بیٹن سے کہا کہ وہ اس سلسلے میں نہرو سے کوئی بات نہ کرے میں خود ہی یہ معاملہ نمٹاؤں گا۔ ایسے معاملات میں بہترین طریقہ یہ ہے کہ ایسی صورت حال پیدا کر دی جائے جس سے نہرو کو مفر نہ ہو۔ ماؤنٹ بیٹن مجھ سے متفق ہو گئے۔

میں نے پٹیل کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا اور اس سے نہرو سے بات کرنے کو کہا۔ پٹیل نہرو کے ساتھ والی کوٹھی میں رہتا تھا۔ اگلی صبح وہ وزیر اعظم کے پاس آیا اور ان سے بات کی۔ پٹیل نے نہرو سے کہا۔ "میں گاندھی جی کی زندگی کا تحفظ نہیں کر سکا۔ یہ بات میرے لئے سوہانِ روح بنی ہوئی ہے۔ آپ گھر تبدیل کر لیں۔ ورنہ میں آپ کی زندگی کے تحفظ کا ذمہ نہیں لے سکتا۔ پٹیل کی اس بات میں مستعفی ہونے کی دھمکی ملفوف تھی۔ چنانچہ نہرو بادل نخواستہ رضامند ہو گئے۔ پٹیل نے واپس اپنے گھر جاتے ہوئے مجھے بھی اشارہ کیا۔ میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ پٹیل نے مجھے بتایا کہ نہرو خاموش رہے مگر ان کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں نئے مکان میں منتقل ہونا پسند نہیں مگر ہمیں ان کی خاموشی کو رضامندی تصور کرتے ہوئے کام کر ڈالنا چاہیئے۔ تم جا کر ماؤنٹ بیٹن سے تفصیلات طے کر لو۔

ماؤنٹ بیٹن نے میرے مشورے پر کابینہ کے لئے ایک نوٹ تیار کیا جس میں سفارش کی گئی تھی کہ کمانڈر انچیف ہاؤس کا نام ایوانِ وزیر اعظم رکھ دیا جائے اور گورنمنٹ ہاؤس کی طرح وزیر اعظم ہاؤس میں بھی سرکاری تنظیم مہمانداری قائم کر دی جائے۔ یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ اندرا تو امور خانہ داری سے قطعی نابلد تھی۔ اسے تو انڈا ابالنا تک نہیں آتا تھا۔ پھر اسے اپنی کمزوری کا احساس بھی نہ تھا۔ طے یہ پایا کہ وزیر اعظم اپنی ذات، اپنے خاندان اور ذاتی مہمانوں پر اٹھنے والے اخراجات اصل خرچ کے مطابق ادا کریں گے۔ میری درخواست پر ماؤنٹ بیٹن نے ایک غیر معمولی اقدام یہ کیا کہ یہ نوٹ نہرو کی وساطت سے بھیجنے کے بجائے سیدھا کیبنٹ سیکرٹری کو اس ہدایت کے ساتھ ارسال کیا کہ اسے وزیر اعظم سمیت تمام وزرا کو بھیج دیا جائے۔ اس پر وزیر اعظم کی رسمی منظوری کے بغیر کابینہ کے آئندہ اجلاس میں غور ہونا تھا۔ جب نہرو کو یہ نوٹ ملا تو انہوں نے مجھ سے دریافت کیا۔ "کیا تم میرے علم میں لائے بغیر اس معاملہ میں شریک ہو گئے تھے؟"

میں نے جواب دیا "جی ہاں۔ ۹۵ فیصد" وہ مسکرا دیئے۔ ۷ رجون ۱۹۴۸ء کو کابینہ کے اجلاس میں اس نوٹ پر غور ہوا۔ نہرو خاموشی اختیار کئے رہے اور اجلاس کی کارروائی پٹیل کی رہنمائی میں جاری رہی۔ کابینہ نے گورنر جنرل کی سفارش منظور کرلی نئے وسیع و عریض گھر میں منتقل ہونے پر نہرو خوش نہیں تھے۔ انہوں نے یہاں آکر وہ پانچ سو روپے ماہانہ مہمانداری الاؤنس قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جسکے وہ کابینہ کے دیگر ارکان کی طرح حقدار تھے۔

کابینہ کے بعض ممتاز ارکان خصوصاً گوپال سوامی آئن گر نے تجویز پیش کی کہ برطانیہ کی طرح وزیر اعظم کی تنخواہ کابینہ کے ارکان کی تنخواہ سے دوگنا ہونی چاہیئے۔ مگر نہرو نے اس تجویز پر غور کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے یہ تجویز بھی رد کر دی کہ پارلیمنٹ سے وزیر اعظم کی ریٹائرمنٹ پر بھاری پنشن اور دوسری سہولتوں کا قانون منظور کرایا جائے۔ میرا خیال ہے کہ اس معاملے میں نہرو کی نظر محض اپنی ذات پر تھی۔ انہیں یقین تھا کہ ریٹائرمنٹ کی صورت میں وہ قلم چلا کر اپنی زندگی آسائش سے گزار سکتے ہیں میں نے نہرو سے یہاں تک کہا کہ ایسا قانون منظور کرانا ضروری ہے۔ وہ صرف اپنے بارے میں نہ سوچیں اگر کل کلاں کوئی غریب آدمی وزیر اعظم بن گیا تو ریٹائرمنٹ کے بعد وہ کیا کرے گا۔ مگر نہرو اپنی بات پر اڑے رہے۔ جہاں تک ان کے ذاتی اخراجات کا تعلق ہے وہ تو نہ ہونے کے برابر تھے۔ بھارت میں اب وزراء کی تنخواہ تین ہزار روپے ماہانہ ہے اور وہ پانچ سو روپے ماہانہ مہمانداری الاؤنس بھی وصول کرتے ہیں۔ نہرو کے زمانے میں وزرا نے رضا کارانہ طور پر اپنی تنخواہوں میں کمی کر دی تھی۔ پہلے وہ دو ہزار دو سو پچاس روپے ماہانہ وصول کرتے تھے جو بعد میں مزید کم کر کے صرف دو ہزار روپے کر دیئے گئے۔ اب جبکہ روپے کی قیمت کم ہو گئی ہے وزرا کی تنخواہ میں اضافہ کیا جانا چاہیئے۔ خود گاندھی جی اس حق میں تھے کہ وزرا اور سرکاری

ملازموں کی تنخواہ اتنی ہونی چاہیئے کہ انہیں مزید ضرورت محسوس نہ ہو۔ اس طرح وہ بدعنوانی کی ترغیب کا شکار نہیں ہوں گے اور لوگوں کو بھی اس پر اعتراض نہ ہوگا۔

ٹاگ الینڈر بیس سال تک تین کمروں کے فلیٹ میں مقیم رہا۔ وہ سویڈن جیسے مالدار ملک کا وزیر اعظم تھا۔ اس کی بیوی استانی تھی۔ میری ان دونوں سے جان پہچان تھی۔ سویڈن کی حکومت نے وزیر اعظم کو کار تک فراہم نہیں کی تھی۔ دونوں میاں بیوی کے پاس ایک چھوٹی سی کار تھی۔ جسے وہ خود ہی چلاتے تھے۔ ان میں شوفر رکھنے کی بھی سکت نہ تھی۔ جوزف آسٹریلیا کا وزیر اعظم تھا جو کوئی غریب ملک نہیں مگر وہ اپنے دفتر کے قریب ہی ایک دوسرے درجے کے ہوٹل میں مقیم تھا۔ وہ ہوٹل سے پیدل ہی دفتر آتا جاتا تھا کیونکہ اسے سرکاری کار فراہم نہیں کی گئی تھی۔ لندن میں اس سے میری کئی بار ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ایک منکسر المزاج شخص تھا۔ اس کی بیوی اس کے ساتھ مقیم نہیں تھی۔ وہ اپنے فارم پر رہتی تھی۔ کیونکہ وہ کینبرا (آسٹریلیا کا دارالحکومت) کی سوشل زندگی کی چکاچوند میں مبتلا نہیں ہونا چاہتی تھی۔ بھارت کے موجودہ وزیر ہاؤسنگ ایوان وزیر اعظم کے بارے میں منہ پھاڑ کر باتیں کر رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ سکندر بخت اور اس طرح کے دوسرے لوگ مشرقی شان و شوکت کے دقیانوسی تصورات کے اسیر ہیں۔

باب ۱۵

وزیراعظم اور فضائیہ کے طیارے

۱۹۵۱ء کے وسط میں ڈائرکٹر انٹیلی جنس بیورو میرے پاس آیا اور اس نے آئندہ عام انتخابات کی مہم کے دوران وزیراعظم کے تحفظ کے بارے میں اظہار تشویش کیا۔ اس نے کہا کہ نہرو کی زندگی کو حقیقی خطرہ لاحق ہے۔ اگر وہ عام طیاروں میں مسافروں کے ساتھ ہی سفر کرتے رہے تو اچھا نہ ہوگا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا وزیراعظم کے سفر کے لئے فضائیہ کا طیارہ کرائے پر حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ اس معاملے میں بعض لوگوں سے صلاح مشورہ کروں گا۔ میں نے کیبنٹ سیکرٹری پلائی سے بات کی۔ اس نے تین سینئر افسروں پر مشتمل ایک کمیٹی بنانے کی تجویز پیش کی جو اس بات پر غور کرے کہ آیا وزیراعظم سرکاری کاموں کے سوا بھی فضائیہ کے طیارے استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں۔ میں نے نہرو سے بھی بات کی تو وہ کمیٹی بنانے پر رضامند ہوگئے۔ جس کا سربراہ پلائی کو ہی مقرر کیا گیا۔ کمیٹی میں سیکرٹری دفاع اور ایک اعلیٰ سرکاری افسر شامل تھا۔ اپنی رپورٹ میں کمیٹی نے وزیراعظم کے تحفظ کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے یہ بات لکھی کہ جب وزیراعظم غیر سرکاری دورے پر جاتے ہیں تو وہ وزیراعظم کے عہدے سے الگ تو نہیں ہوجاتے۔ دورانِ سفر طیارے میں وہ سرکاری کام نمٹاتے ہیں۔ اور پھر رات کو بھی جہاں کہیں قیام کریں سرکام میں مصروف رہتے ہیں۔ اس لئے وزیراعظم غیر سرکاری دوروں میں فضائیہ کے طیارے استعمال کر سکتے ہیں۔ البتہ وہ فضائیہ کو اتنی ہی رقم سرکاری طور پر ادا کر دیں جتنی رقم عام ائیر لائنز کو ادا کی جاتی ہے۔ وزیراعظم

کے ساتھ جو سرکاری عملہ جائے گا اس کا کوئی کرایہ وغیرہ ادا نہیں کیا جائے گا۔

وزیراعظم نے کابینہ کے سیکرٹری کو ہدایت کی کہ یہ رپورٹ کابینہ کے تمام ارکان کو بھیج دی جائے اور اس پر کابینہ کے آئندہ اجلاس میں غور کیا جائے گا۔ میں نے وزیراعظم سے کہا کہ اس معاملے میں اس کے ماتحت سرکاری ملازموں کی سفارشات اور ان پر کابینہ کے ارکان کا فیصلہ کوئی مناسب بات نہیں ہوگی کیونکہ یہ معاملہ روزمرہ کے معاملات سے مختلف اور اہم ہے۔ اس پر نہرو نے برا مناتے ہوئے پوچھا "تو ہم اور کیا کریں" میں نے کہا کہ معاملہ کسی خود مختار اتھارٹی کو بھیجا جائے جو حکومت کے اثر سے آزاد ہو۔ مثلاً آڈیٹر جنرل سے اس پر رائے طلب کی جائے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ ایسا کرنا خود وزیراعظم کے مفاد میں ہے۔ میں نے نہرو سے کہا کہ وہ فکر نہ کریں میں خود ہی یہ معاملہ نمٹالوں گا۔ نہرو ناراض تو تھے ہی بولے "جو جی چاہے کرو"۔ چنانچہ میں نے کابینہ کے سیکرٹری سے کہا کہ وہ اس رپورٹ پر کابینہ میں بحث کے لئے تاریخ مقرر نہ کرے۔

اس دوران میں نے آڈیٹر جنرل سے خود جاکر بات کی اور اسے تمام متعلقہ دستاویزات بھی دے دیں۔ اس نے کہا کہ وہ پورے کیس کا مطالعہ کرنے کے بعد میرے دفتر آئے گا۔ دو دن بعد وہ میرے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ موجودہ غیر معمولی حالات میں وزیراعظم کی حفاظت کا مسئلہ ایسا ہے جس کے پیش نظر وہ اس رپورٹ کی منظوری دینے کو تیار ہے میں نے اس سے کہا کہ اس پر کوئی دباؤ نہیں۔ وہ آزادی سے جو چاہے لکھے اس کی رائے کا احترام کیا جائے گا۔ آڈیٹر جنرل نے دو دن بعد رپورٹ پر اپنا نوٹ لکھا۔ اس نے کمیٹی کی سفارش منظور کر لی مگر اس کے ساتھ ہی قرار دیا کہ "یہ رعایت صرف نہرو جی کے لئے ہے اور مستقبل میں اسے مثال نہیں بنایا جاسکے گا"۔ آڈیٹر جنرل کا نوٹ بھی کابینہ کے ارکان میں تقسیم کر دیا گیا جس کے بعد کابینہ کے اجلاس میں کمیٹی کی سفارش کے مطابق فیصلہ کر دیا گیا۔ ان دنوں فضائیہ کے پاس اہم افراد کی پروازوں کے لئے ڈکوٹا جہاز تھے۔ چار انجن والے وائیکاؤنٹ بہت بعد

میں برطانیہ سے حاصل کئے گئے تھے۔

۱۹۵۲ء کی انتخابی مہم کے سلسلے میں نہرو نے ۱۸ ہزار ۳۴۸ میل بذریعہ طیارہ، پانچ ہزار ۶۸۲ میل بذریعہ کار اور ایک ہزار ۶۱۲ میل بذریعہ ریل سفر کیا۔ انہوں نے تین سو سے زائد تقریریں کیں جنہیں تین کروڑ سے زائد افراد نے سنا۔ وہ ۴۶ دن انتخابی مہم میں مصروف رہے اس دوران وزیراعظم کو سرکاری فائلیں دہلی سے پہنچانے اور انہیں واپس لانے کے خاص انتظامات کئے گئے تھے۔ نہرو کے بعد کسی وزیراعظم نے فضائیہ کے طیارے استعمال کرنے کے سلسلے میں اڈیٹر جنرل سے رضامندی حاصل نہ کی۔ غالباً وہ جانتے تھے کہ آڈیٹر جنرل اس کی منظوری نہیں دے گا۔ مگر وہ فضائیہ کے طیاروں میں بدستور پرائیویٹ دورے کرتے رہے جو نامناسب بات ہے۔ نہرو بیرونی ملکوں کے دورے پر جانے کیلئے ایئر انڈیا کے طیارے استعمال کرتے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے انہوں نے صرف دو بار فضائیہ کے طیارے استعمال کئے تھے۔ ایک بار جب وہ شام، جمہوریہ جرمنی، ڈنمارک، سویڈن، فن لینڈ، ناروے برطانیہ، مصر اور سوڈان کے طویل دورے پر گئے اور دوسری مرتبہ جب انہوں نے ارکان پارلیمنٹ کے ایک وفد کے ساتھ سعودی عرب کا دورہ کیا۔ دونوں مواقع پر فضائیہ کے سربراہ نے مجھ سے درخواست کی کہ نہرو فضائیہ کے طیارے میں ملک سے باہر جائیں تاکہ فضائیہ کے ہواباز خصوصی تجربہ حاصل کرسکیں۔

باب ۱۶

رفیع احمد قدوائی

بھارت میں اگر کوئی شخص مذہبی تعصب سے بالاتر رہا ہے تو وہ رفیع احمد قدوائی ہے جسے لوگ پیار سے رفیع کہا کرتے تھے۔ رفیع کئی سال نہرو کے والد موتی لال نہرو کے سیکرٹری رہے۔ نہرو اپنے والد اور گاندھی جی کے بعد جن دو افراد کو دل سے چاہتے ان میں سے ایک رفیع احمد قدوائی اور دوسرا یورپ میں سبھاش چندر بوس کا انقلابی ساتھی اے۔ سی۔ این نمبیار تھا۔ نمبیار سروجنی نائیڈو کا بھائی تھا اس نے یورپ کے متعدد ممالک میں بھارت کی سفارت کے فرائض انجام دیئے۔ نہرو ان دونوں سے سخت ناراض ہوتے تھے اور انہیں بُرا بھلا بھی کہہ لیتے تھے۔ یہ بات ہی ان دونوں سے نہرو کی محبت کی آئینہ دار تھی۔ نہرو نمبیار کو پیار سے نمو کہتے تھے۔ نمبیار جب بھی ملک میں ہوتا، نہرو کے ہاں ہی قیام کرتا۔ ۱۹۶۴ء کے اوائل میں نمبیار نہرو کے ہاں مقیم تھا۔ کئی دن گذر گئے۔ ایک دن ناشتہ کے دوران نمبیار نے نہرو سے کہا "مجھے ایک بات کا بڑا دکھ ہے۔ اس مرتبہ آپ مجھ سے ناراض نہیں ہوتے" نہرو ہنسنے لگے۔ ان دنوں نہرو کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ جب نمو یورپ واپس جانے لگا تو وہ مجھے ملنے آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے کہا "پنڈت جی اب زیادہ دیر زندہ نہیں رہیں گے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ ان سے یہ میری آخری ملاقات ہے" اس کے ساتھ ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

رفیع احمد قدوائی سادگی پسند انسان تھا۔ اس کا حلقہ یاراں بڑا وسیع تھا۔ دہلی میں اس کے ارادتمندوں کو لوگ "رفیعے" کہا کرتے تھے۔ اس کے گھر پر کانگریس ورکروں اور اس

کے اپنے عقیدتمندوں کا جمگھٹا لگا رہتا۔ رفیع کا لنگر جاری تھا اور آنے جانے والوں کی خوب آؤ بھگت کی جاتی۔ اس مقصد کے لئے وہ چھوٹے موٹے تاجروں اور صنعت کاروں سے روپیہ پیسہ لینے میں عار نہیں سمجھتا تھا۔ وہ ان سے نقد رقم کے علاوہ گھڑیاں قلم، گرم کپڑے اور سوئیٹر وغیرہ بھی تحفے کے طور پر حاصل کرتا اور یہ اشیا اپنے ارادتمندوں میں تقسیم کر دیا کرتا تھا مگر وہ بڑے صنعت کاروں اور تاجروں کے قریب بھی نہ پھٹکتا۔ رفیع کی سخاوت سے فیروز گاندھی بھی مستفید ہوتا تھا جو اندرا کا شوہر تھا۔

بڑی کاریں اور تیز ڈرائیونگ رفیع کی کمزوریاں تھیں۔ اسے ٹریفک کے کئی حادثے پیش آئے مگر وہ خوش قسمت تھا اور ہر بار معمولی زخم کھا کر بچ نکلتا۔ ایک مرتبہ یوپی کے ایک صنعتکار نے نہرو سے ذاتی طور پر شکایت کی کہ رفیع نے اس سے ایک بڑی کار ہتھیالی ہے۔ نہرو نے رفیع کو لکھا کہ کار فوراً واپس کر دو مگر رفیع چکنا گھڑا نکلا اور نہرو کے خط کو کار کے ساتھ ہی پی گیا۔ یوپی اور مرکز میں وزیر کی حیثیت سے رفیع کامیاب ترین وزیر تھا۔ اس نے مرکزی وزیر مواصلات کی حیثیت میں کئی جرأت مندانہ اقدامات کئے۔ رفیع نے طاقتور ٹاٹا خاندان کی پروا نہ کرتے ہوئے شہری ہوابازی کو قومی ملکیت میں لے لیا۔ اور فضائی ڈاک کے لئے شبینہ سروس جاری کی۔

رفیع اکثر شام کو پیشگی اطلاع کے بغیر ایوان وزیر اعظم میں آجاتا تھا۔ اگر نہرو فارغ ہوتے تو ان سے گپ لڑاتا ورنہ میرے پاس بیٹھ کر دنیا جہان کی باتیں کرتا رہتا۔ اس کی باتیں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔ ایک دفعہ میں نے اسے بعض باتیں بتائیں جو فیروز گاندھی نے میرے سامنے کی تھیں۔ اس پر رفیع نے قہقہہ لگایا اور بولا "کیا تم بھی فیروز گاندھی کی باتوں پر یقین کرتے ہو؟"

جب ریاستی امور کی وزارت مہاراجہ بڑودہ پرتاپ سنگھ کے خلاف کارروائی کرنے والی تھی، رفیع مہاراجہ سے ملا اور اس سے "نیشنل ہیرالڈ" کے نام پر دو لاکھ روپے ہتھیا لئے۔ سردار پٹیل نے یہ بات نہرو کو بتا دی تو نہرو نے رفیع کو جھاڑا اور رقم فی الفور واپس کرنے کو کہا اس پر رفیع نے جواب دیا کہ میں نے فیروز گاندھی کو ہدایت کر دی ہے کہ رقم واپس کر دی جائے" فیروز گاندھی نیشنل ہیرلڈ نکالنے والے ادارہ کا سربراہ تھا۔ مزے کی بات یہ ہے۔ کہ جب

رفیع مہاراجہ پرتاپ سنگھ سے رقم کے لئے سودا بازی کر رہا تھا، اس نے نہرو سے اُلٹا یہ شکایت کی کہ وی پی مینن نے پرتاپ سنگھ سے لاکھوں روپے ہتھیائے ہیں۔ یہ بات تو غالباً کسی کو معلوم نہیں کہ ایک بار رفیع پٹیل کے پاس گیا اور اسے کہا کہ "میں نہرو کو وزارت عظمےٰ سے ہٹانے کے لئے آپ کی مدد کرنے کو تیار ہوں" اس کے بعد رفیع کے ایک حواری مہابیر تیاگی نے بھی پٹیل سے یہی بات کہی تو پٹیل کو غصہ آگیا اور وہ ان دونوں سے کھنچا کھنچا رہنے لگا۔ پٹیل کی رائے تھی کہ رفیع سیاسی طور پر بددیانت شخص ہے۔ رفیع بھی تاڑ گیا کہ پٹیل اس کے اندازے سے زیادہ دانشمند ہے۔ جب رفیع نے اچاریہ کرپلانی کے ساتھ کانگریس چھوڑ کر نئی پارٹی بنالی تو نہرو کو بڑا رنج تھا۔ کچھ عرصہ بعد نہرو نے رفیع کو بلا بھیجا۔ وہ آکر میرے پاس بیٹھ گیا۔ نہرو بھی میرے کمرے میں آگئے اور رفیع سے باتیں کرنے لگے۔ باتوں باتوں میں نہرو کا پارہ چڑھ گیا اور وہ لگے چلانے، انہوں نے رفیع سے کہا کہ تم میں تو چوہے جتنی عقل بھی نہیں ہے۔ اس مرحلہ پر میں کمرے سے باہر نکل آیا اور دروازہ بند کر دیا تاکہ دونوں دل کا غبار نکال لیں۔ قصہ کوتاہ نہرو نے رفیع کو خلافِ معمول کانگریس اور کابینہ میں دوبارہ شامل کر لیا۔

ایک روز فضائیہ کا ایک اعلیٰ افسر مجھ سے ملنے آیا۔ رفیع نے اسے کہا تھا کہ فضائیہ کے ذریعے اسلحہ کی بھاری مقدار نیپال پہنچانی ہے تاکہ کوئرالہ کو اسلحہ فراہم کیا جائے جو نیپالی حکومت کے خلاف برسرِ پیکار تھا۔ رفیع نے فضائیہ کے افسر سے کہا تھا کہ وزیر اعظم اس معاملے میں منظوری دے چکے ہیں۔ یہ افسر مجھ سے تصدیق چاہتا تھا کہ واقعی وزیر اعظم نے اس کام کی منظوری دی ہے کیونکہ فضائیہ کے سربراہ کو علم تھا کہ اس قسم کا اسلحہ پہنچانے کے لئے کوئی غیر معمولی طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ میں فضائی افسر کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ یہ بات بھول جائے اور یہ کہ اگر وزیر اعظم ایسا کام کرانا چاہتے تو وہ رفیع کے بجائے وزیر دفاع سے کہتے۔ تاہم میں نے اس افسر سے کہا کہ میں شام کو وزیر اعظم سے بات کرنے کے بعد اسے ٹیلی فون کروں گا۔ شام کو میں نے نہرو سے بات کی تو وہ بھنا اٹھے اور کوئی پی اے بلانے کو کہا تاکہ رفیع کو سخت خط لکھا جائے۔ میں نے نہرو سے کہا کہ یہ بڑا نازک معاملہ ہے، اسے ضبطِ تحریر

میں لانا ٹھیک نہیں۔ آپ ٹیلی فون پر بات کرلیں۔ نہرو نے رفیع کو ٹیلی فون کیا اور خوب جھاڑ پلائی اگلی صبح کو رفیع کا افسر آیا تو میں رفیع کی پوزیشن خراب کئے بغیر اسے کہا کہ وہ اس معاملہ کو بھول جائے۔

رفیع جب مرکزی کابینہ میں تھا تو دو بار میری اس سے پیچ پیچ ہوئی۔ پہلا واقعہ اس وقت رونما ہوا جب پرشوتم داس ٹنڈن کو کانگریس کی صدارت سے علیحدہ کیا گیا تو میں نے یو۔ ایس مالیہ کو کانگریس کا جنرل سیکرٹری مقرر کرنے کی تجویز پیش کی۔ میری تجویز یہ تھی کہ مالیہ یا لال بہادر شاستری کو جو یوپی میں پولیس کے وزیر تھے۔ کانگریس کا جنرل سیکرٹری مقرر کردیا جائے۔ رفیع مالیہ کو پسند نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ وہ آزاد شخص تھا چنانچہ رفیع نے راجہ جی کو بھی ساتھ ملالیا۔ راجہ جی نے کہا کہ مالیہ سازشی ذہن کا آدمی ہے۔ راجہ جی کی تجویز تھی کہ نجلنگ اپا کو کانگریس کا جنرل سیکرٹری مقرر کردیا جائے۔ نہرو نے اس وقت تو ان سنی کردی۔ لیکن بعد میں مجھ سے بات کی تو میں نے کہا کہ مالیہ راجہ جی سے کم سازشی ہے۔ میں نے نہرو کو بتایا کہ مالیہ اس عہدے کا زیادہ خواہشمند نہیں اور میں نے اس سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔ اگر وزیر اعظم مالیہ کو سیکرٹری بنوانا چاہتے ہیں تو اسے رضامند بھی کرنا ہوگا۔ چنانچہ نہرو نے مالیہ کو بلایا۔ جب مالیہ سے بات ہوئی تو اس نے نہرو سے کہا کہ وہ لکھنے پڑھنے کے کام کے لئے موزوں نہیں ہے۔ تاہم اگر وزیر اعظم چاہتے ہیں تو وہ صرف مددگار کے طور پر جنرل سیکرٹری شپ قبول کرنے کو تیار ہے اور لال بہادر کی شکل کاموں میں مدد کرتا رہے گا۔ مالیہ جانتا تھا کہ لال بہادر "بی بی بہن" ہے اور اس میں کسی بطخ کو بھگانے کی بھی سکت نہیں ہے۔ چنانچہ نہرو نے مالیہ کو مقرر کردیا اور شاستری سے اس کی خوب بنی رہی۔ جب شاستری وزیر اعظم مقرر ہوئے تو وہ مالیہ کو کابینہ میں لینا چاہتے تھے مگر مالیہ نے انکار کردیا۔

دوسری بار رفیع سے میری گرماگرمی ایک کمیونسٹ رکن پارلیمنٹ کی وجہ سے ہوئی جس نے لوک سبھا کے رہائشی حصہ میں زبردستی ایک کمرے پر قبضہ کر رکھا تھا۔ رفیع نے مالیہ سے اس کی بات کی تو مالیہ نے اسے بتایا کہ وہ تو معاملہ وزیر اعظم کے علم میں لاچکا ہے اور اس رکن کو نوٹس دے دیا گیا ہے کہ وہ دو ہفتے کے اندر کمرہ خالی کردے ورنہ اسے پولیس کی مدد سے بے دخل کردیا جائیگا۔

لوک سبھا کی ہاؤسنگ کمیٹی کا چیئرمین تھا اور اس کا تقرر سپیکر نے کیا تھا۔ مالیہ نے مجھے صورت حال بتائی اور کہا کہ سپیکر بھی اس رکن کو کمرہ سے نکلوانے کے حق میں ہیں۔ میں نے مالیہ سے کہا کہ تم فکر نہ کرو اگر رفیع نے مداخلت کی تو میں ایسا انتظام کروں گا کہ نہرو ہی تمہیں بلاکر پوچھیں۔ تم ڈٹے رہنا۔ اب رفیع نہرو کے پاس آئے اور مالیہ کی شکایت کی۔ نہرو نے مالیہ کو ایک سخت خط لکھوایا۔ میں نے خط نہ بھجوایا۔ اور نہرو سے کہا کہ آپ مالیہ کو بلاکر بات کریں۔ میں نے نہرو کو بتایا کہ کمرہ خالی کرانے کا معاملہ سپیکر کی ذمہ داری ہے اور وہ کمیونسٹ رکن پارلیمنٹ کی اپیل پہلے ہی مسترد کرچکے ہیں اسی اثنا میں وہ رکن بھی لوک سبھا میں میرے دفتر میں آگیا۔ وہ نہرو سے فوری ملاقات کا خواہشمند تھا مگر نہرو کے پرائیویٹ سیکرٹری نے اسے بتایا کہ وزیر اعظم نہیں مل سکتے وہ مصروف ہیں۔ اس پر وہ چیخنے چلانے لگا۔ اس نے پرائیویٹ سیکرٹری سے کہا کہ اسے رفیع صاحب نے بھیجا ہے۔ اس مرحلے پر میں نے مداخلت کی اور کہا کہ رفیع صاحب کو اسے یہاں نہیں بھیجنا چاہیئے تھا۔ میں نے اسے یہ بھی کہا کہ تمہارا رویہ رکن پارلیمنٹ کے شایانِ شان نہیں ہے اگر تم نے زور زور سے بولنا بند نہ کیا تو تمہیں سیکورٹی گارڈ کے ذریعے ایوان کی حدود سے نکال دیا جائے گا۔ اس پر وہ چوکڑی بھول گیا اور میری طرف غصہ بھری نظروں سے دیکھتا ہوا میرے دفتر سے نکل گیا۔ اسی شام کو مالیہ نے نہرو سے ملاقات کی اور انہیں تمام حقائق سے مطلع کیا تو نہرو بولے۔ "تم نے پہلے ہی سخت کارروائی کیوں نہ کی" مالیہ نے کہا "جناب اگر آپ نرم ہوں تو میں سخت کیسے ہوسکتا ہوں۔" نہرو نے مسکراکر مالیہ کو جانے کی اجازت دے دی۔ بعد میں رفیع نہرو کے سامنے آیا تو نہرو نے اسے ڈانٹ کر پوچھا "تم نے مجھے غلط اطلاع کیوں دی تھی؟" رفیع کا جواب خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ اگر نہرو کو کسی معاملے میں بالکل صحیح اطلاع ہوجائے تو ان کا فیصلہ بالکل صحیح ہوتا تھا۔

اب آپ ایک راز کی بات سنیں۔ آپ کو یاد ہوگا، نہرو نے ١٩٥٣ء میں شیخ عبداللہ کو (مفتوحہ) کشمیر کی وزارت عظمٰے سے برطرف کردیا تھا۔ نہرو کو اس اقدام کی

ترغیب دینے میں دو افراد کا ہاتھ تھا۔ سرفہرست رفیع احمد قدوائی تھے اور نمبر دو تھے مولانا ابوالکلام آزاد۔ رفیع کی تمام تر کمزوریوں اور لغزشوں کے باوجود میری تمنا ہے کہ بھارت میں اُس جیسے مزید لوگ جنم لیں۔ وہ افلاس اور غربت کی حالت میں اللہ کو پیارا ہوا۔ رفیع کئی لحاظ سے دلکش شخصیت کا مالک تھا۔ بس ایوب ادھم کی طرح اسے بھی خدا کے بندوں سے پیار تھا۔

باب ۱۷

فیروز گاندھی

اندرا گاندھی کا شوہر فیروز گاندھی الہ آباد کے شراب اور اشیائے خورد و نوش کے ایک تاجر کا بیٹا تھا۔ وہ لڑکپن سے ہی اندرا کی ماں کملا نہرو کے ساتھ کانگریس کے رضاکار کی حیثیت سے وابستہ تھا۔ جب بھی کملا نہرو الہ آباد کے مضافات میں پارٹی کے کام سے جاتی فیروز اس کے ہمراہ ہوتا۔ اس پر یہ تہمت نہیں لگائی جاسکتی کہ اسے تعلیم کا شوق تھا۔ وہ زندگی بھر کسی بچے کی طرح بدخط رہا۔ کہا جاتا ہے کہ اپنی موت سے کوئی دو ماہ قبل کملا نے نمبیار کی موجودگی میں نہرو سے اندرا کے مستقبل کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا تھا۔ ان دنوں نہرو اور کملا جرمنی گئے ہوئے تھے۔ اس نے فیروز کے ساتھ اندرا کی شادی کی سخت مخالفت کی تھی۔ وہ فیروز گاندھی کو متلون مزاج نوجوان سمجھتی تھی نہ ہی وہ اتنا تعلیم یافتہ تھا کہ کوئی قابلِ عزت پیشہ اختیار کرسکتا۔ باتیں کرتے کرتے کملا جذباتی ہوگئی اور کہنے لگی "میں نہیں چاہتی میری بیٹی تمام عمر خوشیوں سے محروم رہے۔" نہرو نے کملا کو تسلی دی اور کہا کہ یہ معاملہ تم مجھ پر چھوڑ دو چند منٹ بعد نہرو باہر چلے گئے تو کملا نے نمبیار سے کہا۔ "نھوتم نے سنا نہرو جی نے کیا کہا ہے۔ اندرا میرے علاوہ کسی کی بات نہیں مانے گی۔ میں اندو کو سمجھا بجھا کر فیروز سے دور کر دیتی مگر اب میری زندگی چند روز ہے۔ نہرو اندو کی رہنمائی نہ کرسکیں گے اور بالآخر وہ زندگی کی عظیم ترین غلطی کر بیٹھے گی۔" ان دنوں اندرا لندن میں زیرِ تعلیم تھی۔ کملا نہرو کا ۲۸ فروری ۳۶ء کو دیہانت ہوگیا۔ اس سے چند روز قبل فیروز گاندھی اپنی رشتے کی ایک خالہ سے مالی اعانت حاصل کرکے لندن پہنچ چکا تھا۔ لندن میں مقیم ہندوستانیوں

میں فیروز کی تعلیم مذاق کا موضوع بنی رہی۔

دوسری جنگِ عظیم چھڑتے ہی اندرا بھی دوسرے ہندوستانیوں کی طرح بحری جہاز سے ہندوستان واپس لوٹ آئی۔ فیروز گاندھی بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ ۱۹۴۱ء میں اندرا نے اپنے والد سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ فیروز سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ نہرو کو جرمنی میں اپنی اہلیہ کی باتیں یاد تھیں۔ نہرو نے اندرا کو سمجھایا کہ فیروز اس سے شادی کے لائق نہیں ہے۔ نہرو خاندان کے تمام افراد اس شادی کے خلاف تھے۔ نہرو اور ان کے اعزا یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے خاندان کی خوبرو لڑکی الہٰ آباد کے ایک شراب کے معمولی تاجر کے بیٹے سے شادی کرے۔ بدترین بات یہ تھی کہ یہ لڑکا کوئی مناسب پیشہ اختیار کر کے اپنی روزی کمانے کے قابل بھی نہ تھا۔ جوں جوں خاندان میں اس شادی کی مخالفت ہوئی۔ اندرا کا رویہ سخت ہوتا گیا اور وہ اس بات پر اڑ گئی کہ وہ شادی صرف فیروز سے کرے گی۔ اس نے نہرو سے کہا کہ وہ ملک چھوڑ کر جا رہی ہے کیونکہ یہاں اس کا کوئی نہیں۔ نہرو کو اس سے سخت صدمہ پہنچا۔ نہرو نے اپنی بہن وجے لکشمی پنڈت اور سروجنی نائیڈو کی بیٹی پدماجا نائیڈو سے بات کی جو ان دنوں الہٰ آباد میں موجود تھیں۔ پدما نے نہرو سے کہا کہ اگر اس معاملے کا تجزیہ کیا جائے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ باپ کو بالغ لڑکی کی راہ میں حائل ہونے کا کوئی حق نہیں۔ چار و ناچار نہرو نے شادی کی اجازت دے دی۔ ناقابلِ فہم وجوہ کی بنا پر اندرا اور فیروز کی شادی ویدوں کے مطابق اشلوک پڑھ کر کی گئی۔ ان ایام میں دو مختلف مذاہب کے جوڑے کے درمیان وید کے اشلوکوں سے کی گئی شادی کی کوئی قانونی حیثیت نہ تھی۔ ایسی شادی قانون کی رو سے تو سول میرج ہی ہو سکتی تھی۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اندرا فیروز کی محض داشتہ تھی اور اس کے بچے "حرامی" ہیں۔

اندرا کی شادی ۱۹۴۲ء میں ہوئی۔ شادی کے فوراً بعد نہرو نے فیروز کو "ایسوسی ایٹڈ جرنلز" کا ایم ڈی بنا دیا۔ یہ ادارہ تین اخبارات نیشنل ہیرالڈ، ٹریبون، نوجیون اور قومی آواز شائع کرتا تھا۔ اس تقرر کے تباہ کن نتائج برآمد ہوئے۔ اس دوران فیروز انشورنس ایجنٹ کے طور پر کام کر کے بھی تھوڑا بہت کماتا رہا۔ نہرو کی فرمائش پر یوپی کے وزیرِ اعلیٰ پنت نے فیروز گاندھی کو دستور ساز

اسمبلی کا رکن منتخب کرا دیا جو دسمبر ۴۶ء میں قائم ہوئی تھی۔ وہ ۱۹۵۲ء میں لوک سبھا کا ممبر منتخب ہو گیا اور ۱۹۶۱ء میں اپنی وفات تک پارلیمنٹ کا رکن رہا۔

۱۹۴۷ء میں فیروز گاندھی وجے لکشمی پنڈت کی ایک لڑکی پر فریفتہ ہو گیا۔ یہ لڑکی نیشنل ہیرالڈ لکھنؤ میں اپرنٹس سب ایڈیٹر کے طور پر کام کرتی تھی۔ وجے لکشمی کو اس کا علم ہوا تو وہ اپنے خرچ پر ماسکو سے بھاگم بھاگ لکھنؤ پہنچی اور اپنی لڑکی کو ماسکو لے اڑی۔

کھانے کی میز پر نہرو جو باتیں کیا کرتے تھے انمیں سے بعض افشا ہو گئیں۔ اس سے اضطراب پھیل گیا۔ سراغ لگانے پر پتہ چلا کہ اس کی ذمہ داری فیروز گاندھی پر عائد ہوتی ہے۔ اس کے بعد کھانے کے دوران اگر فیروز موجود ہوتا تو نہرو مہر بلب رہتے۔ فیروز گاندھی سے شادی کر کے اندرا نے نہرو کے دل پر جو گھاؤ لگایا تھا۔ وقت کا مرہم اسے بھرنے میں ناکام رہا اور وہ اپنی اکلوتی بیٹی سے کامل مفاہمت نہ کر سکے۔ شادی کے بعد کے واقعات نے تو اس گھاؤ کو بھرنے کے بجائے اور گہرا کر دیا۔ ۱۹۴۸ء کی بات ہے ایک روز وزیرِ صحت راج کماری امرت کور نے مجھے بتایا کہ اس کی موجودگی میں فیروز نے پارلیمنٹ ہاؤس میں ارکان کے پارلیمنٹ کے ایک گروہ کو بتایا کہ ایم۔او متھائی (مصنف) تو نہرو کا داماد ہے۔ یہ ارکان تاڑ گئے کہ فیروز نے یہ بات جلاپے کی وجہ سے کی ہے۔ کیونکہ میں ہر وقت نہرو کے ساتھ رہتا تھا۔ جب وہ دفتر آتے جاتے تو میں کار میں ان کے ساتھ ہوتا اور پھر میں ایوانِ وزیرِ اعظم میں ہی رہائش پذیر تھا۔

فیروز گاندھی نے ایک اور روحان بھی لڑایا۔ اب کے اس نے عشق بازی کے لئے یوپی کے ایک مسلمان وزیر کی لڑکی کو تاڑا۔ یہ لڑکی آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی میں ملازم تھی۔ فیروز اور اس لڑکی نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ فیروز نے اندرا کو بھی اپنے فیصلہ سے مطلع کر دیا۔ اندرا نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ مگر فیروز نے کہا کہ وہ بڑے لڑکے سنجے کو اپنی تحویل میں لینا چاہتا ہے مگر اندرا نے اس معاملہ پر غور کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ اسی شام فیروز نے نہرو کی مطالعہ کی میز پر ایک رقعہ چھوڑا اور چلا گیا۔ رقعہ میں لکھا گیا تھا کہ "اس مرتبہ غلطی میری ہے۔" نہرو نے رات کا کھانا کھانے کے بعد فیروز

کو طلب کیا اور اس کی بات سنی۔ اگلی صبح ناشتہ کے بعد نہرو اندرا کو اپنے کمرے میں لے گیا اور اسے بتایا کہ کل رات فیروز گاندھی نے اس سے کچھ باتیں کی ہیں۔ نہرو نے اپنی بیٹی سے صرف ایک سوال پوچھا۔ "اندرا کیا تمہاری نظر میں کوئی اور ہے" اندرا نے نفی میں جواب دیا۔ شام کو اندرا مجھے ملی اور سب کچھ مجھے بتادیا۔ اور شکایت کی کہ اس کے پتا اس سے دل کی بات نہیں کرتے بلکہ بعض باتیں چھپا لیتے ہیں۔ ایک بیٹی کی حیثیت سے اسے توقع تھی کہ فیروز کی نہرو سے جو بھی بات ہوئی تھی، نہرو اسے سب کچھ بتا دیتے۔ میں نے اندرا سے کہا کہ نہرو نے مزید بدمزگی پیدا نہ کرنے کی خاطر بعض باتیں چھپائی ہوں گی۔ خیر جب فیروز کے نئے معاشقے کی خبر لکھنو پہنچی تو لڑکی کا باپ جو مسلمان وزیر تھا سخت پریشان ہوا وہ بھاگا بھاگا دہلی پہنچا اور اپنی بیٹی کو لے کر واپس چلا گیا۔ اس واقعہ کے بعد فیروز لوک سبھا کے کوارٹروں میں منتقل ہو گیا جہاں رکن پارلیمنٹ کی حیثیت سے اسے ایک کوارٹر ملا ہوا تھا۔

فیروز گاندھی جب نیشنل ہیرالڈ سے نکل گیا تو رفیع احمد قدوائی نے اسے "انڈین ایکسپریس" میں نوکری دلادی۔ رفیع کی وفات کے بعد نہرو کو علم ہوا کہ "انڈین ایکسپریس" کے مالک رام ناتھ نے کہا تھا کہ "میں نے رفیع کے ایما پر فیروز کو اس لئے ملازمت دی تھی کیونکہ رفیع نے کہا تھا کہ اس سے نہرو جی کا مالی بوجھ کم ہو جائے گا اور یہ کہ اسی وجہ سے اس نے اندرا کے ذاتی استعمال کے لئے اپنی کار بھی دے دی تھی۔" وزیر اعظم نے مجھے ہدایت کی کہ میں رام ناتھ سے مل کر ان باتوں کی تصدیق کروں۔ میں نے اس سے بات کی تو اس نے تصدیق کی کہ وزیر اعظم کو جو اطلاع ملی ہے وہ بالکل درست ہے۔ میں نے نہرو کو بتایا تو وہ بیحد مضطرب ہوئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ رام ناتھ نے فیروز گاندھی سے کار واپس لینے کے احکامات جاری کر دیئے ہیں اور یہ مشورہ دیا کہ اس وقت مزید کوئی کارروائی کرنا مناسب نہ ہوگا۔ فیروز گاندھی نے جب پارلیمنٹ میں ٹی ٹی کرشنا مچاری پر سخت حملے کئے اور کرشنا مچاری کو اپنے کابینہ سے استعفیٰ دینا پڑا تو رام ناتھ نے جو کرشنا مچاری کا ذاتی دوست تھا، فیروز کو انڈین ایکسپریس سے نکال باہر کیا۔ کملا نہرو نے بستر مرگ پر جن خدشات کا اظہار کیا تھا وہ درست ثابت ہو رہے تھے۔

باب ۱۵

نہرو کے اخبارات

یہ ۱۹۵۵ء کے اواخر کا ذکر ہے۔ اندرا گھبرائی ہوئی اور غصے میں میرے کمرے میں داخل ہوئی اور کہنے لگی کہ پتا جی نے مجھے ابھی ابھی بتایا ہے کہ فیروز گاندھی اور اجیت پرشاد جین نے ان سے بات کی ہے۔ اور وہ نیشنل ہیرالڈ اور تحفہ اخبارات یو پی کانگریس کے صدر گپتا کے حوالے کر رہے ہیں کیونکہ اخبارات کو چلانے میں شدید مالی مشکلات درپیش ہیں۔ فیروز گاندھی اور اجیت پرشاد لکھنو جانے کے لئے دہلی ریلوے سٹیشن پر جا چکے تھے۔ اندرا نے مجھ سے کہا کہ کیا اس صورت حال کو سنبھالا جا سکتا ہے۔ میں نے اپنے عملہ سے کہا کہ دہلی ریلوے سٹیشن کے سٹیشن ماسٹر کو فون کریں اور اسے کہیں کہ فیروز گاندھی کو ڈھونڈ کر فون پر لائیں۔ اندرا نے فون پر فیروز سے بات کی اور اس سے کہا کہ وہ اپنی تجویز پر عمل نہ کریں۔ فیروز گاندھی ایسوسی ایٹڈ جرنلز کا مینجنگ ڈائریکٹر ہونے کی حیثیت میں نیشنل ہیرالڈ کا انچارج تھا۔ وہ تعمیری صلاحیتوں سے عاری تھا۔ لیکن وہ پارلیمنٹ میں دوسروں پر حملے کرنے کا عادی تھا۔ اسے وزیر خزانہ سی۔ ڈی دیش مکھ نے پہلی بار اس مقصد کے لئے استعمال کیا تھا۔

دیش مکھ انشورنس کمپنیوں کو سرکاری تحویل میں لینا چاہتا تھا اور ان کمپنیوں کے خلاف فضا پیدا کرنے کے لئے اس نے فیروز گاندھی کو استعمال کیا۔ اس نے اپنی وزارت کے بعض سینئر افسروں کو فیروز گاندھی کے پاس بھیجا جنہوں نے اسے بعض خفیہ معلومات فراہم کیں۔ ان معلومات کی بنا پر فیروز گاندھی نے پارلیمنٹ میں انشورنس کمپنیوں پر شدید حملے کئے اور ان کے قومی تحویل میں لئے جانے کی راہ ہموار کر دی۔ اس طرح فیروز گاندھی کی بعض اہم سرکاری افسروں سے راہ و رسم

بڑھی۔ یہ افسر بعد میں بھی اس کے لئے سود مند ثابت ہوئے اور فیروز گاندھی دوسرے لوگوں پر حملے کرنے کے لئے ان افسروں سے معلومات حاصل کرتا رہا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار جدوجہد آزادی کے دوران نہرو نے کہا تھا کہ میں الہ آباد میں اپنا آبائی مکان "انند بھون" فروخت کر دوں گا مگر "نیشنل ہیرالڈ" کو زندہ رکھا جائے گا۔ چنانچہ میں نے از خود فیصلہ کیا کہ ایسوسی ایٹڈ جرنلز کے مالی معاملات کو درست کر کے مضبوط بنیادوں پر استوار کر دیا جائے۔ میں نے اٹارنی جنرل سیتل واد سے ملاقات کی اور اسے کہا کہ ان اخبارات کی امداد کے لئے ایک ٹرسٹ قائم کیا جائے۔ چنانچہ اٹارنی جنرل کی سفارش پر پارلیمنٹ کے ایک رکن سی۔ سی۔ شا نے ٹرسٹ کی بنیادی دستاویز تیار کی۔ میں نے اندرا سے اس ٹرسٹ کا نام تجویز کرنے کو کہا اس نے "جنہیت ٹرسٹ" تجویز کیا جسے میں نے ہندی میں "جنہیت ندھی" کر دیا۔ یہ ٹرسٹ ۱۹۵۶ء کے اوائل میں قائم کر دیا گیا اور اندرا کے علاوہ پدما جا نائیڈو اور ممبر پارلیمنٹ پی۔ این پردھن کے ٹرسٹی مقرر کئے گئے۔ اب ایسے لوگوں کی تلاش شروع ہوئی جو اپنے حصص اور ہنڈیاں وغیرہ ٹرسٹ میں دے سکیں۔ چنانچہ پنڈت پنت، این۔ کے کجرو، سری پرکاش نواب بھوپال، راجہ بھدری مہاراجہ آف گوندل، مہاراج کمار آف ودیانگر، کرنل بی ایچ زیدی، رام رتن گپتا منو بھائی بھمنی اور سارا بھائی جیسے اہم لوگوں نے ٹرسٹ میں اپنے حصص وغیرہ دے دیئے۔

میں نے جب ایسوسی ایٹڈ جرنلز کا حساب کتاب دیکھا تو مجھے کتابوں میں ایک اندراج ملا۔ جس کی رو سے فیروز گاندھی کے دو لاکھ روپے بطور قرض ظاہر کئے گئے۔ میرے استفسار پر معلوم ہوا یہ رقم مہاراجہ بڑودہ نے بلا سود قرض کے طور پر کمپنی کو دی ہے۔ دراصل یہ وہ رقم تھی جو رفیع احمد قدوائی نے بڑودہ سے ہتھیائی تھی۔ اس کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے کہ جب معاملہ نہرو کے علم میں آیا تو انہوں نے رفیع سے رقم مہاراجہ کو لوٹانے کے لئے کہا۔ رفیع نے بتایا کہ اس نے یہ رقم فیروز گاندھی کو دے دی ہے۔ تاہم اس کے ساتھ ہی اس نے فیروز گاندھی سے رقم کی فی الفور واپسی کے لئے کہا۔ فیروز نے دو ہفتے بعد جواب دیا کہ رقم لوٹا دی گئی ہے۔ مگر یہ بات حقیقت پر مبنی نہ تھی۔ فیروز گاندھی نے رقم

تو نہ لوٹائی البتہ اسے کتابوں میں اپنی طرف سے ایسوسی ایٹڈ جرنلز لمیٹڈ کو قرض ظاہر کر دیا۔ میں نے بعض دوستوں کی مدد سے مہاراجہ کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ یہ رقم بطور عطیہ ٹرسٹ کو دے دیں۔ اس پر فیروز گاندھی کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور وہ مجھ سے مزید ناراض رہنے لگے۔

میرے لئے یہ بات تعجب خیز نہ تھی کہ ایک روز نہرو نے میری اور لال بہادر شاستری کی موجودگی میں فیروز گاندھی کو سخت سست کہا۔ ان دنوں فیروز نے وزیر خزانہ ٹی ٹی۔ کرشن مچاری پر پارلیمنٹ میں شدید حملے شروع کر رکھے تھے۔ نہرو نے کہا کہ یہ شخص جسے فیروز کہتے ہیں پرلے درجے کا جھوٹا ہے۔ مجھے اس وقت بھی کوئی تعجب نہیں ہوا تھا جب وی کے کرشنا مینن نے مجھے بتایا۔ "میں فیروز گاندھی کو اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ لندن میں طالب علم تھا۔ میں ذاتی تجربے کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ شخص پیدائشی دروغ گو ہے۔"

ایسوسی ایٹڈ جرنلز کی حالت بہتر بنانے کے لئے ٹاٹا برلا اور دوسرے بڑے بڑے صنعتی گروپوں کی مدد سے ۲۴ لاکھ ۵۵ ہزار روپے سے زاید کی رقم جمع کر لی گئی۔ یہ رقم عطیات اور اخبارات کے خاص نمبروں کے لئے اشتہارات کے ذریعے جمع کی گئی۔ انڈین ایکسپریس کے مالک نے ایک پریس بطور عطیہ دیا جس کی قیمت ساڑھے سترہ لاکھ روپے تھی۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۶۳ء کو ٹرسٹ کے اثاثے ۲۵ لاکھ ۳۹ ہزار روپے سے زاید تھے۔ مگر اخبارات میں اس کے سوا کوئی قابلِ ذکر تبدیلی نہ آئی کہ دہلی میں نیشنل ہیرالڈ کا دفتر تعمیر کیا گیا۔

اگرچہ میں نے نیشنل ہیرالڈ کے امور میں مداخلت کے لئے نہرو سے پیشگی اجازت حاصل نہ کی تھی۔ مگر میں انہیں تمام کارروائی سے مطلع کرتا رہتا تھا۔ میں نے ۱۹۵۷ء کے آخر میں انہیں اخبارات کے بارے میں اپنی آخری رپورٹ پیش کی اور کہا کہ اب میں اس معاملہ میں مزید کوئی دلچسپی نہ لوں گا۔ نہرو نے رپورٹ پڑھنے کے بعد مجھے طلب کیا اور کہا "تم نے اخبارات کی مالی پوزیشن نہایت مستحکم کر دی ہے مگر اس طرح کب تک کام چلے گا۔ چالاپاتھی راؤ جدوجہد آزادی کے دوران اچھے صحافی کی حیثیت سے جانا پہچانا تھا۔ مگر وہ نئی صورتِ حال سے خود کو ہم آہنگ نہیں کر سکا۔ وہ

سمجھتا ہے کہ لمبے لمبے اور موٹے موٹے الفاظ پر مشتمل ایڈیٹوریل لکھ کر اچھا اخبار نکالا جا سکتا ہے۔ اسے معاشی معاملات کی قطعاً کوئی سوجھ بوجھ نہیں۔" نہرو نے مزید کہا کہ "چالا پاتھی کی ادارت میں اخبار کی سرکولیشن میں کبھی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ میرا دفتر ہر صبح نیشنل ہیرالڈ دوسرے اخبارات کے تراشوں کے ساتھ مجھے دیتا ہے مگر کئی سال ہیں نے نیشنل ہیرالڈ کو کھول کر نہیں دیکھا۔ اگر نیشنل ہیرالڈ اور اس سے ملحقہ اخبارات بند بھی ہو جائیں تو مجھے افسوس نہ ہوگا جس طرح میں کھڈی اور دیہی صنعت کے کمیشن کو بڑی بڑی رقمیں دینے کا مخالف ہوں اس طرح میں اس بات کا بھی مخالف ہوں کہ کسی اخبار کو زندہ رکھنے کے لئے باہر سے امداد دی جائے۔" میں نے نیوسٹیٹس مین لندن کے ایڈیٹر کنگز لے مارٹن سے دہلی اور لندن میں متعدد ملاقاتیں کی ہیں۔ ان کا نظریہ تھا کہ اخبار ۷۵ فیصد تجارت اور بقیہ پچیس فیصد صحافت ہے مگر چالا پاتھی راؤ نے بڑی کامیابی سے ایسی کوئی بات سیکھنے سے دامن بچائے رکھا۔

باب ۱۹

نہرو اور پریس

حکومت میں آنے سے قبل نہرو نے متعدد مضامین اور اداریے لکھے تھے جو نیشنل ہیرالڈ میں شائع ہوئے سردار پٹیل، مولانا آزاد، راجہ جی اور پنت نے اخبارات میں اپنی اپنی لابی قائم کر رکھی تھی اور بعض صحافیوں سے ان کے خصوصی تعلقات تھے مگر نہرو نے کبھی ایسا کرنا مناسب نہ سمجھا۔ نہرو "ہندو" کو ملک کا بہترین اخبار اور اس کے رپورٹروں کو ملک کے بہترین رپورٹر سمجھتے تھے مگر ان کے بقول ہندو معاشی معاملات میں ذرا رجعت پسندی کا مظاہرہ کرتا تھا۔ اس کے باوجود نہرو کی ہدایت تھی کہ ہر شام ان کے مطالعے کے لئے "ہندو" فراہم کیا جائے نہرو ایس ملگوکر کو ملک کا موثر ترین صحافی تصور کرتے تھے۔ ملگوکر نے متعدد بار نہرو جی کی پالیسیوں پر نکتہ چینی بھی کی مگر چینی حملے کے بعد جب نہرو کو ملک کے اندر اور بیرون ملک حکومت کی پبلسٹی کو بہتر بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی ان کی نظر انتخاب ملگوکر پر ہی پڑی۔ ملگوکر نے بعض شرائط پر حکومت کی مدد کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا مگر نہرو حکومت کے ڈھانچہ کی بدولت یہ شرائط پورا کرنے کے قابل نہ تھے چنانچہ بات نہ بن سکی۔

۱۹۵۲ء میں نہرو وزارت اطلاعات کے لئے کسی ممتاز صحافی کے متلاشی تھے۔ انہوں نے بی شیوا راؤ کو دعوت دی کہ وہ وزیر مملکت کی حیثیت سے کابینہ میں شامل ہو جائیں انہیں وزارت اطلاعات و نشریات کا انچارج بنا دیا جائے گا۔ شیوا راؤ نے گوپال سوامی آئنگر کی وساطت سے کوشش کی کہ اسے وزیر کی حیثیت سے لیا جائے۔ اس پر نہرو کو بڑا غصہ آیا انہوں نے بی۔ وی۔ کیسکر کو وزیر اطلاعات بنا دیا۔ ایک صحافی جو نہرو کے اعصاب پر سوار تھا وہ گاندھی تھا۔ وہ طویل صحافتی زندگی کے بعد ہندوستان

ٹائمز کا ایڈیٹر مقرر ہوا۔ نہرو کو معلوم ہوا کہ جب درگا داس اسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا میں تھا تو اس کا تعلق وزارت داخلہ کے انٹلی جنس کے شعبے سے بھی تھا۔ درگا داس ابوالکلام آزاد، سردار پٹیل اور پنت کا بہت منہ چڑھا تھا اس نے کوشش کی کہ اسے دستور ساز اسمبلی کا رکن منتخب کر لیا جائے پنت نے اسے یوپی سے کانگریس کا امیدوار کھڑا کرنے کی سفارش بھی کی مگر نہرو نے امیدواروں کی فہرست سے اس کا نام کاٹ دیا اس پر درگا داس نہرو کا سخت مخالف ہو گیا۔ اس نے "انصاف" کے قلمی نام سے نہرو اور اندرا کے خلاف لکھنا شروع کر دیا تاکہ ان کی شہرت کو نقصان پہنچایا جا سکے۔

ایک دن نہرو نے درگا داس کو بلایا اور اس سے سخت سے باز پرس کی۔ بعد میں نہرو نے مجھے بتایا کہ انہوں نے داگا داس سے کہا تھا کہ میں نے تم جیسا کمینہ شخص آج تک نہیں دیکھا۔ اس کے بعد درگا داس کچھ دیر کے لئے خاموش رہا مگر کتے کی دُم کی طرح جسے بانس میں ڈال کر رکھا گیا تھا مگر وہ سیدھی نہ ہو سکی کچھ عرصہ بعد ہی درگا داس پھر کمینگی پر اُتر آیا۔ ایک دن نہرو نے ہندوستان ٹائمز میں درگا داس کا ایک مضمون دیکھا جس میں ان پر رکیک حملے کئے گئے تھے۔ انہوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ "تم گھنشام داس برلا (اخبار کے مالک) سے بات کرو اور پوچھو کہ کیا یہ مضمون اس کے نظریات کا آئینہ دار ہے برلا نے مجھے بتایا کہ میں عام طور پر ہندوستان ٹائمز کے ادارتی معاملات میں مداخلت نہیں کرتا مگر میں درگا داس کا کام جو وہ انصاف کے نام سے لکھتا ہے دیکھ رہا ہوں اور یہ کالم نرد صحافت کی سرحدوں کو چھو رہا ہے۔ میں نے درگا داس سے کئی بار اس سلسلے میں بات کی ہے اور آج میں اس سے قطعی بات کرنے والا ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے درگا داس سے چھٹکارا حاصل کرنے کا پروگرام بنا لیا ہے اور ہندوستان ٹائمز کے ایڈیٹر کے طور پر ملگوکر کو مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ اگلے دن درگا داس اپنے سرپرست "پیر" ابوالکلام آزاد کے پاس گیا مولانا آزاد نے برلا سے بات کی تو اس نے مولانا کو بتایا کہ میں نے اس سے شکایت کی تھی، لہٰذا مولانا کو مجھ سے بات کرنی چاہیئے۔ مولانا کو علم تھا۔ کہ میں اپنی بات سے کبھی پیچھے ہٹنے والا نہیں ہوں۔ چنانچہ اس نے وزیر اعظم سے بات کی مگر نہرو خاموش رہے برلا نے درگا داس کو برطرف کر دیا اور اس طرح "انصاف" اپنی موت مر گیا مگر اس کی راکھ سے

ایک ہفتہ وار ڈائری "انقا" پیدا ہو گئی

بھلت میں ان دنوں صحافت کی ایک نئی قسم پیدا ہوئی ہے۔ میں اسے "چابی کے سوراخ کی صحافت" کہوں گا۔ جس طرح چابی کے سوراخ سے پورا کمرہ نظر نہیں آتا اسی طرح یہ صحافی بھی پوری طرح دیکھے بغیر جو انٹ شنٹ چاہیں لکھ دیتے ہیں۔ اس نوع کی صحافت کا ایک بہترین "نمونہ" حال ہی میں شائع ہونے والی ایک کتاب ہے۔ مجھے ایک دوست نے یہ کتاب بھیجی اس میں مجھے نہرو کا سیٹلو گرافر قرار دیا گیا ہے۔ میں نے کتاب کے مصنف کو لکھا کہ اسے یہ انمول اطلاع کہاں سے ملی مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میرا خیال تھا کہ "چابی کا سوراخ" مارکہ صحافی میں ضرور کچھ شائستگی ہو گی۔ مگر یہ میری بھول تھی۔ اس کتاب میں لاتعداد جھوٹ اور بے سر و پا مضحکہ خیز باتیں درج ہیں اور ان کا مقصد کسی نہ کسی کی ذات کو ملوث کرنا ہے۔ اس کتاب کا مقصد شمالی ہند میں نفرت کی لہر سے مفاد حاصل کرنا تھا میں کتاب پڑھتے پڑھتے سو گیا اور کتاب میرے ہاتھ سے فرش پر گر پڑی۔ صبح کو جب مہترانی میرے کمرے کی صفائی کے لئے آئی تو اس نے کتاب فرش سے اٹھا کر مجھ سے پوچھا "صاحب میں یہ کتاب چولہا جلانے کے لئے لے جاؤں" میرا دل چاہا کہ اسے کہوں کہ یہ بھی لے جاؤ اور یہ لو تیس روپے چولہا جلانے کے لئے ایک اور بازار سے خرید لینا۔ بالکل اسی طرح جیسے سیموئل جانسن سے کسی نے ایک پادری کی تدفین کے لئے ایک پونڈ چندہ مانگا تو اس نے دو پونڈ دیئے اور کہا کہ لو دو پادری دفن کر دو۔

آزادی کے شروع کے سالوں میں رام کرشن ڈالمیا نے اپنے اخبارات "ٹائمز آف انڈیا" اور "اسٹریٹڈ ویکلی" کے ذریعے حکومت سے طاقت آزمائی کی کوشش کی۔ اس نے نہرو کو تند و تیز تنقید کے لئے منتخب کیا اور وہ مقدس گائے اور بندر کو بھی اس میں گھسیٹ لایا۔ ظاہر ہے نہرو کو تو غصہ آنا ہی تھا مگر انہوں نے انتقامی کارروائی سے گریز کیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ یہ دونوں اخبار خریدنا بند کر دیا جائے کیونکہ وہ اس طرح گٹر پریس کی مالی اعانت نہیں کرنا چاہتے۔ اس کے بعد ٹائمز آف انڈیا اور اسٹریٹڈ ویکلی کا ایوان وزیر اعظم میں داخلہ بند کر دیا گیا۔ مگر ڈالمیا کی اس احمقانہ مہم جوئی کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اور اسے رد و ہو کر خاموش ہونا پڑا۔ انہی دنوں ڈالمیا کی احمقانہ مہم جوئی جاری تھی

"بٹلر نے اندرا کے بارے میں صفحہ اول پر توہین آمیز مواد شائع کر دیا جس میں الزام لگایا گیا تھا کہ اندرا نے کسی تاجر سے اَن گنت مہنگی ساڑھیاں حاصل کی ہیں۔ نہرو نے ممتاز وکیل کیلاش ناتھ کاٹجو سے مشورہ کیا اور بٹلر کے مدیر کو نوٹس دیا کہ وہ صفحہ اول پر نمایاں انداز میں معذرت شائع کرے یا پھر قانونی کارروائی کے لئے تیار ہو جائے۔ مدیر نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے معذرت شائع کر دی اور دوبارہ اس طرح کی کوئی حرکت نہ کی۔

برطانوی سیاست دان بیون بھارت آیا ہوا تھا اور راج کماری امرت کور کے ہاں مقیم تھا۔ اس دوران فرینک موریس نے ایٹمی انرجی کمیشن قائم کرنے پر نہرو کو ہدف تنقید بنایا اور کمیشن کو سفید ہاتھی قرار دیا۔ بیون نے میری توجہ اس طرف دلائی اور طنز سے کہا "یہ شخص آپ کا سب سے بڑا صحافی مانا جاتا ہے"۔ میں نے فوراً جواب دیا "یہ شخص تو اپنی ناک سے آگے دیکھ ہی نہیں سکتا۔ اور ایٹمی کمیشن تو اس کی کمزوری بن گیا ہے۔" بیون نے کہا کہ نہرو جو سب سے بڑا کام کر رہے ہیں وہ بھارت میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی ہے۔ بیون نے کہا کہ اک سیاست دان کو جس کا عوام سے رابطہ ہو پریس سے نہیں ڈرنا چاہیئے اللہ نے صرف صحافیوں کو ہی عقل سے نہیں نوازا نہرو اس بات سے آگاہ نہ تھے کہ بسا اوقات اخبارات کا یہ دعویٰ درست نہیں ہوتا کہ وہ رائے عامہ کے نمائندے ہیں ۱۹۴۸ء میں جب امریکہ کے صدر ٹرومین نے صدارتی انتخاب دوبارہ لڑنے کا اعلان کیا تو مک بھر کے اخبارات پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئے اخبارات میں بار بار شائع ہوتا رہا کہ ان کے سروے کے اعتبار سے رائے عامہ ٹرومین کے خلاف ہے۔ تمام اخبارات ڈیوی کی حمایت کر رہے تھے جو ری پبلک پارٹی کا امیدوار تھا۔ ٹرومین نے سب کو دھتا بتایا اور الیکشن جیت کر "امریکہ کے چھوٹے سے مگر عظیم صدر" کا خطاب پایا۔

باب ۲۰

نہرو پر ماحول کا اثر

ستمبر ۱۹۳۵ء میں نہرو جرمنی گئے۔ ان کی پیاری بیوی کملا نہرو بیمار تھی اور جرمنی میں زیر علاج تھی۔ اس دوران انہوں نے کچھ جرمن سیکھی تھی مگر بعد میں جو واقعات جرمنی میں پیش آئے نہرو کو ان سے شدید صدمہ ہوا اور وہ جرمن زبان بھول گئے۔ اکتوبر ۴۸ء میں نہرو نے امریکہ کا دورہ کیا۔ میں نہرو کے ہمراہ تھا۔ میں اپنے ساتھ نہرو کے پسندیدہ سگریٹ سٹیٹ ایکسپریس ۵۵۵ کا اتنا سٹاک لے گیا کہ دورانِ سفر نہرو کے لئے کافی رہے۔ مجھے علم تھا کہ امریکی سگریٹ زیادہ تیز ہونے کے باعث نہرو کے لئے موزوں نہیں ہوں گے۔ وائٹ ہاؤس پہنچ کر میں نے نہرو کے کمرے سے امریکی سگریٹ ہٹا دیئے اور ان کی جگہ سٹیٹ ایکسپریس کے سگریٹ رکھ دیئے۔ انہوں نے مجھے جب سگریٹ تبدیل کرتے دیکھا تو ناراض ہو گئے اور کہنے لگے "تمہیں معلوم نہیں کہ میں جہاں جاتا ہوں وہی چیزیں استعمال کرتا ہوں جو مقامی طور پر میسر ہوں۔" میں نے جواباً کہا "تو ٹھیک ہے۔ آپ امریکی سگریٹ آزما کر دیکھیں۔ اور یہاں کے ماحول سے مانوس ہو جائیں۔" یہ کہہ کر کہ میں نے انہیں چیسٹر فیلڈ کا سگریٹ دیا جو امریکی سگریٹوں میں نرم ترین ہے۔ انہوں نے سگریٹ مجھ سے چھین لیا۔ سلگایا اور پینا شروع کر دیا۔ ابھی دو کش ہی لئے ہوں گے کہ کھانسنے لگے، تب میں نے کہا جناب اسے پھینک دیجیئے۔ میں نے کئی سال امریکی سگریٹ پیئے ہیں اور میں اچھی طرح جانتا ہوں یہ آپ کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ آپ یہاں سرکاری دورے پر ہیں۔ آپ کو مسلسل تقریریں کرنا ہوں گی۔ امریکی سگریٹ پینے سے آپ کا گلا خراب ہو جائے گا۔

اور آپ بول نہ سکیں گے۔ انہوں نے میری طرف دیکھا مسکرائے اور سگریٹ پھینک دیا۔ دراصل نہرو میں بہت سے عادتیں بچوں کی سی تھیں اور مجھے بعض اوقات ان سے بچوں کا سا سلوک کرنا پڑتا تھا۔ نہرو کا امریکہ کا دورہ اس لحاظ سے ناکام رہا کہ نہرو امریکی قوم کا کوئی اچھا تاثر نہ لے سکے۔ مگر اس کے ذمہ دار بھی امریکی تاجر ہی تھے۔ نیویارک میں ایک لنچ کے دوران نہرو کو سنا کر کہا گیا کہ "یہ سو ڈالر کا لنچ ہے" نیویارک میں ہی ایک عشائیہ پر ایک امریکی تاجر نے تقریر کرتے ہوئے کہا "اس میز کے گرد ایک ارب ڈالر بیٹھے ہیں" نہرو جیسے نفیس اور شائستہ شخص کے ذہن پر ان باتوں کا اچھا نہیں ہو سکتا۔ ایک اور موقعہ پر نہرو کو اس طرح چڑایا گیا کہ جنرل موٹرز کمپنی کا سالانہ بجٹ بھارت کے بجٹ سے زیادہ ہے۔

امریکہ سے واپسی کے فوراً بعد میں نہرو کے ساتھ ناشتہ کر رہا تھا۔ اس روز کوئی اور گھر پر نہ تھا اور نہرو اکیلے تھے۔ اچانک انہیں امریکیوں کے خلاف بیان جاری کرنے کی سوجھی جس میں کہا گیا تھا "امریکی سمجھتے ہیں، وہ ملکوں اور براعظموں کو خرید سکتے ہیں" میں نے ان سے کہا کہ کیا آپ نیویارک کے چند واہیات تاجروں کے رویہ کی بنیاد پر پوری امریکی قوم کے رویہ کا تعین نہیں کر رہے ہیں نے کہا کہ میرے خیال میں امریکی بحیثیت مجموعی مہمان نواز اور دوست دار لوگ ہیں آپ بھی امریکی قوم کے بارے میں اسی طرح اظہارِ خیال کر رہے ہیں جس طرح وہ امریکی سیاح کرتے ہیں جو برصغیر میں پندرہ بیس دن گزارنے کے بعد گھر جا کر ایک عدد کتاب لکھ مارتے ہیں۔ نہرو میری بات سنتے رہے۔ انہوں نے سگریٹ سلگایا اور مجھے بھی پیش کیا مگر میں ان کی موجودگی میں کبھی سگریٹ نہیں پیتا تھا۔

نہرو سؤر کا گوشت نہیں کھاتے تھے۔ ڈنمارک سؤر کے عمدہ گوشت کے لئے مشہور ہے کیونکہ وہاں یہ جانور کریم نکلے ہوئے دودھ پر پالا جاتا ہے۔ نہرو نے بھی یہ بات سن رکھی تھی جب ہم ڈنمارک گئے تو نہرو نے ناشتے کے لئے انڈے اور سؤر کا گوشت لانے کا حکم دیا۔ اور اس سے ناشتہ کیا۔ جب ہم جاپان کے دورے پر گئے تو وہاں بھی نہرو نے سؤر کا گوشت کھانا چاہا۔ نہرو

نے سنا تھا کہ اوساکا (جاپان) میں سوروں کو انسانی خوراک بنانے کے نقطہ نظر سے پالا جاتا ہے۔ چنانچہ اوساکا میں قیام کے دوران انہوں نے یہ گوشت لانے کا حکم دیا مگر اس روز کی وجہ سے یہ گوشت بازار میں دستیاب نہ تھا چنانچہ نہرو کو مایوسی ہوئی۔ جاپان کے دورے میں نہرو ایک خاص قسم کی مچھلی جو کستورا مچھلی کہلاتی ہے، کا تالاب دیکھنے گئے۔ جاپان کے وزیر خارجہ ان کے ساتھ تھے۔ میزبان وزیر خارجہ نے نہرو کو مخصوص چٹنی کے ساتھ کچی مچھلی کھانے کی ترغیب دی۔ نہرو کچھ تامل کے بعد رضامند ہو گئے مگر ان کا یہ تجربہ کچھ پر لطف نہ رہا۔ بوڑھے جاپانی وزیر خارجہ فوجیاما نے ایک مخصوص طرز کے جاپانی ہوٹل میں نہرو کو عشائیہ دیا۔ یہاں گیشا (جاپانی طوائف) لڑکیاں مہمانوں کی خدمت پر مامور تھیں۔ اس دعوت میں صرف چار افراد شریک تھے۔ نہرو۔ فوجیاما، بھارت کے سیکرٹری جنرل وزارتِ خارجہ پلائی اور میں۔ ہم قالین پر بیٹھے۔ ہمارے عقب میں ایک ایک گیشا لڑکی تھی۔ میں اور نہرو ایک طرف تھے اور ہمارے سامنے پلائی اور فوجیاما تھے۔ روایت یہ ہے کہ گیشا لڑکیوں والی دعوت میں خواتین مدعو نہیں کی جاتیں۔ چنانچہ بے چاری اندرا دعوت میں موجود نہ تھی۔ نہرو نے اپنی گیشا گرل کو گود میں بٹھا لیا اور وہ کھانے پینے کی اشیاء نہرو کو اپنے ہاتھ سے کھلانے لگی۔ مقامی رواج کے مطابق نہرو بھی کبھی کبھار کوئی چیز گیشا گرل کے منہ میں ڈال دیتے تھے۔ اس پر پلائی شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا اور اس طرح شرما رہا تھا گویا وہ کوئی نئی نویلی دلہن ہو۔ نہرو میری طرف دیکھ کر کبھی کبھی مسکرا دیتے تھے۔

میں نے ایک مرتبہ نہرو سے کہا "اگر آپ نہرو نہ ہوتے تو برفانی پرندہ ہوتے" میں نے اس پرندے کا نام "پیڑمیگان" لیا۔ نہرو کا تجسس بڑھا۔ انہوں نے پوچھا یہ پیڑمیگان ہے کیا میں نے انہیں بتایا کہ یہ ٹنڈرا کے علاقے میں رہتا ہے۔ جب برف پڑتی ہے تو اس کا رنگ سفید ہو جاتا ہے۔ جب برف پگھلتی ہے تو اس کا رنگ براؤن ہو جاتا ہے اور اس طرح موسم کے ساتھ اس کے رنگ اس طرح بدلتے ہیں کہ اسے اپنے دشمنوں سے چھپنے میں آسانی ہو۔ اس پر نہرو بہت محظوظ ہوئے اور پوچھا کہ میں نے یہ معلومات کہاں سے حاصل کی ہیں۔ میں نے نہرو سے کہا کہ میں جانوروں

قدرتی مناظر نباتات اور مختلف خطوں کے بارے میں کتابیں پڑھتا رہتا ہوں۔ اس کے بعد نہرو بھی مجھ سے ایسی کتابیں لے کر پڑھتے رہے وہ کتاب کو سنبھال کر رکھتے اور مطالعے کے بعد واپس کرنا کبھی نہ بھولتے۔

ایک مرتبہ نہرو مجھ سے ناراض ہو گئے۔ حالانکہ میرا قصور نہ تھا۔ ہوا یہ کہ نہرو کیرالا کے دورے پر تھے۔ کالی کٹ سے انہوں نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو ایک طویل خط لکھا جس میں کھانے کے بارے میں شکایت تھی۔ نہرو نے لکھا تھا کہ یہاں کھانا اس طرح ملتا ہے جیسے ریلوے سٹیشنوں کے ریفریشمنٹ روم میں ہوتا ہے کبھی اچھا تو کبھی نہایت خراب۔ پھر یہاں میرے کھانے میں کئی کئی قسم کے گوشت ہوتے ہیں اور جب میں پوچھتا ہوں یہ سب کیا ہے تو کہا جاتا ہے۔ "جناب سب کچھ ہدایات کے عین مطابق ہوا ہے" پھر میرے کھانے کے لئے ہوٹلوں سے انتظام کرایا جاتا ہے۔ میں گوشت کھاتا ضرور ہوں مگر اتنا نہیں جتنا یہاں سمجھا جا رہا ہے۔ خدا معلوم کس نے یہ کہہ دیا ہے کہ میں پرلے درجے کا گوشت خور ہوں" جب نہرو دلی واپس آئے تو وہ بڑے گرم تھے۔ انہوں نے غصہ میں مجھ سے پوچھا "یہ احمقانہ ہدایات کس نے جاری کی تھیں" میں نے انہیں بتایا کہ پدماجا نائیڈو (سروجنی نائیڈو کی بیٹی) نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمام صوبوں میں گورنر ہاؤس اور وزیر اعظم ہاؤس کو ہدایات جاری کروں کہ آپ کے دورے پر کھانے پینے کی کونسی اشیا پیش کی جائیں۔ ان میں فالسے کا جوس بھی شامل تھا جس کا نام بھی جنوبی ہند میں کوئی نہیں جانتا چونکہ میں اپنے امور میں عورتوں کی مداخلت پسند نہیں کرتا میں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور اسے بتایا کہ آپ کی منظوری کے بغیر ایسی کوئی بات کرنا مناسب نہیں۔ اس وقت تو پدماجا خاموش رہی۔ مگر بعد میں اس نے کسی پی اے کے سر پر سوار ہو کر ایک سرکلر جاری کرا دیا جو خود اس نے اپنے ہاتھ سے تحریر کیا تھا۔ مگر مجھے اس کا کوئی علم نہ تھا۔ جب آپ کا نوٹ ملا تو میں نے فوراً ہی سابقہ سرکلر منسوخ کرتے ہوئے آپ کی تجاویز پر مشتمل نیا سرکلر جاری کر دیا ہے۔" اس پر نہرو نے کہا "پدماجا بعض معاملات کو خوبی سے نمٹاتی ہے مگر وہ یورپی یادیں

کھانوں کی افادیت کو نہیں سمجھتی"

نہرو گرد و پیش کے ماحول سے جلد ہی متاثر ہو جاتے تھے اور اس کا برملا اظہار کر دیتے تھے جو بعد میں پریشانی کا موجب ہوتا۔ مثلاً جب وہ روس کے دورے پر گئے تو وہاں ان کا زبردست استقبال ہوا۔ واپسی پر انہوں نے ایک بیان میں کہا کہ "میں اپنا آدھا دل ماسکو میں چھوڑے جا رہا ہوں۔" اس طرح چین کے دورے سے بھی وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ "ہندی چینی بھائی بھائی" کے نعرے کی ذاتی طور پر حوصلہ افزائی کرتے رہے (یہ نعرہ نہرو کی زندگی میں ہی "ہندی چینی بائی بائی" میں بدل گیا تھا)

چین کو تبت پر قبضہ کئے کچھ ہی دن گزرے تھے کہ ایک شام کو جواہر لال نہرو اور کرشنا مینن میرے مطالعے کے کمرے میں آئے۔ دونوں چین کی باتیں کر رہے تھے۔ نہرو نے کرشنا مینن سے کہا کہ ہندوستان اور چین تین ہزار سال سے پُر امن طور پر زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ دونوں ممالک میں بنی رہے گی۔ اس پر میں نے کہا کہ میں تاریخ کے مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ چین جب کبھی مستحکم ہوا، اس نے توسیع پسندی کا ثبوت دیا۔ نہرو کے ماتھے پر تیوڑیاں پڑ گئیں اور کرشنا مینن سنجیدہ ہو گیا مگر میں نے بات پوری کرتے ہوئے کہا کہ خدا کرے آپ دونوں تاریخ کی اس حقیقت کو دیکھ سکیں کیونکہ ماضی کی نسبت چین اب پھر کافی مضبوط ہے۔ اور ان دونوں نے دیکھا کہ چین نے کس طرح بھارت پر حملہ[1] کیا۔ بعد ازاں دونوں لیڈر عام جلسوں میں وہی بات کہتے رہے جو میں نے کہی تھی۔

---

[1] بھارت پر حملہ چین نے نہیں کیا تھا۔ حملہ آور بھارت تھا۔ خود پنڈت نہرو نے کلکتہ میں بیان دیا تھا کہ "میں نے بھارتی فوج کو حکم دیا ہے کہ چینی فوجوں کو واپس ان کے علاقوں میں دھکیل دو" نہرو کے اس بیان سے ہی دنیا کو علم ہوا کہ بھارت اور چین میں جنگ چھڑ گئی ہے۔ اس جنگ میں بھارت کو شکست ہوئی اور چین نے نہ صرف از خود جنگ بند کر دی بلکہ بھارتی جنگی قیدی اور بھارت سے چھینا ہوا اسلحہ بھی صاف کر کے واپس کر دیا تھا۔ (مترجم)

نہرو حالات کے اچھے جج نہ تھے۔ جب برصغیر کی تقسیم کا فیصلہ ہو گیا تو ہم لاہور گئے جہاں نہرو دیوان رام لال کے ہاں مقیم ہوئے۔ ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے نہرو نے کہا "جب تقسیم عمل میں آجائے گی تو دونوں فریق اپنے اپنے علاقہ میں امن و امان برقرار رکھیں گے"۔ سچ اخبار نویس ان کے اس خیال سے متفق نہ تھے۔ انہوں نے نہرو سے بار بار پوچھا "آپ کس بنیاد پر ایسا کہتے ہیں"۔ نہرو نے مختصر جواب دیا "میں چالیس سال سے عوامی زندگی میں ہوں" مگر ہم سب نے دیکھا کہ تقسیم کے بعد نہرو کے مغرورنہ کی دھجیاں ہوا میں بکھر گئیں۔ نہرو سپین گئے اور کچھ دیر بعد یورپ میں ان کی ملاقات نمبیار سے ہوئی۔ نمبیار نے نہرو سے پوچھا "آپ کے خیال میں سپین کی خانہ جنگی میں فتح کس کی ہو گی۔ جنرل فرانکو کی یا جمہوریت پسندوں کی" نہرو فوراً بولے "وہاں ری پبلکن جیت جائیں گے"۔ اس پر نمبیار نے کہا "آپ بھی برطانیہ کے لبرل لیڈروں، یورپ، امریکہ اور کرشنا مینن کی طرح خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ اگرچہ مجھے بھی یہ پسند نہیں مگر مجھے معلوم ہتا ہے کہ سپین میں ری پبلکن شکست فاش سے دوچار ہوں گے اور فرانکو فاتح بن کر ابھرے گا"۔ اس پر نہرو نمبیار سے حسب معمول ناراض ہوئے مگر دنیا جانتی ہے۔ سپین میں کیا ہوا۔

باب ۲۱

نہرو اور "لکشمی دیوی"

جب میں فروری ۱۹۴۶ء میں الہ آباد گیا اور نہرو کے ساتھ کام شروع کیا تو ان کے مالی معاملات کی دیکھ بھال بچھراج اینڈ کمپنی بمبئی کے سپرد تھی۔ یہ فرم گاندھی جی کے قریبی ساتھی سیٹھ جمنالال بجاج کی تھی۔ کوئی دو ماہ بعد میں نہرو کے ساتھ بمبئی گیا تو انہوں نے مجھے بچھراج اینڈ کمپنی میں جا کر اپنے مالی معاملات کی چھان بین کرنے کو کہا۔ کچھ عرصہ بعد نہرو کے ایما پر یہ کام میں نے خود سنبھال لیا اور نہرو کے اثاثے بچھراج اینڈ کمپنی سے واپس لے لئے گئے۔ نہرو کو اپنے والد سے خاصے بڑے اثاثے ملے تھے۔ پھر ان کی کتابوں کی رائلٹی بھی تھی جو کرشنا مینن نے شائع کی تھیں۔ کرشنا مینن کو پوری برطانوی سلطنت اور یورپ میں نہرو کی کتابیں شائع کرنے کے حقوق حاصل تھے۔ امریکہ کے لئے پبلشر الگ تھا ۲ر دسمبر ۴۶ء کو عبوری حکومت میں عہدہ سنبھالتے ہی نہرو نے اپنے موروثی گھر اور بنک میں موجود رقوم کے سوا تمام اثاثے ہندوستان کو دے دیئے۔ ان کی مالیت ڈیڑھ لاکھ روپے تھی۔ جب ان کی کتاب "ڈسکوری آف انڈیا" اشاعت کے لئے تیار ہو گئی تو بھارت میں اس کتاب کی اشاعت کے حقوق کرشنا مینن سے واپس لے لئے گئے۔ اس سے نہرو کو کافی رقم رائلٹی میں ملی۔

جب رائلٹی کی رقم میں اضافہ ہوا تو نہرو نے اندرا کو رقوم منتقل کرنا شروع کر دیں۔ وہ کبھی کبھار کملا نہرو میموریل ہسپتال کو بھی رقوم دیتے رہتے تھے۔ انہوں نے اپنے دونوں نواسوں کے نام پر پچیس پچیس ہزار روپے بھی چھوٹی بچتوں میں لگائے۔ مجھے اس بات پر سخت افسوس

ہوا کہ نہرو نے اپنے دو ملازموں ایس۔ ڈی اپادھیہ اور ہری کے لئے جنہوں نے نہرو اور ان کے والد کی برائے نام تنخواہ پر سالوں خدمت کی تھی، کوئی بھیل نہ بنائی۔ تاہم بعد میں محکمہ انکم ٹیکس سے رائلٹی پر ریفنڈ لیا گیا جس کے قانون کے مطابق نہرو حقدار تھے۔ اس رقم سے خاصی بڑی رقم ان دونوں ملازموں کو دے کر اس غلطی کی تلافی کر دی گئی۔

روس میں جب خروشیف برسر اقتدار تھا تو بھارت میں روسی سفیر نے نہرو سے ان کی کتابیں روسی زبان میں شائع کرنے کی اجازت طلب کی۔ نہرو رضامند ہو گئے اور مجھ سے اس کا ذکر کیا چنانچہ میں نے وزارتِ خارجہ کے سیکرٹری جنرل سے کہا کہ وہ روسی سفیر کو بتائیں کہ اس معاملے میں ماسکو کوئی تجویز بھیجنے سے قبل وہ مجھ سے بات کر لیں۔ روسی سفیر پیغام ملتے ہی مجھ سے ملنے آگیا میں نے روسی سفیر کو بتایا کہ ہم نہرو جی کی کتابوں پر مجموعی قیمت کا پندرہ فیصد رائلٹی لیتے ہیں اور رائلٹی کی رقم بھارتی روپے میں وصول کی جاتی ہے۔ سفیر اس پر رضامند ہو گیا اور کہا کہ نہرو کے لئے روس یہ رعایت دینے کو تیار ہے۔ روس میں عام دستور یہ ہے کہ جس مصنف کی کتاب روس میں شائع ہو اسے رائلٹی روس ہی میں ادا کی جاتی ہے اور وہ یہ رقم روس سے باہر لے جانے کا مجاز نہیں ہوتا۔ میں نے نہرو سے کہا کہ آپ کے پاس اگر کمیونسٹ ملکوں کا کوئی سفیر کتابوں کے سلسلے میں آئے تو آپ اسے میرے ساتھ معاملہ کرنے کو کہیں چنانچہ چین اور مشرقی یورپ کے متعدد ملکوں کے سفیروں سے میں نے اسی قسم کا معاملہ طے کیا۔ چند سال کے دوران ہی نہرو کو مغربی ملکوں سے موصول ہونے والی کل رائلٹی سے زائد رقم ان کمیونسٹ ممالک سے مل گئی اس کے نتیجے میں اندرا، کملا، نہرو میموریل ہسپتال اور نہرو خاندان کے ملازموں کو کافی بڑی بڑی رقوم ملتی رہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اندرا گاندھی کا نام وزارتِ عظمیٰ ختم ہونے کے بعد بھی، دنیا میں زندہ رہے گا اور اندرا کی یہ زندگی اس کے والد کے قلم کی مرہونِ منت ہے مگر اپنی وزارتِ عظمیٰ کے دور میں اندرا نے خود کو اپنے والد سے بھی بلند تر کرنے کی جو کوششیں کی ہیں وہ بڑی دلچسپ تھیں۔

بے چاری اندرا۔ در اصل سب عورتوں کو ہی چکا چوند پسند ہے۔

۱۹۵۹ء میں استعفا دینے کے بعد میں تین ماہ کے لئے لندن اور ماسکو جانا چاہتا تھا۔ نہرو جی کو علم تھا کہ میرے پاس زرِ مبادلہ نہیں ہے۔ انہوں نے ماسکو میں بھارتی سفیر اور لندن میں اپنے ایجنٹ کو لکھا کہ ایم او متھائی کو جتنے زرِ مبادلہ کی ضرورت ہو یا وہ جتنی رقم طلب کرے میری رائلٹی سے اسے یہ رقم ادا کر دی جائے۔ نہرو نے اس خط کی نقل مجھے بھی بھیجی۔ میں نے نہرو جی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انہیں لکھا کہ ماسکو اور لندن میں میرا قیام دوستوں کے ساتھ ہوگا۔ مجھے کوئی خریداری بھی نہیں کرنا ہے۔ میری زرِ مبادلہ کی ضروریات صرف دو مرتبہ بال کٹوانے تک محدود ہوں گی۔ جس کے لئے میرے میزبان ادائیگی کرنے میں مسرت محسوس کریں گے۔ میں نے آج تک آپ سے ایک پیسہ نہیں لیا اور مجھے آئندہ بھی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس اقدام کے لئے آپ کا شکر گزار رہوں گا۔

نہرو جب وزیر اعظم تھے، بلکہ اس سے پہلے بھی، انہوں نے کبھی کسی سے رقم کی سفارش نہیں کی تھی خواہ یہ رقم کسی عظیم رفاہی کام کے لئے ہی کیوں نہ درکار ہو۔ قطع نظر اس کے کہ دینے والا کون ہے یا عطیہ دینے کی وجہ کیا ہے انہوں نے نقد عطیات وصول کرنے سے ہمیشہ انکار کیا۔ مجھے افسوس ہے کہ ان کے تمام جانشینوں نے اس طریقِ کار پر عمل نہیں کیا۔ ان کا طریقِ کار یہ تھا کہ وہ اعلیٰ مقاصد کے لئے عوام سے اپیل کیا کرتے تھے۔ یا پھر انہیں سرِ عام روپے کی جو تھیلیاں پیش کی جاتی تھیں وہ قبول کر لیا کرتے تھے مگر وہ اس امر کا بے حد خیال رکھتے تھے کہ اس طرح حاصل کی گئی رقم میں سے ایک پائی بھی ان کی ذات پر صرف نہ ہو۔ لیکن جب کوئی شخص کانگریس پارٹی یا کسی ایسے مقصد کے لئے رقوم جمع کرتا جس میں نہرو جی دلچسپی لیں، تو وہ اعتراض نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے طریقِ کار سے ہٹ کر بھی عمل کیا۔ جب سر سٹفورڈ کرپس کا انتقال ہوا تو لندن میں ایک کمیٹی قائم کی گئی۔ اس کمیٹی نے نہرو سے درخواست کی کہ کرپس کی یادگار کے لئے بھارت سے چندہ جمع کیا جائے۔ نہرو نے بڑے تامل اور سوچ بچار کے بعد نظام حیدر آباد اور جام صاحب نوانگر کو لکھا کہ وہ پانچ پانچ ہزار روپے کے عطیات دیں اور یہ رقم لندن بھیج دی گئی۔

بھارت کے پہلے عام انتخابات کے موقع پر نواب بھوپال نے مسز وجے لکشمی پنڈت کے ذریعے نہرو کو پچاس ہزار روپے کا ایک چیک ارسال کیا۔ یہ رقم اگر واپس کی جاتی تو نواب صاحب کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی۔ چنانچہ نہرو نے یہ چیک لال بہادر شاستری کے سپرد کر دیا جو ان کی الیکشن مہم کا انچارج تھا۔

۱۹۴۶ء میں جب شرنارتھی دہلی آنا شروع ہوئے تو نہرو روزانہ جیب میں دو سو روپے رکھا کرتے تھے۔ اور شرنارتھیوں اور دوسرے حاجتمندوں میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ بسا اوقات وہ دو سو روپے صرف کر کے مجھ سے بھی رقم حاصل کرتے۔ میں کہاں تک رقم فراہم کرتا۔ میں نے نہرو جی سے کہا کہ ان کا یہ طریقہ ٹھیک نہیں اور انہیں روزانہ رقم دینا بند کر دی۔ اس پر انہوں نے سیکورٹی کے عملہ سے ادھار لے کر لوگوں کو دینا شروع کر دیا۔ میں نے ان سب کو بھی بند کیا کہ وہ وزیر اعظم کو دس بیس روزانہ سے زیادہ ادھار نہ دیں۔ اس دوران میں نے انتظام کر دیا کہ وزیر اعظم کے امدادی فنڈ سے کچھ رقم روزانہ نکلوائی جائے اور نہرو کے ایک پرائیویٹ سیکرٹری نہرو جی کے احکام کے مطابق ضرورتمندوں میں یہ رقم تقسیم کریں۔ نہرو اپنی ذات پر خرچ کرنے میں تو کنجوسی کی حد تک محتاط تھے مگر گاندھی جی تصویر پانچ پانچ ہزار روپے میں بھی خرید لیا کرتے تھے۔

نہرو کا انتقال ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کو ہوا۔ اس وقت ان کی کل کائنات الٰہ آباد میں ان کا آبائی مکان اور بنک میں اتنی رقم تھی جس سے ان کا پراپرٹی ٹیکس ادا کیا جا سکے۔ مالی معاملات میں وہ رائے عامہ سے بہت ڈرتے تھے۔ اس معاملے میں وہ سردار پٹیل سے بالکل مختلف تھے۔ ایک معاملہ میں تو وہ رائے عامہ سے مضحکہ خیز حد تک ڈرے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اس پر مجھے بڑی ہنسی آئی۔ نہرو سنجیدہ ہو گئے اور بولے "بھلا تم کیوں ہنس رہے ہو" میں نے انہیں رائے عامہ کے بارے میں ایک کہانی سنائی۔

"جب لائیڈ جارج برطانیہ کے وزیر اعظم تھے تو ماسکو میں برطانوی سفیر نے روسی وزیر خارجہ شیچر ان کو چائے پر مدعو کیا۔ چائے کے ساتھ ساتھ گفتگو بھی جاری تھی۔ برطانوی سفیر نے کہا کہ ہمارے

وزیر اعظم کو بڑی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ انہیں ہر اہم معاملہ پر رائے عامہ کو اعتماد میں لینا پڑتا ہے۔ اس کے مقابلے میں روسی حکومت کی پوزیشن زیادہ آسان ہے۔ اسے رائے عامہ جیسے کھڑاگ کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔" "آپ کی بات درست نہیں" روسی وزیر خارجہ نے برطانوی سفیر کو ٹوکا۔ "روسی حکومت کو بھی رائے عامہ کو اعتماد میں لینا پڑتا ہے مگر اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ رائے عامہ کی کس انداز میں تہذیب و تشکیل کرتے ہیں۔" روسی وزیر خارجہ کی بات ابھی جاری تھی کہ ایک بلی میاؤں میاؤں کرتی ہوئی دعوت کے کمرے میں آ گئی۔ روسی وزیر خارجہ نے بلی کو گود میں اٹھا لیا اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر اس نے ایک طشتری میں تھوڑا سا شہد ڈال کر اسے برطانوی سفیر کی طرف بڑھایا اور کہا "کیا آپ بلی کو یہ شہد کھلا سکتے ہیں" برطانوی سفیر نے طشتری میز پر رکھی اور وزیر خارجہ سے بلی کو پکڑا۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کا منہ طشتری کے قریب کر دیا مگر بلی نے ہلکی سی چھینک مار کر شہد کھانے سے انکار کر دیا۔ اس پر برطانوی سفیر نے کہا "اس سے تو میری بات کی تائید ہوتی ہے۔" روسی وزیر خارجہ مسکرایا اور سفیر کے ہاتھ سے بلی لے لی۔ پھر اس نے بلی کی دم کو شہد میں ڈبو کر بلی کو چھوڑ دیا۔ بلی اسی جگہ میز کے نیچے بیٹھ گئی اور اپنی دم سے شہد چاٹنے لگی تو روسی وزیر خارجہ نے کہا۔ "دیکھا آپ نے رائے عامہ سے نمٹنے کے کئی طریقے ہیں اگر کوئی چاہے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ یہ رائے عامہ وغیرہ سب ڈھکوسلا ہے۔"

نہرو میری بات غور سے سنتے رہے مگر وہ کچھ بولے نہیں۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ "اس کے بعد نہرو کے پاس کہنے کے لئے ہے بھی کیا۔"

باب ۲۲

جی۔ ڈی۔ برلا

۱۵ر دسمبر ۱۹۵۰ء کو سردار پٹیل کا انتقال ہو گیا۔ اس کے فوراً بعد سیٹھ گھنشام داس برلا نے مجھے فون کیا اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے کہا آجاؤ۔ میں ایوان وزیر اعظم میں اپنے مطالعے کے کمرے میں تھا۔ میں پہلی بار برلا سے ملا تھا۔ حالانکہ وہ میری وساطت سے وزیر اعظم کو اپنے باغوں کے پھل بھیجتا رہتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وزیر خزانہ اس کے درپے ہے اور اس کی فرموں کو ان چندوں پر بھی ٹیکس دینے پر مجبور کیا جا رہا ہے جو اس نے گذشتہ پانچ سال کے دوران کانگریس کو جدوجہد آزادی کے لئے دیئے تھے۔ یہ ٹیکس خان لیاقت خان کے دور کے قائم کردہ ایک تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ کی بنا پر عاید کیا جا رہا تھا۔ خان لیاقت علی خان عبوری حکومت میں وزیر خزانہ تھے۔ دیش مکھ کو یہ اندازہ نہیں کہ ہم نے کانگریس کو یہ چندہ کن حالات میں دیا تھا کیونکہ وہ تو انگریز کی نوکری کرتے رہے ہیں۔ عملی طور پر یہ چندہ گاندھی جی اور سردار پٹیل کے ایما پر دیا جاتا تھا۔ برلا نے کہا کہ "میرے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے جس کا مجھے دلی رنج ہے۔ پنڈت جی سے میرے تعلقات اتنے قریبی ہیں۔ اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟" میں نے سیٹھ برلا کو کہا کہ نہرو کا کانگریس کے لئے فنڈز کی فراہمی سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ آپ مولانا آزاد کے پاس جائیں اور انہیں صورت حال سے آگاہ کریں۔ مجھے یقین ہے کہ مولانا ضرور وزیر اعظم کے نوٹس میں یہ معاملہ لائیں گے۔ ادھر میں نے وزیر اعظم کو بھی برلا سے اپنی ملاقات کے بارے میں بتا دیا۔

برلا آزاد سے ملا اور مولانا نے پنڈت نہرو سے بات کی۔ وزیر اعظم نے برلا کو بلا بھیجا اور

برلا کی رام کہانی سنی۔ اس کے بعد وزیر اعظم اور وزیر خزانہ کے درمیان اس معاملہ پر کچھ خط و کتابت ہوئی۔ دیش مکھ نے پہلے تو سخت رویہ اختیار کیا۔ مگر جب وزیر اعظم نے اسے بتایا "کانگریس کو دیئے گئے چندے۔ کسی سیاسی جماعت کو "عطیہ" نہ سمجھے جائیں بلکہ یہ تصور کیا جائے کہ یہ عطیات ایک قومی تحریک کو دیئے گئے ہیں جو بیرونی حکمرانوں سے حصول آزادی کے لئے چلائی جا رہی تھی۔ میں کسی ایسے شخص کو سزا دینے میں فریق نہیں بن سکتا جس نے خود کو خطرے میں ڈال کر تحریک آزادی کی حمایت کی ہو" اس پر دیش مکھ نرم پڑ گئے اور برلا کے خلاف کارروائی رک گئی۔ وزیر اعظم نے مجھے بھی کہا کہ میں چاہوں تو برلا کو سب کچھ بتا دوں۔

ایک روز نہرو نے مجھے برلا سے اپنی ایک ملاقات کے بارے میں بتایا۔ یہ جھگڑا ۱۹۲۵ء کے موسم سرما میں ہوا تھا۔ ہوا یوں کہ نہرو نے گاندھی جی کو لکھا کہ وہ اپنے والد پر بار نہیں بننا چاہتے اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتے ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ وہ سارا وقت تو کانگریس کے لئے کام کر رہے ہیں۔ گاندھی جی نے ۱۳ر ستمبر ۱۹۲۴ء کو نہرو کو خط لکھ کر پوچھا "کیا میں آپ کے لئے کچھ رقم کا انتظام کر دوں یا آپ کو کوئی ملازمت دلا دوں۔ آپ کو اپنی کمائی پر زندہ رہنا چاہیئے خواہ آپ کی زندگی اپنے والد کے سایہ عاطفت میں ہی کیوں نہ گزر رہی ہو۔ کیا آپ کسی اخبار کے رپورٹر بننا پسند کریں گے یا کسی کالج میں پروفیسر بنیں گے۔" ۲۰ر ستمبر کو گاندھی جی کا ایک اور خط آیا جس میں پوچھا گیا تھا "اگر آپ چاہیں تو میں اپنے کسی دوست یا دوستوں سے کہہ کر آپ کو کچھ رقم دلا دوں۔ آپ قوم کی جو خدمت کر رہے ہیں اس کے پیش نظر میرے یہ دوست آپ کو رقم دے کر مسرت محسوس کریں گے۔ اگر آپ کی ضروریات زیادہ ہیں تو آپ کو کانگریس کے فنڈ سے بھی رقم دی جا سکتی ہے آپ چاہیں تو تجارت کر سکتے ہیں۔ مگر بہتر یہ ہے کہ آپ قومی خدمت کرتے رہیں اور آپ کے دوست آپ کی خدمات سے مستفید ہونے کے لئے آپ کو فنڈز فراہم کریں کوئی جلدی نہیں۔ آپ اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے والد آپ کے فیصلے پر معترض نہیں ہوں گے۔" گاندھی جی نے یقیناً اپنی خط و کتابت کا ذکر برلا سے کیا ہو گا۔ برلا الہ آباد گیا اور نہرو سے ملا۔ اس نے رُک رُک کر

گاندھی جی کی پیش کشوں کا ذکر کیا اور کہا کہ نہرو جی جو چاہیں انتظام ہو سکتا ہے۔ نہرو کو غصہ تو آیا مگر وہ پی گئے اور برلا سے کسی قسم کی مدد لینے سے انکار کر دیا۔ نہرو نے مجھے بتایا کہ برلا کے بارے میں ان کی رائے یہ تھی کہ وہ ایک سخی لیڈر ہے۔

۱۹۵۵ء کے اوائل میں ایک روز برلا میرے پاس آیا اور کافی دیر مجھ سے بات چیت کرتا رہا۔ اس نے کہا کہ اس نے پہلے عام انتخابات کے موقع پر کانگریس کے لئے چندہ دیا تھا اور اب بھی اگر پنڈت جی چاہیں تو میں صنعت کاروں سے رقم کا انتظام کر سکتا ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ نہرو کو ایسے کام میں براہِ راست ملوث کرنا درست نہ ہوگا۔ تاہم میں بعض دوسرے لوگوں اور پنڈت جی سے بات کر کے اسے بتاؤں گا۔ اس کے بعد میں نے ایک اجلاس بلایا جس میں ٹی ٹی کرشن مچاری، لال بہادر شاستری اور یو ایس مالیہ شامل تھے۔ میں نے انہیں برلا سے اپنی ملاقات کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہا کہ میں نے نہرو جی سے اس سلسلے میں بات کر لی ہے۔ اجلاس میں طے ہوا کہ برلا کی مدد سے کانگریس کے لئے مرکزی فنڈ اکٹھا کیا جائے۔ صوبائی کانگریس پارٹیاں خود فنڈ اکٹھا کریں مگر وہ بڑے صنعت کاروں کو نہ چھیڑیں۔ یہ بھی طے پایا کہ برلا سے کہا جائے کہ وہ کانگریس کے مرکزی فنڈ کے لئے ایک کروڑ پیسے فراہم کرے۔ دوسرے اجلاس میں برلا کو بھی طلب کر لیا گیا۔ اس نے بتایا کہ ایک کروڑ روپیہ فراہم کرنا ناممکن نہیں۔ مگر اس کے لئے وزیر اعظم کے نام پر علیحدہ اکاؤنٹ کھول دیا جائے۔

اب میں نے یہ انتظام کیا کہ کرشن مچاری، لال بہادر شاستری اور عالیہ کی میری موجودگی میں نہرو سے ملاقات ہو۔ تب میں نے وزیر اعظم کو بھی سب کچھ بتا رکھا تھا۔ یہ ملاقات ہوئی تو کرشن مچاری نے وزیر اعظم سے پوچھا کیا ان کے نام پر بنک اکاؤنٹ کھول لیا جائے۔ ابھی وزیر اعظم کچھ کہہ نہ پائے تھے کہ میں بول اٹھا "اس معاملے میں وزیر اعظم کا تحفظ کیا جانا چاہیئے۔ اس لئے اکاؤنٹ دو افراد کے نام پر ہو۔ میں نے وزیر اعظم کے ساتھ مرار جی ڈیسائی کا نام تجویز کیا۔ نہرو فوراً رضامند ہو گئے۔ بعد میں کرشن مچاری مجھ سے ناراض ہو گیا کیونکہ وہ مرار جی ڈیسائی کو کچھ نہیں سمجھتا تھا۔ ان دنوں مرار جی کانگریس کے خزانچی تھے مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ چندہ جمع ہونا شروع ہوا۔ بالآخر کانگریس کے مرکزی فنڈ

میں دو کروڑ پچیس لاکھ روپے جمع ہو گئے۔

نہرو الہ آباد کبھی کبھار ہی جاتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ جب الہ آباد سے واپس آئے تو وہ مغموم اور چڑچڑے سے تھے۔ میں نے اندرا سے پوچھا "بڑے میاں کو کیا ہوا ہے" اندرا نے بتایا کہ الہ آباد میں کانگریس کا دفتر جس عمارت (سوراج بھون) میں تھا، اس کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ کانگریس کا دفتر خود دہلی منتقل ہو گیا ہے مگر نہرو کو یہ غم ہے کہ اس عمارت کی مرمت کیسے کرائی جائے۔ کانگریس والوں نے جس بے حسی کا ثبوت دیا ہے نہرو کو اس سے شدید غم ہوا ہے اور بڑے میاں کا چڑچڑا پن اس کا نتیجہ ہے۔ اس عمارت کو بچوں کے قومی ادارے کے طور پر استعمال کیا جانا تھا۔ میں نے برلا سے بات کی تو اس نے فوراً اپنے ایک ٹرسٹ کے حساب سے ایک لاکھ روپے کا چیک کاٹ کر وزیر اعظم کو بھیج دیا۔ یہ چیک "سوراج بھون" ٹرسٹ کے نام تھا۔ اس پر وزیر اعظم بہت خوش ہوتے۔

اب ادھر کی سنئے۔ بچوں کے قومی ادارہ کی ڈائرکٹر شیام کماری خاں نے جب عمارت کی تزئین و مرمت کا تخمینہ بنوایا تو یہ دو لاکھ روپے بنا۔ نہرو کو یہ تخمینہ دکھایا گیا۔ میں نے برلا سے بھی اس کا ذکر کیا تو اس نے کسی تامل کے بغیر ایک لاکھ روپے کا ایک اور چیک لکھ دیا۔ مگر نہرو یہ چیک وصول کرنے پر رضامند نہ ہوئے وہ الٹا مجھ سے ناراض ہوئے کہ میں نے برلا کو دوبارہ تکلیف کیوں دی۔ مگر اتنا روپیہ کہاں سے آتا۔ میرے ایما پر برلا نے وہ چیک پھاڑ دیا اور بچوں کے قومی ادارے کے ٹرسٹ کے لئے ایک لاکھ روپے کا دوسرا چیک دے دیا۔ میں نے یہ چیک سیدھا شیام کماری خان کو بھجوا دیا۔ تین ماہ بعد وزیر اعظم کو اس کا علم ہوا مگر وہ خاموش رہے شاید وہ سمجھتے تھے کہ ایسے معاملات میں مجھے سرزنش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میں یہ بات ریکارڈ پر لانا ضروری سمجھتا ہوں کہ جب تک میں وزیر اعظم سے منسلک رہا برلا نے مجھے کبھی کوئی کام نہیں بتایا۔ بلاشبہ وہ ایک عظیم شخص ہے۔

ان دنوں دوسرے درجے کے سیاستدانوں میں بڑے صنعت کاروں اور تاجروں کو مطعون کرنا فیشن بن گیا ہے۔ مگر ان صنعت کاروں اور تاجروں میں بعض ایسے بھی ہیں جنہوں نے قوم کی تعمیر میں

اہم کردار انجام دیا ہے نعرے نہیں لگائے۔ یہ لوگ دوسرے درجے کے ان سیاستدانوں سے زیادہ عظیم ہیں۔ اگر کسی صنعت کار یا تاجر نے کوئی بے قاعدگی کی ہے تو حکومت اس کا محاسبہ کرتی رہے گی، سیاستدانوں کے چیخنے چلانے کا یہ کونسا موقع ہے!

۱۹۵۲ء کے بعد سے بلاناغہ ہر سال نہرو جی کی سالگرہ پر فی سال ایک ہزار روپے اور کل رقم میں مزید ایک روپیہ کے حساب سے چیک بھجوا کرتے تھے۔ یہ چیک عام طور پر وزیر اعظم کے ریلیف فنڈ میں چلے جاتے تھے جس سے طلباء، بیواؤں اور مصیبت کے مارے لوگوں کی امداد کی جاتی ہے۔

باب ۲۳

نہرو نے چٹکی لگائی

مجھ سے بہت سے لوگوں نے دریافت کیا ہے کہ آیا نہرو پیا کرتے تھے۔ میرا ہمیشہ ایک ہی جواب ہوتا تھا "جی ہاں پانی" تاہم وہ مرارجی ڈیسائی کی طرح اس معاملے میں اتنے متعصب بھی نہ تھے کہ شراب یا شرابی کو دیکھ کر کوسوں دور بھاگیں۔ میں نے صرف ایک بار انہیں چسکی لگاتے دیکھا ہے۔ یہ سوئٹزرلینڈ کے پہاڑی مقام برگن سٹاک کی بات ہے۔ ہم لندن سے یہاں پہنچے تھے اور یہاں یورپ میں متعین سفیروں کی کانفرنس طلب کی گئی تھی۔ لیڈی ماؤنٹ بیٹن کی فرمائش پر نہرو نے چاکی چپلن کو چند روز کے لئے مدعو کر رکھا تھا۔ انہوں نے مجھے ہدایت کی کہ میں ان کی عدم موجودگی میں چارلی کی آؤ بھگت کروں۔ اس سے مجھے سفیروں کی کانفرنس سے نجات مل گئی۔ چارلی چپلن کو نہرو کے مہمان کے طور پر ایک ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ چارلی حال ہی میں امریکہ سے واپس آکر سوئٹزرلینڈ میں آباد ہوا تھا۔ امریکہ میں اسے تلخ سیاسی اور ذاتی تجربات ہوئے۔ وہ امریکی شہری نہ بن سکا اور برطانوی پاسپورٹ پر ہی وہاں مقیم رہا۔ اس نے مجھے امریکہ میں اپنے تجربات کے بارے میں بتایا۔ وہ امریکیوں پر خوب برستا۔ اسے آئزن ہاور، ٹرومین اور تمام دوسرے امریکیوں سے شکایت تو کیا نفرت تھی مگر وہ صدر روزویلٹ کا بڑا مداح تھا۔ اس نے گریٹ گاربو سے اپنی ملاقات کا بھی بڑی گرمجوشی سے ذکر کیا اور بتایا کہ کس طرح جی جی نے اپنی ران کو چومنے کی اجازت دی تھی۔ میں نے چارلی کو بتایا کہ میں نے گریٹا گاربو کو نیویارک میں والڈروف ہوٹل کے پاس قطار میں کھڑے دیکھا تھا۔ وہ نہرو کی ایک جھلک دیکھنا چاہتی تھی چاکی بولا گریٹا گاربو محض کسی ملک کی حکومت کے سربراہ کو دیکھنے

کے لئے ایسی حرکت نہیں کر سکتی۔ نہرو بھارت کے وزیر اعظم کے علاوہ کچھ اور بھی ہیں۔

چارلی چپلن کا طریقِ گفتگو، انداز اور حرکات بہت دلچسپ اور نسوانیت لئے ہوئے تھیں اس کے دو روزہ قیام کے دوران میں نے کئی دلچسپ گھنٹے اس کے ساتھ گذارے ایک شام میں اور چارلی چپلن ہوٹل لاؤنج کے ایک خاموش سے کونے میں بیٹھے شیری (شراب کی ایک قسم جو عموماً خواتین پیتی ہیں) سے شغل کر رہے تھے کہ نہرو بھی آئے اور ہمارے پاس بیٹھ گئے۔ چارلی نے انہیں بھی شغلِ مے کی دعوت دی۔ نہرو نے انکار کیا اور کہا کہ وہ شراب نہیں پیتے اور انہیں تو شراب کے ذائقے سے ہی گھن آتی ہے۔ چارلی نے کسی خاتون کی طرح اصرار کیا اور شیری کے ایک گلاس کا آرڈر دے ڈالا۔ یہ خیال کر کے کہ چارلی کی دل شکنی نہ ہو۔ نہرو نے صرف ایک چسکی لگائی، ان کے چہرے پر شکن پڑ گئے اور انہوں نے گلاس ایک طرف رکھ دیا۔ چارلی پہاڑی علاقے میں کار کے سفر سے خوف زدہ تھا۔ واپسی پر اس نے نہرو کے ساتھ کار میں سفر کیا۔ نہرو راستے میں جینوار کے جہاں انہوں نے چارلی اور اس کی بیوی اونا کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا۔ چارلی ہمیشہ اپنی بیوی کی خوبصورتی کا ذکر کرتا رہتا تھا مگر دوران سفر وہ چوکڑی بھول گیا اور کار میں اس طرح بیٹھا رہا گویا اس نے بھوت دیکھ لیا ہو۔

جرمنی کے دورے کے دوران نہرو نے چانسلر ایڈ ناٹر اور ان کے رفقا کو جوابی دعوت دی۔ بھارتی سفیر نمبیار کی خواہش تھی کہ دعوت میں شراب بھی پیش کی جائے۔ اس نے وزارتِ خارجہ کے سیکرٹری جنرل سے بات کی۔ وہ دونوں میرے پاس بھی آئے اور مدد کے طلب گار ہوئے۔ میں نے نہرو سے بات کی۔ انہوں نے تو صاف جواب دے دیا۔ مگر میں نے اصرار کیا اور کہا کہ ہم بھارت میں نہیں ہیں کیا آپ مراجی کی طرح غیر ملکیوں کو خود ان کے ملک میں شراب پینے کی ممانعت کر سکتے ہیں۔ وہ شراب کے رسیا ہیں۔ اور دعوت میں انہیں شراب پیش نہ کرنا گویا عدم رواداری کا مظاہرہ ہوگا۔ البتہ تقریب میں موجود بھارتی شراب سے اجتناب کر سکتے ہیں۔ میری اس بات پر نہرو نے ایک لمحہ کے لئے کچھ سوچا اور بولے "نمبیار سے کہہ دو کہ وہ شیری، ہوسلے وائن اور رائن وائن پیش کر سکتا

ہے۔ ان کے علاوہ کوئی اور شراب دعوت میں پیش نہ کی جائے۔ ہاں نمبیار اور این آر پلائی شراب کو ہاتھ نہیں لگائیں گے" میں نے نمبیار اور پلائی کو نہرو کی ہدایت سے آگاہ کیا۔ وہ جزبز تو بہت ہوئے مگر حکمِ حاکم تھا۔ اس پر عمل درآمد کرتے ہی بنی۔

دہلی میں نہرو اہم شخصیتوں کو ایوانِ وزیر اعظم میں ٹھہرایا کرتے تھے مجھے یاد ہے۔ بیون، سلون لائیڈ۔ انتھونی ایڈن اور ہیرالڈ میکملن جب بھارت کے دورے پر آئے تو ایوانِ وزیر اعظم میں ٹھہرے تھے۔ ان کے دوران قیام وزارتِ خارجہ والے قسم قسم کی شراب کی بوتلیں ان کے کمرے میں رکھوا دیتے تھے اور شراب پیش کرنے کے لئے انگریزی بولنے والے ملازم بھی انہیں مہیا کئے جاتے تھے۔ مگر نہرو کے کھانے کی میز پر کبھی شراب پیش نہیں کی گئی۔

۱۹۵۵ء کے اوائل میں روس میں متعین بھارتی سفیر کے۔ پی این مینن نے مجھے چٹھی لکھی جس میں نہرو کے روسی دورے کے دوران، جو شروع ہونے کو تھا۔ شراب پیش کرنے کے بارے میں جھجکتے ہوئے کچھ کہا گیا تھا۔ میں نے یہ خط وزیر اعظم کو بھجوا دیا۔ انہوں نے اس پر مختصر سا نوٹ لکھ کر مجھے بھجوا دیا۔

نہرو کا نوٹ یہ ہے:-

"جہاں تک کے ایس پی مینن کے خط کا تعلق ہے آپ اس پر واضح کر دیں کہ ہماری طرف سے دی جانے والی کسی بھی دعوت میں، خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی، شراب ہرگز ہرگز پیش نہیں کی جائے گی۔ یہ بات اگر روسیوں کو ناگوار گزرے تو مجھے اس کا افسوس ہے مگر انہیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ہم کیسے رہتے ہیں اور ہمارے کام کرنے کا انداز کیا ہے۔ البتہ روسی ارکان حکومت کے اعزاز میں دی جانے والی دعوت میں روسیوں کو شیری، کوئی ہلکی شراب یا ووڈکا پیش کی جا سکتی ہے شیمپین کسی کو پیش نہ کی جائے گی۔ کسی بھارتی کو نہ تو شراب پیش کی جائے گی اور نہ ہی شراب پیئے گا۔ استقبالیہ تقریبات میں کسی قسم کی شراب پیش نہیں کی جائے گی۔ تم اسے بتا دو کہ ہم نے چین میں

بھی یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ شراب کے متعلق کوئی استثنا نہ تھا۔ ہم نے اس سلسلے میں حکومت چین کو پیشگی اطلاع دے دی اگر کسے ایس پی مینن چاہے تو وہ بھی روسیوں کو اس کی پیشگی اطلاع دے سکتا ہے۔"

باب ۲۴

سروجنی نائیڈو

سروجنی نائیڈو سے میری پہلی ملاقات دہلی میں ہوئی۔ اس کا قد بالکل چھوٹا اور منہ مینڈک کی طرح چوڑا تھا۔ اس نے اپنی بیٹیوں پدماجا اور لیلامنی سے میرے بارے میں سن رکھا تھا۔ وہ مجھ پر بہت مہربان تھی۔ اس کی رگ رگ میں حاکمیت بسی ہوئی تھی۔ میں نے اس طرح کی "نواب ٹائپ" خاتون نہیں دیکھی اور غالباً اتنی عمر کی کوئی ایسی خوش خوراک اور مٹھائیوں کی رسیا خاتون تو روئے زمین پر نہ ہوگی جیسی سروجنی تھی وہ دردمندوں کی مالک تھی۔ اس کی چھوٹی بہن اور اس کے خاوند نمبیار کے درمیان جب اختلافات بڑھے اور ان میں طلاق ہوگئی تو سروجنی نے نمبیار کی حمایت کی اور اپنی بہن کو جھوٹا ٹھہرایا۔ گاندھی جی کے ایما پر سروجنی نے اپنے بھائی ویریندر ناتھ چٹوپادھیا کے خلاف بیان جاری کر دیا جس میں اس کی دہشت پسندانہ سرگرمیوں کو نرم الفاظ میں ہدف تنقید بنایا گیا تھا۔ اس پر سروجنی کا والد سخت آگ بگولہ ہوا اور اس نے بقیہ زندگی اپنی بیٹی سے ملاقات تک نہ کی۔ جب اس کا والد بستر مرگ پر پڑا تھا، سروجنی اسے دیکھنے گئی مگر بڑے میاں نے سروجنی کو ملاقات کی اجازت نہ دی۔ سروجنی کو زندگی بھر اس کا افسوس رہا کہ وہ اپنے باپ کا آخری دیدار تک نہ کر سکی تھی۔

سروجنی، اس کا بیٹا سوریہ اور بیٹیاں پدماجا اور لیلامنی حیدرآباد (دکن) کی مخلوط ثقافت کی پیداوار تھیں۔ وہ تعصب سے قطعی بالاتر تھیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوؤں کی نسبت ان کا جھکاؤ مسلمانوں کی طرف تھا۔ ان کا نقطۂ نظر نوابانہ تھا۔ سروجنی کو ریاستوں کے شہزادوں خصوصاً

مسلم ریاستوں کے والیوں سے گہری ہمدردی تھی۔ اسے دربار لگانے اور گپ شپ کا بے حد شوق تھا۔ اسے پانیکر جیسے درباری پسند تھے جو ہر وقت اس کے قصیدے پڑھتے رہیں۔ اسے سوشلزم سے کوئی سروکار نہ تھا بلکہ وہ زندگی کی آسائشوں سے پیار کرتی تھی اور بڑی آزاد خیال خاتون تھی۔ ۱۹۴۶ء میں جب نہرو کانگریس کے صدر بنے تو گاندھی جی نے انہیں مشورہ دیا کہ سروجنی کو کانگریس کی مجلس عاملہ میں نامزد نہ کریں کیونکہ ان دنوں انگریزوں سے نہایت اہم مذاکرات متوقع تھے اور خدشہ تھا کہ باتونی عورت ہونے کے باعث سروجنی کوئی راز افشا نہ کر دے۔ نہرو نے اس کی جگہ کملا چٹو پادھیا کو ورکنگ کمیٹی کا رکن نامزد کر دیا۔ سروجنی سخت سیخ پا ہوئی مگر بعد میں خاموش ہو گئی۔ جب آزادی ملی تو عام خیال تھا کہ نہرو اسے کابینہ میں شامل کریں گے مگر اس کی بڑی عمر کے پیش نظر اسے یوپی کا گورنر بنا دیا گیا۔ وہ بہت عمدہ گورنر ثابت ہوئی مگر موت نے اسے مہلت نہ دی اور اس کا گورنری کا دور نہایت مختصر ثابت ہوا۔ ایک مرتبہ میں نہرو کے ساتھ لکھنؤ گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سروجنی نہرو کے بوڑھے ذاتی خادم ہری کا بڑا خیال رکھتی ہے۔ وہ اپنے اے ڈی سی کے ساتھ ہری کے کمرے میں گئی۔ اس کے ہاتھ میں مٹھائی کی پلیٹ اور اے ڈی سی کے ہاتھ میں پھلوں کی ٹوکری تھی۔ وہ دونوں چیزیں ہری کے کمرے میں پہنچا دی گئیں۔ سروجنی کے سوا کوئی اور گورنر اتنی عظمت کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس عظمت کی توقع سروجنی ہی سے کی جا سکتی تھی۔ وہ شاعرہ تھی اور فن خطابت کی ماہر۔ تصنع و تکلف سے بالکل آزاد مادرانہ شفقت لیے ہوئے جسے بلبل ہند کہا جاتا تھا۔ غالباً ایسی کامل اور عظیم خاتون اس ملک میں صدیوں بعد پیدا ہوئی تھی۔

باب ۲۵

راجکماری امرت کور

راج کماری امرت کور چھ بھائیوں کی اکلوتی بہن، ریاست کپور تھلہ کے حکمران خاندان کی چشم و چراغ تھی۔ وہ ۱۸۸۷ء میں پیدا ہوئی اور انگلستان میں تعلیم پائی۔ سینئر کیمبرج کے بعد وہ آکسفورڈ جانا چاہتی تھی مگر اس کی ماں نے شدید مخالفت کی چنانچہ اسے انگلستان سے واپس آ کر پیانو بجانے اور ٹینس کھیلنے پر اکتفا کرنا پڑی۔ وہ ٹینس کی عمدہ کھلاڑی تھی اور اس نے کئی ٹرافیاں جیتیں۔ راج کماری نے ایک مرتبہ مجھے بتایا کہ عالم جوانی میں وہ ہندوستان کی تین حسین ترین لڑکیوں میں سے تھی۔ دوسری دو اندرا کوچ بہار اور تانی راج واڑے تھیں۔ اسے ایک انگریز سے محبت ہو گئی مگر اس کے والدین خصوصاً ماں نے اسے ایک غیر ملکی سے شادی کرنے کی اجازت نہ دی۔ رفتہ رفتہ ماں سے راج کماری کی کش مکش میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس کا باپ اس صورت حال سے اگرچہ خوش نہ تھا مگر اس نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ البتہ اس کا بڑا بھائی اس کا حامی تھا اور وہ کبھی کبھار ماں کو بھی اس سلسلے میں ڈانٹ پلا دیتا تھا۔ مگر اس کا کوئی عملی فائدہ نہ ہوا بالآخر راج کماری کو آبائی گھر چھوڑنا پڑا اور وہ اپنے بھائی کرنل کنور شمشیر سنگھ کے پاس چلی آئی۔ راج کماری کو اپنے بھائی سے بے حد پیار تھا اور وہ عمر بھر اس کے ساتھ ہی رہی۔ وہ اپنے آبائی محل میں جو شملہ میں تھا۔ اس وقت گئی جب اس کی والدہ کا انتقال ہوا۔ ماں کے انتقال کے بعد وہ اپنے باپ کے پاس میزبان کی حیثیت سے رہی۔ وائسرائے، گورنر اور دوسرے حکام اکثر اس کے باپ کے مہمان ہوتے تھے۔ راج کماری نے ایک مرتبہ مجھے بتایا کہ "زندگی میں

مجھے صرف ایک ہی شخصیت سے نفرت ہوئی اور وہ میری ماں تھی" اس نے اپنی ماں کے بارے میں نہایت سخت الفاظ استعمال کئے۔

راج کماری نے کل ہند خواتین کانفرنس میں گہری دلچسپی لی جو برطانوی ہند میں بڑی فعال تنظیم تھی۔ وہ رفاہی کاموں کے لئے چندے جمع کرتی تھی اور لیڈی ارون کالج دہلی کے قیام میں اس کا بڑا ہاتھ تھا۔ یہ چوتھی دہائی کے وسط کی بات ہے کہ راج کماری امرت کور گاندھی جی کی سیکرٹری بنی۔ قبل ازیں گاندھی جی سے اس کی خط وکتابت تھی اور اس نے گاندھی جی کی کھڈی اور دیہی صنعتوں کی تحریک کے سلسلے میں شملہ اور نواحی مقامات پر کافی کام بھی کیا۔ راج کماری نے مجھے بتایا کہ گاندھی جی کے ساتھ ان کی جھونپڑی سیواگرام میں ٹھہرنا تو درد کی بات ہے۔ اس کے پورے خاندان نے جس میں اس کا پیارا بھائی کنور شمشیر بھی شامل تھا، گاندھی جی کے ساتھ اس کے میل جول کی بھی سخت مخالفت کی تاہم کچھ دیر بعد کنور شمشیر سنگھ نے مخالفت ترک کر دی بلکہ وہ خود بھی گاندھی جی کا غیر سرکاری طبی مشیر بن گیا اور گاندھی جی صحت کے سلسلے میں جو کچھ لکھتے تھے، کنور شمشیر سنگھ اس پر گاندھی جی کو مشورہ دیا کرتا تھا۔ فی الحقیقت راج کماری کو گاندھی جی کی قربت بہت کم عرصہ میسر آئی کیونکہ گاندھی جی اسے مختلف کاموں پر بھیج دیا کرتے تھے۔ ۱۹۴۲ء میں گاندھی جی گرفتار ہو کر جیل چلے گئے۔ ہندوستان چھوڑ دو تحریک کے دوران راج کماری بھی پنجاب میں قید کی گئی۔ جیل کا یہ پہلا تجربہ تھا جو راج کماری کو پسند نہ آیا جس کی زیادہ تر وجہ جیسا کہ اس نے خود مجھے بتایا، یہ تھی کہ جیل کی کوٹھڑی میں چوہے اور چھپکلیاں تھیں وہ ان سے نہ صرف نفرت کرتی تھی بلکہ ڈرتی بھی تھی۔ وہ مختصر عرصہ ہی جیل میں رہی۔ حکام نے اسے از خود رہا کر دیا۔ گاندھی جی کی رہائی کے بعد وہ پھر ان سے جا ملی اور اس کے بعد وہ ان کے ساتھ ہی رہی حتیٰ کہ آزادی کے بعد ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو اسے نہرو کابینہ میں وزیر بنا دیا گیا۔

نہرو راج کماری کو کابینہ میں لینا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی نظر انتخاب ہنسا مہتہ پر پڑی تھی

نہرو راجکماری کو صوبے کا گورنر یا کسی بیرونی ملک میں بھارت کا سفیر مقرر کرنا چاہتے تھے۔ مگر گاندھی جی نے مداخلت کی اور نہرو نے راج کماری کو کابینہ میں لے لیا۔ راج کماری دس سال تک بھارت کی وزیر صحت رہی۔ اس کے دور میں نہ صرف آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز کا قیام عمل میں آیا بلکہ ملک میں ملیریا کی وبا پر بھی قابو پا لیا گیا۔ راج کماری اچھی منتظم نہ تھی اور بطور وزیر وہ نوکر شاہی کے ہاتھوں میں کھیلتی رہی ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ اس کی وزارت کے بارے میں بعض تجاویز کابینہ میں زیر غور آئیں مگر وہ ان تجاویز کی وضاحت نہ کر سکی۔ جب دوسرے وزراء نے ان تجاویز پر اس سے بحث مباحثہ کیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور زیر غور تجاویز کو ملتوی کرنا پڑا۔ کابینہ کے اگلے اجلاس میں سیکرٹری صحت یا ڈائرکٹر جنرل کو بلایا گیا جنہوں نے متعلقہ تجاویز کی وضاحت کی۔ میں نے اپنی زندگی میں دو خواتین دیکھی ہیں جو سادہ سے کپڑوں میں ملبوس سیدھی سادی زندگی گزارتی تھیں مگر ان میں بھاری جوڑے اور نیم عریاں قیمتی لباس پہننے والی مہارانیوں سے زیادہ حسن تھا۔ یہ دو خواتین راج کماری امرت کور اور وجے لکشمی پنڈت ہیں۔ راج کماری مختصر مگر خوبصورت تقریر کرتی تھی۔ اس کی آواز کا لوچ اس کے الفاظ سے زیادہ حاضرین کو مسحور کرتا تھا۔ مگر جہاں کسی مخصوص مسئلہ پر دلائل اور منطق سے تقریر کرنا ہوتی راجکماری ناکام رہتی وہ کوئی اچھی مصنف بھی نہ تھی۔ تاہم وہ فرانسیسی خوب بولتی تھی۔

کانگریسی وزیر کی حیثیت سے راج کماری کانگریسیوں کے خلاف ہی باتیں کیا کرتی تھی۔ اس پر کانگریسی ارکان پارلیمنٹ نے احتجاج بھی کیا۔ پارلیمنٹ کے حزب مخالف کے ارکان خصوصاً کمیونسٹوں سے اس کے گہرے مراسم تھے۔ اسے سفیروں کو اپنے ہاں بلانے اور ان کی دعوتوں میں شامل ہونے کا بڑا شوق تھا وہ سفیروں سے بھی کانگریس کے بارے میں نازیبا باتیں کیا کرتی اسے یہ خیال نہ آیا کہ ایسا کرنا ایک کانگریسی وزیر کے شایان شان نہیں۔ ایک مرتبہ اس نے نہرو کو خط لکھا جس میں کانگریسیوں کو سخت سست کہا گیا تھا خط کے آخر میں تحریر تھا۔

"کانگریسی چور اور بدمعاش ہیں۔ انہیں اپنی ذات کی پڑی رہتی ہے۔" نہرو خفا ہوئے

کے بجائے اس سے محظوظ ہو‎ئی۔ اور جواباً راج کماری کو تحریر کیا "آپ نے جو اعزاز بخشا ہے میں اس کے لئے آپ کا ممنون ہوں آخر میں بھی تو کانگریسی ہوں۔" ایک مرتبہ بنگلور میں ممتاز طبی ماہروں کی کانفرنس ہوئی۔ اس میں تقریر کرتے ہوئے راج کماری نے کہا "خاندانی منصوبہ بندی کا طریقہ گاندھی جی کے تصورات کے قریب تر ہے اور میں یہ بات اپنے تجربہ کی بنا پر کہہ رہی ہوں۔" کانفرنس کے شرکا نے بمشکل ہنسی ضبط کی راج کماری تو خود کنواری تھی۔ دراصل وہ کہنا یہ چاہتی تھی کہ طبی تجربات سے یہ طریقہ بہتر ثابت ہوا ہے

راج کماری نے ایک مرتبہ کسی ایکٹر میٹار کی طرح ہنستے ہوئے مجھے بتایا کہ ایک دفعہ ایک متمول، عمر رسیدہ ہائی کمشنر نے اس سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اس وقت راج کماری کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی اس ہائی کمشنر نے شادی کی تجویز کے لئے جو جملہ استعمال کیا تھا وہ اس سے خاص طور پر محظوظ ہوئی تھی جملہ یہ تھا "اری امرت کیا تم میری شریک تنہائی نہ بنوگی؟" مگر بے چارے کو اپنی تنہائی اکیلے ہی کاٹنی پڑی ۱۹۶۱ کے عام انتخابات میں راج کماری جالندھر سے لوک سبھا کا انتخاب لڑنا چاہتی تھی مگر سردار سورن سنگھ پہلے ہی اس حلقے کی خواہش کا اظہار کر چکے تھے۔ راج کماری کا حلقہ ہماچل پردیش میں منڈی کا حلقہ تھا اور عام خیال یہ تھا کہ راج کماری اس حلقہ سے انتخاب لڑے گی جالندھر کی نشست تو سورن سنگھ کو الاٹ کر دی گئی اور راج کماری سے کہا گیا کہ وہ منڈی سے یا پنجاب میں کیتھل کے حلقے سے انتخاب لڑے جہاں سے اس کی کامیابی یقینی ہے مگر راج کماری اڑ گئی اس نے کہا جالندھر یا پھر کچھ نہیں چنانچہ اسے کچھ نہیں مل گیا اس پر راج کماری کا رویہ بے حد تلخ ہو گیا جب وہ لوک سبھا کی رکن منتخب نہ ہوئی تو اسے وزارت سے بھی محروم ہونا پڑا اور صدر نے اسے وہ بنگلہ چھوڑنے کا نوٹس دے دیا جس میں وہ بحیثیت وزیر مقیم تھی اس کا راج کماری کو اور بھی صدمہ ہوا۔ آخر میں نے مداخلت کی اور نہرو سے کہا کہ راجکماری آل انڈیا ٹی بی ایسوسی ایشن ریڈ کراس اور دوسری ملک گیر رفاہی تنظیموں کی صدر ہے اسے اسی بنگلہ میں رہنے دیا جائے چنانچہ نہرو کے ایما پر وہ بنگلا اسے دوبارہ الاٹ کر دیا گیا جس کے لئے وہ میری بے حد شکر گزار

تھی۔ نہرو نے راجکماری کو مدھیہ پردیش کا گورنر بنانا چاہا مگر اس نے انکار کر دیا۔

۱۹۵۹ء میں جب میں نہرو جی سے علیحدہ ہوا اور ایوان وزیر اعظم کو چھوڑ دیا تو راجکماری نے مجھے اپنے ہاں قیام کرنے کی دعوت دی۔ میں نے دو ہفتے اس کے ساتھ قیام کیا مجھے معلوم ہوا کہ راج کماری مجھ سے کھانے پینے کے اخراجات نہیں لے گی تو میں اس کے ہاں سے چلا آیا اور ایک دوست کے پاس ٹھہر گیا جو پارلیمنٹ کا رکن تھا۔ دو سال بعد راج کماری نے پھر مجھے اپنے ہاں ٹھہرنے کی دعوت دی اور بڑے تامل کے بعد اخراجات وصول کرنے پر رضامند ہوئی۔ چنانچہ میں اس کے بنگلے پر چلا گیا۔ راج کماری نے مجھ سے کہا "آپ میرے ساتھ اس وقت تک قیام کریں جب مجھے موت آ جائے۔"

راج کماری اپنے خاندان کی دوسری نسل سے بیزار تھی۔ خصوصاً اپنی صنف کے بارے میں اس کا رویہ نہایت سخت تھا۔ لیکن اگر کسی پر مصیبت آ جاتی تو وہ بھاگ کر اس کی مدد کو پہنچتی ۱۹۶۲ء میں راج کماری اپنی وصیت میں تبدیلی کر کے میرے لئے کچھ املاک مخصوص کرنا چاہتی تھی مگر میں نے اسے روک دیا۔ پھر اس نے میڈیکل سائنسز کے انسٹی ٹیوٹ کی زمین پر ایک بنگلہ تعمیر کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ شرط یہ تھی کہ راج کماری اس کا بھائی کرنل شمشیر سنگھ اور میں جب تک زندہ ہیں اس بنگلے میں رہیں گے اور اس کے بعد وہ انسٹی ٹیوٹ کی ملکیت بن جائے گا۔ مگر میں نے اسے یہ بھی نہ کرنے دیا جس کا مجھے اب افسوس ہے میرے مشورے پر راج کماری اور اس کے بھائی نے شملہ میں اپنا محل حکومت ہند کو بطور تحفہ دے دیا۔ اس کے عوض میں حکومت نے وہ بنگلہ جس میں راج کماری مقیم تھی تاحیات راج کماری کو بلا کرایہ الاٹ کر دیا۔ مگر افسوس راج کماری اگلے سال ۱۹۶۴ء ہی چل بسی کرنل شمشیر سنگھ ۱۹۷۵ء کے وسط تک زندہ تھا اس کی عمر ۹۶ سال ہو چکی تھی میں وعدہ کے مطابق راج کماری کی آخری سانسوں تک اس کے ساتھ رہا۔ وہ مجھ سے ایک ماں کی طرح شفقت برتتی تھی۔ وہ ایک بہادر خاتون تھی جس کی یاد آج بھی میرے دل میں ہے۔

باب ۲۶

وجے لکشمی پنڈت

اس صدی کے آغاز میں سروپ۔ جو اس کے کنوارپنے کا نام تھا پیدا ہوئی وہ اپنے عہد کی خوبصورت ترین خاتون تھی۔ کشمیری پنڈتوں کے گھرانوں کے رواج کے مطابق شادی کے بعد سروپ نے وجے لکشمی کا نام پایا۔ نہرو اور دوسرے قریبی عزیز اسے "نن" کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ وہ زندگی کی رنگینیوں سے پیار کرتی تھی بہت عمدہ کھانا پکاتی اور اپنے بھائی اور باپ کی طرح وہ کیسے بھی کپڑے پہنتی، نہایت خوبصورت نظر آتی اس خوبصورت اور نرم و نازک خاتون کو دیکھ کر فرحت ہوتی تھی۔ بڑھاپے میں بھی وجے نہایت پرکشش ہے اگرچہ اب اس نے اپنا خیال رکھنا چھوڑ دیا ہے۔ وہ اسراف پسند تھی جس سے اسے کئی بار پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا۔

نہرو کے خاندان میں صرف دو افراد ایسے تھے جنہوں نے قومی جدوجہد میں شرکت کی خاطر آرام و آسائش کی زندگی برضا و رغبت تج کے سادگی اختیار کی۔ یہ تھے موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو۔ ان کے سوا وجے لکشمی سمیت خاندان کے تمام افراد نے بامرِ مجبوری اور حالات کے سامنے بے بس ہو کر عیش و عشرت کی زندگی سے کنارہ کشی کی تھی اس لئے انہیں حالات سے سمجھوتہ کرنے میں مشکل پیش آئی وجے لکشمی ۴۹-۱۹۴۵ء میں امریکہ میں تھی۔ جہاں اس نے آزادی کے لئے خاصا کام کیا اور انگریزوں کے پٹھو جے راج شنکر باجپائی کے پروپیگنڈے کا توڑ کیا جو وہ تحریک آزادی کے خلاف کر رہا تھا۔ جب اقوام متحدہ قائم ہوئی تو وجے لکشمی

Vijaya Lakshmi Pandit, Indira and Nehru in Washington, 1948

Krishna Menon at a swimming pool in the United States with a Spanish and a Japanese girl

سان فرانسسکو میں موجود تھی اور اس اجلاس میں بطور مبصر کے شریک ہوئی ۱۹۴۷ء میں اسے یو پی کی کابینہ سے الگ کر کے روس میں سفیر مقرر کر دیا گیا۔ یہ ایسی جگہ تھی جو وجے کے مزاج کے ہرگز مطابق نہ تھی یہاں اس کا قیام بھی مختصر رہا اور جلد ہی اسے امریکہ میں بھارت کا سفیر مقرر کر دیا گیا۔ وہ جب ماسکو گئی تو حالات غیر موافق تھے۔ ان دنوں ماسکو میں نہرو کو بھی استعمار کا کتا تصور کیا جاتا تھا۔ اس نے خود مجھے بتایا کہ ماسکو میں اس کی ملازمت اس کے لئے اخلاقی شکست کا درجہ رکھتی ہے۔ مگر اس کا انجام بخیر ہوا وہ یوں کہ اسے واشنگٹن بھیج دیا گیا امریکہ کا معاشرہ اس کے مزاج کے مطابق تھا۔ یہاں اس نے خوب مزے اڑائے دربار لگائے خود دوسروں کی دعوتیں کیں اور دوسروں کی دعوتوں میں شریک ہوتی جس کا اسے بے حد شوق تھا۔ اس کی فضول خرچی کی عادت انتہا کو پہنچ چکی تھی اس نے نہرو کی اجازت کے بغیر امریکہ میں اس کی کتابوں کے پبلشر سے رائلٹی کی مد میں رقم وصول کر لی۔ اس کے بعد میں نے پبلشر کو تحریری طور پر مطلع کیا کہ نہرو جی کی اجازت کے بغیر کسی کو رقم نہ دی جائے ۱۹۴۹ء میں اسے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۵۳ء تک وہ اقوام متحدہ میں بھارتی وفد کی سربراہ رہی اس کے بعد کرشنا مینن وفد کے لیڈر بنا دیئے گئے۔

وجے من موجی خاتون ہے اور اکثر اوقات آخری وقت پر طے شدہ پروگرام منسوخ کر دیا کرتی تھی۔ اس نے ایک بار ہنری کیبٹ لاج سے بھی یہی عمل دہرایا اس پر ہنری کو بڑا غصہ آیا۔ اس نے وجے کو خط لکھا "بوسٹن میں بھی برہمن بستے ہیں" بوسٹن کے امریکی قصبہ میں انگلستان سے جا کر آباد ہونے والوں کو بوسٹن کے برہمن کہا جاتا ہے اور ہنری کا تعلق بوسٹن کے ایک معزز خاندان سے تھا۔

گاندھی جی کے قتل کے بعد راج کماری امرت کور نے نہرو کو ایک سربمہر لفافہ دیا جو گاندھی جی اپنے پاس رکھا کرتے تھے۔ نہرو نے لفافہ کھولا اور سرسری طور پر دیکھنے کے بعد

Rajkumari Amrit Kaur

Sarojini and Padmaja Naidu

مجھے بلایا۔ انہوں نے کہا "یہ وہ کاغذات ہیں جن کا تعلق نوجوان وجے لکشمی کا سید حسین کے ساتھ فرار سے ہے۔ بہتر ہے تم یہ کاغذات جلا ڈالو"۔ میں نے وزیراعظم کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ یہ کاغذات میں بحفاظت اپنے پاس رکھ لیتا ہوں مگر وہ نہ مانے چنانچہ لفافے کریں سمیت ایوان وزیراعظم کے باورچی خانے میں گیا اور اپنے سامنے تمام کاغذات جلا کر تلف کر دیئے۔ وجے لکشمی جب کسی سے ملتی تو اس کے سامنے تو بھانے والی باتیں کرتی مگر جب وہ چلا جاتا تو نہایت ناروا باتیں کہتی۔ غالباً یہ اس کی سفارتی زندگی کا عکس تھا وجے لکشمی مجھ پر بھی تنقید کے تازیانے برساتی رہتی اور مجھے اس کا علم تھا۔ وہ کہا کرتی تھی کہ میں اندرا کو اس کے مقابلے میں بڑھا رہا ہوں۔ حالانکہ میں نے کبھی کسی کو کسی کے مقابلے میں آگے بڑھانے کی کوشش نہیں کی۔

امریکہ میں سفارتی زندگی کی میعاد پوری کرنے کے بعد وجے ۱۹۵۲ء میں واپس بھارت آگئی اور اسے لوک بھا کا رکن منتخب کر لیا گیا۔ اسے کابینہ میں لئے جانے کی توقع تھی مگر نہرو یہ مناسب نہیں سمجھتے تھے کہ وہ اپنی بہن کو وزیر بنائیں تاہم ۱۹۵۳ء میں وہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی صدر منتخب ہو گئی اور اس کی وزارت سے محرومی کا مداوا ہو گیا۔ جب وہ پارلیمنٹ کی رکن بنی تو نہرو نے مجھ سے کہا کہ "دہلی میں وجے کو بنگلہ الاٹ کرانے کے لئے وزیر تعمیرات سے بات کرو۔" میں نے کہا کہ اس طرح لوگ انگلیاں اٹھائیں گے۔ میری تجویز یہ تھی کہ وزیر تعمیرات سے ان ارکان پارلیمنٹ کے لئے جو کابینہ میں وزیر، گورنر یا سفیر رہ چکے ہیں، چند بنگلے مخصوص کرا دیئے جائیں۔ نہرو کو یہ تجویز پسند آئی انہوں نے اس کے مطابق ہی وزیر تعمیرات کو ہدایات جاری کر دیں اس طرح وزیراعظم کی پوزیشن خراب کئے بغیر وجے لکشمی کو بنگلہ مل گیا۔ مگر وجے لکشمی جلد ہی پارلیمانی زندگی سے بیزار ہو گئی چنانچہ وزارت خارجہ کے سیکرٹری جنرل نے میرے ایما پر وجے سے کہا کہ وہ لندن میں بھارت کی ہائی کمشنر بن کر چلی جائے۔ وہ رضامند ہو گئی اور لندن میں اس نے ہائی کمشنر کی حیثیت

سے اچھا تاثر چھوڑا۔

وجے لکشمی جب لندن میں تھی تو وزیراعظم کو امریکہ میں بھارت کے سفیر جمدایل مہتہ کا خط موصول ہوا جس میں انکشاف کیا گیا تھا کہ وجے نے ایک اموکی ہنری گریڈی سے جو دہلی میں اموکی سفیر رہ چکا تھا۔ ایک بڑی رقم بطور قرض لی تھی یہ ان دنوں کا قصہ ہے جب وہ امریکہ میں سفیر تھی۔ مہتہ نے ہنری گریڈی کے نام وجے کے ایک خط کی فوٹو کاپی بھی ارسال کی تھی جو اس نے بھارتی سفیر کی حیثیت سے لکھا تھا۔ اور اس میں خطیر رقم کے قرض کی درخواست کی گئی تھی۔ حصول قرض کے لئے اس نے یہ عجیب و غریب وجہ بیان کی تھی۔ کہ حکومت زرمبادلہ کی کمی کے باعث اس کی تنخواہ کی ترسیل کا بروقت بندوبست نہیں کر سکی۔ گریڈی نے لکھا تھا کہ بار بار کے تقاضوں کے باوجود وجے نے یہ قرض نہیں لوٹایا۔ وزیراعظم کو بڑی حیرت ہوئی اور انہوں نے لندن میں وجے کو چھٹی لکھی کہ قرض کی جلد ادائیگی کی جائے۔

۱۹۵۷ء کی دوسری ششماہی میں انکم ٹیکس کے تحقیقاتی کمیشن کے سربراہ نے نہرو کو اپنے طور پر مطلع کیا کہ برلا کے دو بڑے اداروں کی کتابوں میں ایسے اندراجات پائے گئے ہیں جن کے مطابق وجے لکشمی کو بھاری رقوم ادا کی گئی ہیں۔ وزیراعظم نے مجھ سے کہا کہ میں برلا سے رابطہ پیدا کر کے اس بات کی تصدیق کروں۔ میرے استفسار پر سیٹھ برلا نے اطلاع کی تصدیق کر دی۔ اس نے کہا صرف اور صرف ایک قومی قائد ایسا ہے جس نے ہم سے رقوم وصول نہیں کیں اور وہ لیڈر پنڈت نہرو ہے۔ دوسرے تمام لیڈروں بشمول وجے لکشمی نے ہم سے رقوم وصول کی ہیں۔ پھر اس نے نام گنوانے شروع کئے ان میں گاندھی جی اور پٹیل کے علاوہ دوسرے لوگ بھی تھے۔ سیٹھ برلا نے مجھے بتایا کہ برلا برادرز کے کھاتوں میں جے پرکاش نرائن کو برلا کا پرائیویٹ سیکرٹری ظاہر کر کے تنخواہ ادا کی جاتی رہی یہ ادائیگی گاندھی جی کے قتل کے بعد بند کی گئی۔ دراصل گاندھی جی کے قتل کے بعد جے پرکاش نرائن نے پٹیل پر سخت حملے

شروع کر دیئے تھے جس پر پٹیل نے برلا سے کہا کہ جے پرکاش کو ادائیگی بند کر دی جائے برلا نے مجھ سے کہا آپ پوچھ لیں اگر وزیر اعظم چاہیں تو جے پرکاش نرائن کو ادائیگی دوبارہ شروع کر دی جائے۔ میں نے برلا سے کہا کہ وزیر اعظم سے اس معاملے میں مشورہ کی ضرورت نہیں تم خود فیصلہ کرو۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو نہ صرف ادائیگی دوبارہ شروع کر دیتا بلکہ جتنا عرصہ ادائیگی نہیں کی گئی اس کی تمام ادائیگی یکمشت کر دیتا۔

میں نے وزیر اعظم کو بتایا کہ جی۔ ڈی برلا نے وجے لکشمی کو خیر رقوم کی ادائیگی کی تصدیق کر دی ہے۔ انہوں نے لندن میں وجے کو خط لکھ کر اس معاملے کی تصدیق چاہی تو وجے نے صاف انکار کر دیا۔ وزیر اعظم نے مجھے کہا کہ میں برلا سے دوبارہ مل کر ادائیگی کی رسید بھی لاؤں چاندنا چار میں نے پھر برلا سے رابطہ پیدا کیا تو اس نے بتایا کہ جو رقوم بھارتی کرنسی میں دی گئی ہیں انکی رسیدیں تو موجود نہ ہوں گی البتہ وجے نے امریکہ میں ہمارے ایجنٹ سے جو رقم ڈالروں میں وصول کی تھی اس کی رسیدیں مل سکیں گی۔ برلا نے اپنے چھوٹے بھائی بی ایم برلا سے کہا کہ وہ نیویارک سے رسیدیں منگوانے کا انتظام کرے۔ اس نے رسیدوں کی فوٹو کاپیاں مجھے فراہم کر دیں۔ جو وزیر اعظم کو دکھائیں میں نے وزیر اعظم سے یہ بھی کہا کہ اس معاملے کو طول دینے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ چنانچہ اسے ختم کر دینا ہی مناسب ہے۔

لندن سے واپسی میں مسز وجے لکشمی پنڈت کو بمبئی کا گورنر بنا دیا گیا ۱۹۶۲ء میں وجے کو امید تھی کہ اسے رادھا کرشنن کی جگہ ملک کا نائب صدر بنا دیا جائے گا مگر نہرو کا خیال کچھ اور تھا اور انہوں نے ذاکر حسین کو نائب صدر بنوا دیا۔ نہرو کے انتقال کے بعد مجھے وجے کا خط ملا جس میں مجھے چند روز کے لئے پونا آنے کی دعوت دی گئی تھی کیونکہ وہ مجھ سے اپنے مستقبل کے بارے میں بات کرنا چاہتی تھی۔ میں پونا گیا اس نے مجھے بتایا کہ وہ نہرو کے حلقہ انتخاب سے لوک سبھا کا ضمنی انتخاب لڑنا چاہتی ہے مگر اندرا اس کے آڑے آ رہی ہے۔ چونکہ لال بہادر شاستری

اور کامراج اس کے خلاف نہیں تھے اس لئے اسے یقین تھا کہ وہ کانگریس کا ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ میں نے وجے سے کہا "تم سیاست میں صرف اس وقت آؤ جب یہ فیصلہ کر لو کہ تمہیں رکن پارلیمنٹ کے طور پر ہی رہنا ہے کیونکہ اندرا کی کابینہ میں موجودگی کے پیش نظر نہرو خاندان کی کسی اور خاتون کو وزیر بنانا ممکن نہ ہوگا لیکن تم ذہنی طور پر محض رکن پارلیمنٹ رہنے کو تیار نہیں ہو تو تمہیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کے برعکس گورنر کی حیثیت سے تمہارے پاس کافی وقت ہے۔ کیوں نہ تم اپنی یادداشتیں مرتب کرو جس کا تم عرصہ سے منصوبہ بنا رہی ہو۔" وجے نے میری بات نہ مانی۔ اس نے کہا کہ "گورنر کے عہدے سے میرا دل بھر گیا ہے یہ تو محض مداری کے بندر والا قصہ ہے۔" چنانچہ اس نے گورنری چھوڑ دی اور میدان سیاست میں کود پڑی۔ اسے لوک سبھا کا رکن منتخب کر لیا گیا۔

نہرو کی وفات کے بعد کے سال وجے لکشمی پنڈت کے لئے نہ صرف لاحاصل رہے بلکہ اس دوران اسے سخت ذہنی کوفت سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ اس کی اپنی بھتیجی اندرا سے تو کبھی نہ بنی تھی۔ جب اندرا وزیر اعظم بنی تو وجے کی مشکلات میں اضافہ ہو گیا اندرا احمقوں کی طرح وجے کو برا بھلا کہہ کر مسرت کا اظہار کرتی۔ اسے سرکاری تقریبات میں مدعو نہ کیا جاتا۔ یہ بات عام ہو گئی کہ وجے لکشمی سے کسی کا میل جول حکومت پسندیدگی کی نظروں سے نہیں دیکھتی۔ چنانچہ بہت سے لوگوں نے وجے سے کنارہ کشی کر لی۔ جب حالات ناقابل برداشت ہو گئے تو وجے نے لوک سبھا کی رکنیت سے استعفا دے دیا اور دہلی کو خیرباد کہہ کر ڈیرہ دون میں آباد ہو گئی

۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں وجے لکشمی پنڈت زخمی شیرنی کی طرح کچھار سے نکلی اور اپنی بھتیجی کو شکست دلانے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ اس دوران میں نے ایک طاقت ور انسانی جذبے — "جذبہ انتقام" کو بروئے کار دیکھا۔ وجے لکشمی کا کہنا تھا کہ وہ جمہوریت کی بحالی قانون کی حکومت اور انسانی اقدار کے لئے میدان میں نکلی ہے اور اس کی یہ بات بھی غلط نہ تھی۔ کوئی دو سال قبل وجے نے مجھ سے پوچھا تھا "بھائی (نہرو) نے اپنی زندگی کے آخری دور

میں مجھے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔ کیوں؟" میں وجے کے اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے بات چیت کا موضوع ہی بدل دیا۔ مگر اب بتا دوں کہ نہرو کے وجے کو نظر انداز کرنے کی دو وجوہ تھیں ایک تو اس کے کرتوت اور دوسرے نہرو اندرا کے مقابلے میں کسی کو منظر پر چھا جانے کی اجازت دینے کے حق میں نہ تھے۔ اس سلسلے میں مزید باتیں اندرا کے بارے میں باب میں ہوں گی۔

باب ۲۷

ذکر کچھ کتابوں کا

جواہر لال نہرو کی سوانح عمری جو گوپال نے لکھی ہے ایک مایوس کن کتاب ہے مگر اس کے مصنف کو بلا وجہ بھاری رقوم ادا کی گئیں۔ اسے کتاب کی رائلٹی بھی حاصل کرنے کی اجازت تھی اور نہرو میموریل فنڈ نے اسے بعض دوسری سہولتیں بھی فراہم کی تھیں یہ کتاب غیر دلچسپ اور انتہائی خشک ہے۔ اور اس کا انداز کسی نوجوان طالب علم کے تحریر کردہ مقالے کا ہے اس کتاب میں کرشنا مینن اور روسی وزیر خارجہ مولوٹوف کی ملاقات کے بارے میں ایک فرضی داستان بیان کی گئی ہے۔ یہ ملاقات ۱۹۴۶ء میں ہوئی۔ اس من گھڑت کہانی کو تاریخ کا حصہ نہیں بننا چاہیئے۔ گوپال نے نہرو کی سوانح میں لکھا ہے۔ "نہرو غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی کی تعمیر کے سلسلے میں غیر رسمی تعلقات کو ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ کرشنا مینن نے نہرو کے نمائندہ خصوصی کی حیثیت میں مولوٹوف سے ملاقات کی اور نئی حکومت کی طرف سے روس کے ساتھ دوستانہ تعلقات کے قیام کی پرخلوص خواہش کا اظہار کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے روس سے اناج کی امداد چاہی اس نے نہرو کی طرف سے دی گئی ہدایات سے قطع نظر روسی وزیر خارجہ سے روسی فوجی ماہرین کے دورہ بھارت کے امکانات پر بھی تبادلہ خیال کیا جس سے وزارت خارجہ اور دفتر خارجہ کے حکام ہی نہیں نہرو کے بعض رفقا بھی سخت پریشان ہوئے چنانچہ نہرو نے پہلی بار کرشنا مینن کو ہلکی سی ڈانٹ پلائی۔ نہرو نے کرشنا مینن کو لکھا کہ مجھے تم پر مکمل اعتماد ہے کہ تم جو کچھ کرو گے سوچ سمجھ کر کرو گے اور یہ دیکھ کر کرو گے کہ تمہارے اقدامات سے کوئی مشکلات

پیدا نہ ہوں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے سب ٹھیک ہے مگر دوسرے لوگ جو تمہیں اچھی طرح نہیں جانتے انہیں بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔"

یہ کہانی من گھڑت ہے۔ اصل صورت حال یہ ہے کہ ۱۹۴۶ء میں عبوری حکومت کے قیام کے بعد نہرو نے کرشنا مینن کو اپنا ذاتی نمائندہ مقرر کیا تاکہ وہ یورپ کے بعض ممالک کا دورہ کر کے ان سے آزاد بھارت کے سفارتی تعلقات کے قیام کی راہ ہموار کرے۔ اس دورے میں روس شامل نہ تھا۔ کیونکہ گاندھی جی اور پٹیل نے کرشنا مینن کو روس بھیجنے کی مخالفت کی تھی۔ کرشنا مینن جب مغربی یورپ کے دورے سے واپس آیا تو اس نے مجھے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا ایک نوٹ بھیجا۔ اس نوٹ میں اس نے نہرو سے اپیل کی تھی کہ اسے ماسکو جانے کی اجازت دی جائے تاکہ وہاں بھی ابتدائی کام کیا جا سکے۔ نہرو کے جس خط کا ذکر گوپال نے کیا ہے وہ کرشنا مینن کے اسی نوٹ کے جواب میں تھا۔ یہ خط ۱۳ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو لکھا گیا تھا۔

نہرو نے ۲۱ ستمبر ۱۹۴۶ء کو مولوٹوف کو ایک ذاتی خط لکھا تھا۔ جس میں استفسار کیا گیا تھا کہ آیا روس بھارت کو اناج بطور امداد دے سکتا ہے۔ ان دنوں مولوٹوف پیرس میں تھا جہاں امن کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ چنانچہ کرشنا مینن کو ہدایت کی گئی کہ وہ پیرس میں مولوٹوف سے ملاقات کر کے خوراک کی امداد کی درخواست کرے۔ یہ سب باتیں خود نہرو نے مرکزی قانون ساز اسمبلی میں بتائی تھیں۔ مگر برطانوی دفتر خارجہ نے جو اس معاملے میں جاسوسی کا دفتر ہے گوپال کو بے سروپا کہانی بتا کر کتاب میں شامل کرا دی۔ کرشنا مینن میں کوئی اور خرابیاں ہوں تو ہوں مگر وہ نہرو کی ہدایات کی خلاف ورزی کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔

اس وقت روس سے خوراک کی امداد طلب کرنا احمقانہ بات تھی۔ روس ابھی دوسری جنگ عظیم کے تاثرات کی گرفت میں تھا اور خود بھی اناج کے قحط سے دوچار تھا بھلا اس کے پاس کسی کو دینے کے لئے اناج کہاں سے آتا۔ یہ نہرو کی اضطراری حرکت تھی میں ان دنوں حکومت کے کاروبار میں شامل نہ تھا۔ بلکہ صرف نہرو کی رہائش گاہ پر کام کرتا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے

روس نے بھارت کو آزادی کے ابتدائی سالوں میں کوئی غذائی امداد نہیں دی۔

روس سے بھارت کے سفارتی تعلقات کے قیام کے لئے جو ابتدائی کام کیا گیا اس کے حقائق یہ ہیں۔ ۱۹۴۶ء کے موسم خزاں میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا اجلاس ہوا۔ مسز وجے لکشمی پنڈت اس اجلاس میں بھارتی وفد کی سربراہ اور کرشنا مینن اس کے نائب تھے۔ کے پی ایس مینن وفد کے سیکرٹری جنرل تھے۔ نہرو نے وفد کی سربراہ کو تار بھیجا کہ جنرل اسمبلی کا اجلاس ختم ہونے کے بعد کرشنا مینن اور کے پی ایس مینن ماسکو چلے جائیں اور روسی حکومت سے سفارتی تعلقات کے بارے میں ابتدائی بات چیت کریں۔ بھارتی وفد کے سیکرٹری نے روسی وفد کے ایک مندوب کو اس معاملے سے آگاہ کیا جس نے وفد کے قائد اور روسی وزیر خارجہ مولوٹوف سے اس کا ذکر کر دیا۔ مولوٹوف نے بھارتی وفد کو دوپہر کے کھانے کی دعوت دی جس میں ووڈکا اور دوسری شراب پانی کی طرح پی گئی۔ دعوت ختم ہونے تک دونوں ملکوں میں سفارتی تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ مولوٹوف نے کہا کہ بھارتی وفد کے دو ارکان کا ماسکو جانا فضول ہوگا میں اپنی حکومت کو اطلاع دے دیتا ہوں اور یقیناً روسی حکومت اس کا خیر مقدم کرے گی یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ نہرو کی زندگی میں کرشنا مینن ماسکو گئے ہی نہیں۔ میری یادداشت کے مطابق کرشنا مینن نے ۱۹۶۷ء کے لگ بھگ ماسکو کا دورہ کیا جب وہ حکومت میں بھی نہ تھے۔

مولانا آزاد کی کتاب

"انڈیا ونز فریڈم (بھارت آزادی حاصل کرتا ہے) مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف ہے۔ انہوں نے یہ کتاب ہمایوں کبیر کو لکھوائی تھی۔ وہ ہر شام کتاب کا کچھ حصہ ہمایوں کبیر کو املا کرایا کرتے تھے اس وقت انہوں نے چڑھا رکھی ہوتی تھی اور خوب موڈ میں ہوتے تھے۔

مولانا نے اپنی کتاب میں نہرو کی اس بات پر تعریف کی ہے کہ انہوں نے مالاکند کے پولیٹکل افسر کے خلاف مقدمہ ختم کر دیا تھا۔ یہ افسر بڑی دلیری سے مسلم لیگ کی حمایت کرتا تھا اور اس نے صوبہ سرحد میں نہرو کی آمد پر قبائلیوں کو ان کے خلاف مظاہروں پر ابھارا تھا۔ یہ اکتوبر ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے۔ نہرو اور ڈاکٹر خانصاحب کار میں آگے آگے تھے اور میں ان کے پیچھے دوسری کار میں تھا۔ میرے ساتھ دو پولیس افسر بھی بیٹھے تھے۔ اچانک نہرو کی کار میں گولی آکر لگی۔ ہم سب کاروں سے اتر گئے ایک گولی میری ناک کے قریب سے گزر گئی۔ میں نے پہلی مرتبہ سوچا کہ یہ کتنا اچھا ہے کہ میری ناک بلی نہیں یہ فائرنگ اسی افسر کے ایما پر کی گئی تھی۔ دہلی پہنچ کر نہرو نے اس افسر کے خلاف انضباطی کارروائی شروع کی مگر وائسرائے لارڈ ویول نے اس کارروائی کو ناکام بنانے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا۔ معاملہ چلتا رہا اور بالآخر نہرو نے بیزار ہو کر اس کی پیروی ختم کر دی نہرو اس پر خفیف بھی تھے اور انہوں نے اپنی خفت کسی سے چھپائی بھی نہیں۔ مولانا کا یہ کہنا کہ ایک افسر کے ساتھ نہرو نے فیاضی کا سلوک کیا تھا احمقانہ بات ہے۔

مولانا آزاد نے اپنی اس کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ ۱۵ اگست کو جب پہلی حکومت قائم ہوئی تو گاندھی جی نے اصرار کیا تھا کہ آزاد کو وزارت تعلیم کا قلمدان سونپا جائے کیونکہ یہ ایک اہم وزارت ہے۔ مولانا کی یہ بات سرے سے غلط اور بے بنیاد ہے ہر پیر کو گاندھی کا چپ کا روزہ ہوتا تھا۔ اور اس دن پیر ہی تھا۔ گاندھی نے ایک استعمال شدہ لفافے کے اندرونی حصے پر نہرو کو خط لکھا جس میں مشورہ دیا گیا تھا کہ آزاد کو وزارت تعلیم نہ دی جائے۔ گاندھی جی نے مزید تحریر کیا تھا کہ مولانا کو کابینہ میں بطور وزیر بے محکمہ شامل کیا جائے تاکہ مولانا ایک بزرگ سیاست دان کی حیثیت سے کام کر سکے۔ گاندھی جی کو یقین تھا کہ آزاد تعلیم کا ستیاناس کر دیگا۔ مگر نہرو گاندھی جی کی خواہش کو عملی جامہ پہنا سکے۔ کیونکہ مولانا آزاد نے "وزارتِ تعلیم یا پھر کچھ نہیں" کا رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ نہرو

کے نام گاندھی جی کا یہ خط ان دستاویزات میں موجود ہے جو میں نے بڑی محنت سے ۱۹۴۶ء میں جمع کرنا شروع کی تھیں اور جنہیں میں وزیر اعظم ہاؤس میں جسے اب مورتی ہاؤس کہا جاتا ہے، چھوڑ آیا تھا۔ ضمناً یہاں یہ ذکر کرتا جاؤں کہ بطور وزیر تعلیم گاندھی کی نگہ انتخاب ذاکر حسین پر پڑی تھی۔

باب ۲۸

ابوالکلام آزاد اور شراب

اب خوبرو، بارعب تقدس مآب ہستی کا بیان ہو جائے جو صاف مونچھوں، مختصر ڈاڑھی اور لمبی ترکی ٹوپی کے باعث مزید دلکش ہو گئی تھی اور جو کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی اردو میں خطابت کے جوہر دکھاتی تھی۔ یہ تھے مولانا ابوالکلام آزاد مولانا پارلیمنٹ میں کبھی کبھار ہی تقریر کرتے تھے۔ مگر جب انہیں بولنا ہوتا تھا پارلیمنٹ کی گیلریاں پُر ہوتی تھیں۔ جہاں تک ان کے تقدس مآب ہونے کا تعلق ہے وہ ان کے دینی علم اور ان کی شہرہ آفاق تفسیر قرآن تک محدود ہے۔ اس کے علاوہ تو وہ ایک دنیا دار انسان تھے اور زندگی کی رنگینیوں کو پسند فرماتے تھے۔

۱۹۴۵ء میں مولانا جیل سے رہا ہو کر آئے تو اخلاق و مذہب "مین کنڈ" نظریات کے بعض لوگوں نے گاندھی جی کو رپورٹ دی کہ جیل میں مولانا باقاعدگی سے شراب پیتے رہے ہیں راج کماری امرت کور کا بیان ہے کہ جب گاندھی جی سے مولانا کی پہلی ملاقات ہوئی تو گاندھی جی نے پوچھا "مولانا آپ شراب سے شغل فرماتے ہیں۔" مولانا نے نفی میں جواب دیا مگر گاندھی جی کے ذہن میں جو شکوک پیدا ہو چکے تھے ان کا ازالہ نہ ہو سکا۔

۲۸ اپریل ۱۹۴۶ء کو جب کانگریس کی مجلس عاملہ برطانوی کیبنٹ مشن کی تجاویز پر ابھی غور کر رہی تھی۔ گاندھی جی کو اطلاع ملی کہ آزاد نے جو کانگریس کے صدر تھے۔ گاندھی جی یا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کو بتائے بغیر کیبنٹ مشن کو خط لکھا ہے اس خط کا مسودہ ہمایوں کبیر

نے تیار کیا تھا۔ دراصل مولانا کو فرقہ وارانہ مسائل کے حل کے ضمن میں کیبنٹ مشن اور خود اپنے خیالات میں ہم آہنگی نظر آئی تھی۔ مولانا کے نزدیک اس مسئلہ کا حل یہ تھا کہ حکومت وفاقی طرز کی ہو۔ جس میں اختیارات کی مرکزیت کم سے کم ہو بلکہ صوبوں کو زیادہ خود مختاری اور آزادی عمل حاصل ہو۔ مرکز کے پاس دفاع امور خارجہ اور مواصلات کے شعبے ہوں۔ کیبنٹ مشن کے ارکان کو اپنے مشکل کام سے عہدہ برآ ہونے کے لئے مولانا کی ذات میں ایک ہم خیال شخص نظر آیا۔ مولانا نے کیبنٹ مشن کے نام اپنے ذاتی خط میں یہاں تک لکھا تھا کہ وہ گاندھی کی ذات یا مشن کی تجاویز کے بارے میں گاندھی کے شکوک و شبہات کا زیادہ فکر نہ کریں۔ گاندھی جی کے ایما پر سدھیر گھوش نے مولانا کے خط کی نقل کیبنٹ مشن سے عارتیاً حاصل کر لی۔ ابھی گاندھی جی اس خط کو پڑھ کر فارغ ہونے ہی تھے کہ مولانا آزاد آ گئے۔ راج کماری امرت کور جو پس پردہ بیٹھی سب کچھ سن رہی تھی، مجھے بتایا کہ گاندھی جی نے مولانا سے اس خط کے بارے میں دریافت کیا۔ مولانا صاف مکر گئے۔ خط گاندھی جی کے سامنے چھوٹے سے ڈیسک پر رکھا تھا۔ گاندھی جی کو مولانا کی دروغ بیانی پر سخت تعجب اور افسوس ہوا۔

۲۲ جون ۱۹۴۶ء کا ایک اور واقعہ سنیئے مولانا ابوالکلام آزاد نے وائسرائے لارڈ ویول کو ذاتی خط لکھا جس میں انہوں نے صدر کانگریس کی حیثیت سے یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ عبوری حکومت کے وزراء کی فہرست میں کسی مسلمان کا نام شامل نہ ہونے دیں گے۔ اور اگر کسی نے خود ان کا نام تجویز کیا تو وہ بھی انکار کر دیں گے۔ اس خط کا مسودہ بھی ہمایوں کبیر نے ہی تیار کیا تھا۔ اس سے نہ صرف گاندھی جی اور نہرو بلکہ کانگریس کی مجلس عاملہ کے ارکان بھی بے حد مضطرب ہوئے پھر مولانا اور دیگر اصحاب حالات کے سامنے بے بس ہو گئے اور نہرو نے مولانا کی جگہ کانگریس کے صدر کا عہدہ سنبھال لیا۔ جب ۱۹۴۶ء میں عبوری حکومت بنی تو نہرو نے بقیہ تین مسلمان وزراء کے نام بھی اس میں شامل کئے اب مولانا کے پاس عبوری حکومت سے الگ رہنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔

میں نے کتاب کے دیگر ابواب میں بھی مولانا کا ذکر کیا ہے۔ مولانا مُنتقم المزاج شخص تھے۔ وہ کرشنا مینن کے سخت مخالف تھے۔ اس مخالفت کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ جب مولانا لندن کے دورے پر گئے تو نہرو نے انہیں خُفیہ الفاظ میں ہائی کمشنر کی معرفت ایک تار ارسال کیا کرشنا مینن ہائی کمشنر تھا۔ اس نے یہ تار مولانا کو صرف سات دن بعد پہنچایا کرشنا مینن عام طور پر مولانا کو نظر انداز کر دیا کرتا تھا۔ اسے معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ مولانا خود پسند اور ذرا سی بات پر روٹھ جانے والے انسان تھے۔ بھلا اس کا کیا جاتا تھا اگر وہ لندن میں قیام کے دوران مولانا کے لئے "روحانی غذا" کا بندوبست کر دیتا۔

ایک بار مولانا مغربی جرمنی کے دورے پر گئے اور بھارتی سفیر نمبیار کے مہمان ٹھہرے نمبیار نہایت محتاط اور مہمان نواز میزبان ہے۔ اور اسے مولانا کی عادات اور ذوق کا علم تھا اس نے مولانا کے کمرے میں ہی ایک چھوٹا سا بار کھول دیا جس میں وہسکی، رائن موسلے سفید اور فرانسیسی شیمپین وافر مقدار میں موجود تھی۔ مولانا جب غیر ممالک میں ہوتے تو شیمپین کے ارغوانی جام پسند فرماتے تھے۔ نمبیار پر یہ حقیقت بھی وا ہو گئی کہ مولانا کو اگر اپنے کمرے میں بوتلوں میں گھرا ہوا اکیلا چھوڑ دیا جائے تو بہت خوش رہتے ہیں۔ اس نے ایسا ہی کیا نمبیار کو مولانا سے صرف ایک شکایت تھی کہ اس نے مولانا کے اعزاز میں عشائیہ دیا جس میں جرمن وزیر اور دوسرے معززین مدعو تھے۔ دعوت ختم ہوتے ہی مولانا اپنے کمرے میں کھسک گئے اور شیمپین سے شغل فرمانے لگے بعد میں لندن میں بھی اسی طرح کا ایک واقعہ پیش آیا۔ مولانا ہائی کمشنر مسز وجے لکشمی پنڈت کے مہمان تھے۔ اس نے مولانا کے اعزاز میں عشائیہ دیا برطانوی بحالوزشہ میں انتھونی ایڈن، لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور متعدد دوسری ممتاز ہستیاں شامل تھیں جونہی دعوت ختم ہوئی مولانا چپکے سے غائب ہو گئے۔ ان کی روانگی کا کسی کو علم نہ ہوا جب مہمانوں نے پوچھا کہ مولانا کہاں ہیں تو وجے کو خفت مٹانے کی خاطر سفید جھوٹ بولنا پڑا ورنہ حقیقت یہ تھی کہ مولانا اپنے کمرے میں شغل مے نوشی میں مصروف تھے۔ جب مولانا دورے سے واپس آئے تو وہ نمبیار کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ مگر نمبیار کی تعریف ترنی ٹی کرشن

ماچاری بھی بہت کرتا تھا حالانکہ نمبیار نے اسے کوئی شراب وغیرہ نہیں پلائی تھی ٹی ٹی کہتے تھے کہ بیچارے نمبیار کی بیوی بھی نہیں اس کی زندگی تو بڑی خشک ہے۔ میں وزیر خزانہ کی حیثیت سے اس کے لئے سوشل سیکرٹری رکھنے کی منظوری دے دیتا ہوں بشرطیکہ وزارت خارجہ مجھے ایک نوٹ بھیج دے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

دہلی میں مولانا نے کبھی کسی عشائیہ میں شرکت نہیں کی البتہ وہ دوپہر کے کھانے کی دعوتوں میں شرکت کے لئے ایوان وزیر اعظم آیا کرتے تھے۔ جو غیر ملکی زعما کے اعزاز میں دی جاتی تھیں کابینہ کے اجلاسوں سے جو پانچ بجے شام کے بعد ہوتے تھے، مولانا ٹھیک چھ بجے رخصت ہو جاتے تھے خواہ کتنا ہی اہم معاملہ کیوں نہ زیر غور ہو مولانا اس کی پرواہ نہ کرتے۔ پھر وہ وہسکی سوڈا، برف اور سموسوں کی پلیٹ سجا کر بیٹھ جاتے۔ شغل مے نوشی کے دوران فقط چند افراد ہی ان سے ملاقات کر سکتے تھے ان میں نہرو، ارونا آصف علی، ہمایوں کبیر اور ان کا ایک چہیتا پرائیویٹ سیکرٹری شامل تھے۔ نہرو کی کوشش ہوتی تھی کہ شام کو مولانا سے ملاقات نہ کرنی پڑے۔ تاہم اشد ضروری معاملات میں ایسا کرنا مُستثنیات میں شامل تھا۔

ایک دن مولانا کا چہیتا پرائیویٹ سیکرٹری مجھ سے ملنے آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ مولانا کے بارے میں سخت فکر مند ہے کیونکہ مولانا اب شام کو وہسکی کی نصف بوتل حلق میں انڈیلنے لگے ہیں مولانا نشے میں اکثر گر پڑتے ہیں۔ ان کی پشت پر بھی اسی طرح چوٹ آئی ہے اور اب وہ متاثرہ جگہ پر دھات کی پلیٹ باندھے پھرتے ہیں۔ اس کے بعد سے شراب نوشی کے دوران یا اس کے بعد ایک تنومند ملازم انہیں سہارا دینے کے لئے موجود رہتا ہے۔ پرائیویٹ سیکرٹری کہنے لگا کہ مولانا صرف ایک شخص کی بات نہیں ٹالتے اور وہ نہرو ہیں۔ اس نے دریافت کیا "کیا پنڈت جی مولانا کو شراب نوشی کم کرنے کا مشورہ نہیں دے سکتے۔" میں نے اس کی تجویز وزیر اعظم تک پہنچانے کا وعدہ کر لیا۔ جب میں نے نہرو سے بات کی تو وہ بھی مسکرا دیئے۔

گاندھی جی کے خدشات کے عین مطابق بطور وزیر مولانا بری طرح ناکام رہے۔ انہوں نے

تعلیم کے شعبے میں کسی نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ نہ کیا بلکہ انہوں نے سارا کام ہمایوں کبیر کے۔ جی سیدین اور اشفاق حسین کی نگرانی پر چھوڑ رکھا تھا۔ مگر یہ بات ضرور تسلیم کی جانی چاہیئے کہ ہر معاملے میں اپنی رائے کا اظہار وہ بلا خوف و خطر کر دیا کرتے تھے۔

۱۹۵۶ء میں نہرو لندن گئے۔ انہیں کیبنٹ سیکرٹری کا تار ملا کہ مولانا آزاد اس بات پر مصر ہیں کہ انہیں سرکاری طور پر قائم مقام وزیر اعظم کہا جائے۔ کیبنٹ سیکرٹری نے اس بارے میں نہرو سے ہدایات طلب کی تھیں۔ نہرو نے جواب دیا۔ "میرے جیتے جی کوئی قائم مقام وزیر اعظم نہیں ہو سکتا۔ بھارت سے میری غیر حاضری سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پھر صدر ہی کسی شخص کو قائم مقام وزیر اعظم مقرر کر سکتا ہے۔ اور وہ بھی اس صورت میں کہ وزیر اعظم کام کاج کے قابل نہ رہے۔" کیبنٹ سیکرٹری کو یہ ہدایت بھی کی گئی کہ نہرو کے جواب کی ایک نقل مولانا کو ارسال کر دی جائے۔

اگلے دن پریس ٹرسٹ آف انڈیا کا نامہ نگار مقیم لندن۔ مجھ سے ملنے آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ دہلی میں عجیب صورتحال پیدا ہو گئی ہے۔ مولانا خود کو قائم مقام وزیر اعظم کہتے ہیں ان کی کار کے آگے آگے ایک موٹر سائیکل سوار ہوتا ہے اور پیچھے حفاظتی دستے کی گاڑی اس طرح وہ بڑے مضحکہ خیز دکھائی دیتے ہیں اس نے کہا صرف ایک کسر رہ گئی ہے کہ مولانا نے ایوان وزیر اعظم میں ٹھکانہ نہیں کیا۔ میں نے اسے کیبنٹ سیکرٹری کے تار اور نہرو کے جواب سے آگاہ کیا اس نے اسے میرے بیان کی شکل میں بطور خبر بھیج دیا۔ مولانا آزاد اس بیان پر بڑے سیخ پا ہوئے اور انہوں نے نہرو کو ایک تار بھیجا جس میں میرے "بیان" پر سخت الفاظ میں احتجاج کیا گیا تھا۔ وزیر اعظم نے مولانا کو ساری صورتحال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ نامہ نگار کو صحافی کا نام نہیں استعمال کرنا چاہیئے تھا۔ انہوں نے یہ بھی لکھا کہ صحافی آپ کا احترام کرتا ہے۔ جب ہم واپس بمبئی پہنچے تو مرارجی ڈیسائی ہوائی اڈے پر موجود تھا۔ وہ مجھے ایک طرف لے گیا اور میرے "بیان" پر مبارکباد پیش کی۔ میں نے کہا کہ میرے بیان پر تو مولانا آتش زیر پا ہیں اس پر مرارجی بولا "تو تمہیں کیا پرواہ ہے۔"

مولانا مذہبی تعصب سے رفیع احمد قدوائی کی طرح آزاد نہ تھے۔ ۱۹۵۲ء کے انتخاب کے سلسلے میں کانگریس کے امیدواروں کی نامزدگیاں جاری تھیں۔ مولانا روزانہ بہت سی چٹیں لے کر آتے جن پر مسلمان امیدواروں کے نام درج ہوتے پھر وہ ان امیدواروں کے حق میں زور لگاتے۔ ایس۔ مالیہ جو لال بہادر کے ساتھ کانگریس کا شریک جنرل سیکرٹری تھا اس سے عاجز آ گیا اس نے دو مرتبہ مولانا کا خوب مذاق اڑایا۔ جب تامل ناڈو کے لئے امیدواروں کی فہرست پر غور ہو رہا تھا تو مالیہ نے کامراج سے سازباز کی اور کامراج صبح کے اجلاس سے غائب ہو گیا۔ اس اجلاس میں مالیہ نے ایک خاص حلقے کے امیدوار پر اعتراض کیا اور تامل ناڈو کانگریس نے اس حلقے سے جس امیدوار کا نام تجویز کیا تھا اس کی جگہ ایک مسلمان کو ٹکٹ دینے کی تجویز پیش کی۔ مولانا اس پر بہت خوش ہوئے اور بولے "رکھو بھائی یہ نام رکھو"۔ سہ پہر کے اجلاس میں کامراج بھی آ گیا اور اس نے اس حلقے سے مسلمان امیدوار کے نام پر اعتراض کیا۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ مالیہ کو اتنے اہم قوم پرست مسلمان" کے بارے میں اتنی کم معلومات کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ مالیہ نے جس مسلمان امیدوار کا نام تجویز کیا ہے وہ تو تین سال قبل اللہ کو پیارا ہو چکا ہے۔ اب اجلاس میں موجود تمام افراد کامراج اور مالیہ کے سوا قہقہے لگا رہے تھے۔ اور مولانا احمق نظر آ رہے تھے۔

کانگریس میں مولانا کا سب سے بڑا "دشمن" پٹیل اور سب سے بڑے حامی نہرو تھے نہرو کو مولانا سے بڑا پیار تھا۔ وہ اختلاف کی صورت میں بھی مولانا کا بے حد احترام کرتے تھے۔ میں نے مولانا کی کتاب "انڈیا ونز فریڈم" کا پہلے بھی تذکرہ کیا ہے یہ کتاب ان دنوں کی پیداوار ہے۔ جب مولانا کے خیالات اعتماد کھو چکے تھے۔ اور فی الحقیقت مولانا یہ کتاب شام کے ان لمحات میں ہمایوں کبیر کو لکھوایا کرتے تھے جب وہ نشے کے عالم میں ہوتے تھے۔ اس کتاب کا غیر مطبوعہ حصہ قومی دستاویزات کے شعبے کے تحویل میں ہے۔ جب یہ حصہ چھپ کر منظر عام پہ آئے گا تو اس کا احتیاط سے جائزہ لیا جانا چاہیئے آنکھیں بند کر کے مولانا کی باتوں پر ایمان نہیں لے آنا چاہیئے۔

باب ۲۹

وہ کون تھی؟

اس باب کا صرف عنوان کتاب میں شامل ہے معلوم نہیں اس میں مصنف نے کیا لکھا تھا البتہ اس پر کتاب کے پبلشر نے جو نوٹ دیا ہے وہ درج ذیل ہے۔ (مترجم)

۱۔ یہ باب مصنف کے نہایت ہی ذاتی تجربات پر مشتمل تھا جسے اس نے ڈی ایچ لارنس لیڈی چیٹرجی کے مصنف کے انداز میں کسی رکھ رکھاؤ کے بغیر لکھا تھا۔ لیکن کتاب کی طباعت کے آخری مرحلے میں مصنف نے یہ باب واپس لے لیا تھا۔

یکم نومبر ۱۹۷۷ء

باب ۳۰

کرشنا مینن کیا تھا؟

وی کے کرشنا مینن ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوا۔ مدراس میں تعلیم پائی اور اینی بسنٹ کا چیلا بن گیا جس نے اسے سکاؤٹنگ کا انچارج مقرر کر دیا ۱۹۲۴ء میں اینی بسنٹ نے اسے انگلستان بھیج دیا جہاں وہ ایک سکول میں ٹیچر ہو گیا۔ ایک سال تک وہ مدرسی کرتا رہا اور اس نے مدرسی میں ڈپلوما بھی حاصل کر لیا۔ اس کے بعد وہ لندن سکول آف اکنامکس میں داخل ہو گیا اور ہیرالڈ لاسکی سے سیاسیات کا درس لیا۔ اس نے پولیٹیکل سائنس میں ڈگری حاصل کی۔ پھر وہ اینی بسنٹ کی قائم کردہ "کامن ویلتھ آف انڈیا لیگ" کا نائب سیکرٹری مقرر ہوا۔ ۱۹۳۴ء میں مڈل ٹمپل سے اسے بار ایٹ لا کی ڈگری مل گئی۔ یہ وہ دن تھے جب مڈل ٹمپل سے بار ایٹ لا کرنے کے لئے قانون کی تعلیم ضروری نہیں تھی بس مضحکہ خیز ڈنر جیکٹ پہن کر عشائیوں کی چند دعوتوں میں شریک ہونا ہی کافی تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کرشنا مینن نے لندن میں قانون کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھا اور لندن میں اس کی قانونی پریکٹس نہ ہونے کے برابر تھی۔

اس بات کا بڑا چرچا کیا گیا ہے کہ کرشنا مینن لندن میں کتابیں "ایڈٹ" کرتا رہا ہے۔ اس نے چند کتابیں ضرور مختصر کی تھیں وہ بوڈلے ہیڈ کے ایلن لین کا حصہ دار تھا جب ایلن نے دیکھا کہ کرشنا مینن اس کے اعصاب پر بوجھ بن گیا ہے تو اس نے اسے نکال باہر کیا۔ وہ اسے کام میں معاون کے بجائے رکاوٹ تصور کرتا تھا اور اس طرح یہ شراکت ختم ہو گئی۔ کرشنا مینن لندن کے غلیظ ترین علاقے میں مقیم رہا۔ کئی سال تک اس نے چائے کی لاتعداد پیالیوں اور چند

بسکٹوں پر گزارہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی صحت کا ستیاناس ہو گیا۔

جنوبی ہند کے ایک صحافی نے کرشنا مینن پر بہت کچھ لکھا ہے اور اپنی زبان دانی کی بدولت یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کرشنا مینن کا تعلق ایک یشتینی رئیس خاندان سے تھا اس کا باپ راجا تھا اور اسے شاہی مراعات حاصل تھیں مگر بے چارے کرشنا مینن نے اپنے کمیونسٹ نظریات کی وجہ سے باپ کی دولت پر لات ماردی حالانکہ وہ تو سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوا تھا۔ اور آپ یہ سب باتیں جنوبی کیرالہ کے کسی شہری کو بتائیں تو وہ ہنس دے گا حقیقت یہ ہے کہ کرشنا مینن کا باپ کرشنا کروپ تلی چری کے چھوٹے سے قصبہ کے ایک معمولی زمیندار کا جونیئر وکیل تھا۔ اس صحافی نے تو ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ کرشنا مینن دورِ جدید کا سدھارتھ (گوتم بدھ) تھا۔ جو دنیاوی الائشوں سے بھاگ کر گیان دھیان پر نکلا ہوا تھا۔

جب کامن ویلتھ آف انڈیا لیگ کا خاتمہ ہوا تو کرشنا مینن اسے انڈیا لیگ میں بدل کر اس کا سیکرٹری بن بیٹھا۔ انگلستان میں مقیم خوشحال ہندوستانیوں نے جو اکثر و بیشتر ڈاکٹر تھے۔ انڈیا لیگ کی مالی امداد کی۔ کرشنا مینن اسے بلاشرکت غیرے چلاتا رہا۔ اور اس نے تنظیم کی مالیات کا حساب بھی پیش کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ اپنی ذاتی ضروریات کے لئے بھی مالی امداد حاصل کرتا رہا مگر شکر گزاری کا مادہ تو اس کی فطرت میں ہی نہ تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس ایجی ٹیٹر کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ مقصد کو اپنی ذات کا جزو بنا لیتا تھا۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر آپ ہندوستان کی آزادی کے حامی ہیں تو پھر آپ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ آپ کرشنا مینن کی حمایت کریں۔ کسی اور کی حمایت وطن دشمنی کے مترادف ہو گی۔ اس کا ایمان تھا "جو میرے ساتھ نہیں وہ میرے مخالف ہیں" اور وہ اس تصور کو تسلیم ہی نہیں کرتا تھا کہ "جو میرے خلاف نہیں ہیں وہ میرے ساتھ ہیں" اصل بات یہ ہے کہ قدرت نے اسے برداشت کا مادہ عطا ہی نہیں کیا۔

کرشنا مینن کو ۱۹۴۷ء میں لندن میں بھارت کا ہائی کمشنر مقرر کیا گیا۔ میں تاڑ چکا تھا کہ وہ

بھیڑیے کی طرح اکیلا شکار کرنے کا عادی ہے اور دوسروں سے مل کر شکار کرنا اس کی فطرت کے منافی ہے۔ وہ اپنے سابقہ حامیوں اور مددگاروں سے سخت بیزار تھا۔ میں نے کرشنا مینن سے پوچھا "کیا تم اس نظریے پر یقین رکھتے ہو کہ محبت کا جذبہ نفرت کے جذبے سے قوی تر ہے"؟ اس نے جواب دیا "ہاں یہ درست ہے" غالباً اس نے ترگنیف کا وہ افسانہ نہیں پڑھا تھا جس میں اس واقعہ کا ذکر ہے کہ ایک خونخوار کتے کے مقابلے میں ایک پرندے نے کس طرح اپنے بچے کو بچایا تھا۔ جب یہ خونخوار کتا پرندے کے بچے کی طرف بڑھا تو اس کی ماں نے غیر معمولی حوصلے اور ناقابل یقین جارحانہ انداز میں اپنے بچے کا دفاع کیا اور خونخوار کتا پسپا ہونے پر مجبور ہو گیا۔ اس سے مصنف نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ "محبت کا جذبہ نفرت کے جذبے سے زیادہ مضبوط ہے" میں نے کرشنا مینن سے کہا کہ وہ ترگنیف کا یہ افسانہ ضرور پڑھے۔ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ کرشنا مینن نے اس افسانے سے کوئی سبق نہ سیکھا تھا۔

گاندھی جی نے جب انگریزوں سے عدم تعاون کی تحریک شروع کی تو کرشنا مینن کے سرپرست بسنت کی بیوی نے "نیو انڈیا" میں اپنا مشہور ایڈیٹوریل لکھا جس میں کہا گیا تھا کہ "اینٹ کا جواب گولی سے دیا جائے"۔ پھر وہ مسز بسنت اور اس کے حامی گاندھی جی کی تحریک کے خلاف میدان میں نکل آئے۔ سری نواس شاستری اور اس کے ساتھیوں نے گاندھی جی کے خلاف لیکچروں کا طویل سلسلہ شروع کر دیا۔ گاندھی جب دوسری گول میز کانفرنس کے لئے لندن گیا تو کرشنا مینن نے وہاں گاندھی کے خلاف ایجی ٹیشن شروع کر دیا۔ ابھی گاندھی سمندری جہاز میں ہی تھا کہ کرشنا مینن نے ہندوستانیوں کے ایک مختصر سے گروہ کے سامنے ہاتھ ہلا ہلا کر تقریر کرتے ہوئے کہا "میں چاہتا ہوں کہ وہ جہاز جس میں گاندھی آ رہا ہے اس بڈھے سمیت غرق ہو جائے" دراصل مینن نے اپنا دماغ مسز بسنت کے پاس گروی رکھا ہوا تھا اور وہ اب تک اس کے اثرات سے آزاد نہیں ہوا۔

کرشنا مینن کی آنکھیں اس وقت کھلیں جب ہندوستان میں گاندھی جی کی سول

نافرمانی کی تحریک چلی اور لوگوں پر مظالم کی خبریں انگلستان پہنچیں۔ ۱۹۳۲ء میں کرشنا مینن انڈیا لیگ کا ایک وفد لے کر ہندوستان آیا۔ یہ وفد لیبر پارٹی کے تین ارکان پارلیمنٹ پر مشتمل تھا۔ اس نے یہاں نہرو سے ملاقات بھی کی۔ مگر نہرو سے اس کا اصل رابطہ اس وقت ہوا جب نہرو اپنی اہلیہ کملا نہرو کی بیماری کے سلسلے میں لندن گئے۔ لندن میں کرشنا مینن نہرو کے پروگرام کا منتظم بن گیا۔ نہرو نے وہاں اپنی "خود نوشت سوانح" کی اشاعت کے سلسلے میں کرشنا مینن کو نمائندہ بھی مقرر کر دیا۔ اس کے بعد بھی نہرو جب غیر ملکی دوروں پر جاتے رہے جو زیادہ تر کملا نہرو کے علاج معالجہ کے سلسلے میں تھے کرشنا مینن کا ان سے رابطہ تھا۔

کرشنا مینن سے میری اولین ملاقات ۱۹۴۶ء میں ہوئی جب میں دہلی آیا ہوا تھا۔ وہ ان دنوں آیا تھا جب ۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو عبوری حکومت قائم ہوئی۔ مجھے اس کی سوکھی سڑی اور بھوکی بھوکی صورت پسند نہ آئی۔ اس کی ناک تو کسی گدھ کی چونچ سے مشابہ تھی۔ اس کے بال پریشان تھے جنہیں دیکھ کر لوگوں کو مسلسل احساس ہوتا تھا کہ اس کی حجامت بننے والی ہے اس نے معمولی سا سوٹ پہن رکھا تھا جس کی سلائی بھی نہایت ناقص تھی۔ وہ ہیٹ پہنے ہوئے نہ تھا ورنہ اس حلیے میں وہ کوئی آوارہ بدمعاش دکھائی دیتا۔ القصہ اس میں وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو طویل عرصہ تک لندن کی گندی آبادیوں میں رہنے والوں میں ہوتی ہیں۔

نہرو کے ایما پر بھارت کے آئین کا دیباچہ کرشنا مینن نے لکھا تھا۔ نہرو نے اس کے مسودے کو دیکھا اور زبانی بعض ترامیم کرانے کے بعد اسے آئین ساز اسمبلی میں پیش کر دیا۔ جب ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کا وائسرائے بن کر آیا تو کرشنا مینن نے "کیشن ایجنٹ" کا کردار ادا کرنا شروع کیا جس سے پٹیل اور مولانا آزاد سخت سیخ پا ہوئے۔ سردار پٹیل نے تو کرشنا مینن کو آخر وقت تک نہ بخشا۔ وہ کرشنا مینن سے کبھی ڈھنگ سے ملنے پر بھی رضامند نہیں ہوئے جب بھی کرشنا مینن پٹیل سے ملاقات کی خواہش ظاہر کرتا۔ سردار پٹیل کے ہاں سے جواب آتا: "صبح پانچ بجے آجاؤ" اس وقت سردار پٹیل سیر کے لئے گھر سے نکلتے تھے۔ بے چارے

کرشنا مینن کو صبح اٹھ کر پٹیل کے پاس جانا پڑتا کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔

ایک دن نہرو نے مجھے بتایا کہ ماؤنٹ بیٹن نے ان سے کرشنا مینن کا تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ کرشنا مینن کا تعلق کوچین کے شاہی خاندان سے ہے اور جیسا کہ کوچین میں ماں کی طرف سے وراثت کا نظام رائج ہے۔ کرشنا مینن جلد ہی کوچین کا مہاراجہ بن جائے گا۔ نہرو نے مجھ سے پوچھا کہ آیا مجھے اس بارے میں کچھ پتہ ہے۔ میری ہنسی نکل گئی۔ میں نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ کرشنا مینن ماؤنٹ بیٹن کو گھڑ سواری کے لئے لے گیا تھا۔ میں نے نہرو کو بتایا کہ مجھے بھی کرشنا مینن نے اپنے شاہی خاندان سے تعلق کے بارے میں بتایا تھا جس سے میں بے حد محظوظ ہوا۔ دراصل لندن کی کچی آبادیوں میں رہ کر بھوک اور افلاس کا مارا کرشنا مینن احساس کمتری کا شکار ہو گیا تھا۔ اس لئے وہ تصور میں شاہی خاندان سے اپنے فرضی رشتے کی داستانیں گھڑتا رہتا تھا۔ کرشنا مینن کی ایک بہن نرائن اماں کوچین کے حکمران خاندان کے ایک غریب سے فرد سے بیاہی ہوئی تھی۔ یہ شخص حکومت مدراس کے سیکرٹریٹ میں ملیالم زبان کا مترجم تھا وہ ریٹائرمنٹ کے بعد کوچین چلا گیا۔ آخر عمر میں وہ کوچین کے حکمران خاندان کا سب سے معمر فرد ہونے کی حیثیت میں مختصر سے عرصہ کے لئے کوچین کا مہاراجہ قرار پایا۔ اب کوچین کے نظام وراثت میں مہاراجہ کی بیوی کی حیثیت داشتہ سے زیادہ نہیں ہوتی اور مہاراجہ کی بہنوں کے بیٹے تخت کے وارث ہوتے ہیں۔ مہاراجہ اپنی "مہارانی" کو خاندانی جائداد یا دولت سے ایک حبہ بھی دینے کا مجاز نہیں ہوتا۔ نہرو نے مجھ سے کہا کہ میں ماؤنٹ بیٹن کو اس معاملے میں معلومات فراہم کر دوں، تاہم میں نے ایسا کرنا ضروری نہ سمجھا لیکن حال ہی میں ماؤنٹ بیٹن نے لندن میں مجھ سے کرشنا مینن کے شاہی خاندان کی بات چھیڑی تو مجھے اس کی غلط فہمی دور کرنا پڑی۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب بھارتی کابینہ کا قیام عمل میں آیا۔ نہرو کرشنا مینن کو وزیر بنانا چاہتے تھے مگر گاندھی جی نے سختی سے مخالفت کی۔ اور نہرو کو اس خیال سے دستبردار ہونا پڑا۔ اس واقعہ کا سردار پٹیل تک کو علم نہیں اور کرشنا مینن کو تو خیر یہ واقعہ کبھی بتایا ہی نہیں

گیا۔ نہرو کرشنا مینن کو لندن میں ہائی کمشنر بھی بنانا نہیں چاہتے تھے مگر اس نے ماؤنٹ بیٹن کی امداد حاصل کی اس نے نہرو سے سفارش کی اور گاندھی جی سے بھی ذاتی طور پر بات کی تب کہیں جاکر کرشنا مینن کی بات بنی اور کرشنا مینن کو ہائی کمشنر مقرر کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس کے دو روز بعد کرشنا مینن میرے پاس آیا۔ اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ وہ چھوٹتے ہی بولا "میں نے اے چندا کو لندن میں ڈپٹی ہائی کمشنر مقرر کرایا ہے وہ دہلی میں سول سروس کا بہترین دماغ ہے"۔ میں نے کرشنا مینن کو بتایا کہ اگر تم چندا کو آزادی عمل دو اور اسے کام میں لگائے رکھو تو وہ واقعی کارآمد ثابت ہوگا لیکن اگر تم نے اسے بے کار رکھا اور اسے نظر انداز کرتے رہے تو وہ ایک مصیبت ثابت ہوگا۔ ۱۹۴۸ء میں جب لندن میں کرشنا مینن سے میری ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے بڑی تلخی سے بتایا کہ چندا تو بیکار محض ثابت ہوا ہے۔ میں نے پوچھا کہ "دہلی کی سول سروس کا بہترین دماغ" اچانک کیسے نکما ہو گیا۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ دراصل کرشن مچاری کی طرح کرشنا مینن بھی جذبات کی رو میں بہہ جاتا ہے میرا اندازہ ہے کہ پیٹ کے السر کے بیشتر مریض جذباتیت کے شکار ہوتے ہیں۔ ہوا یہ کہ۔ کرشنا مینن جذبات میں آکر چندا کو لے تو آیا مگر لندن میں آکر اسے آزادی عمل سے بالکل محروم رکھا۔ بس پھر کیا تھا چندا کو شکایت پیدا ہوئی جو بڑھتی گئی اور چندا کسی نہ کسی طرح واپس ہندوستان جانے کی جدوجہد میں مصروف رہا۔

۱۹۴۸ء میں نہرو دولت مشترکہ کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے میں بھی ساتھ تھا کرشنا مینن نے جو ہائی کمشنر تھا مجھے چند بھارتیوں کے نام دیئے اور کہا کہ ان لوگوں کو وزیراعظم سے ملاقات کی اجازت نہیں دی جانی چاہیئے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سب ممتاز بھارتی تھے جو کرشنا مینن اور انڈیا لیگ کی خلوص سے مدد کرتے رہے تھے۔ میں نے کرشنا مینن سے کہا کہ وزیراعظم کو کسی ایک دھڑے کا ساتھ نہیں دینا چاہیئے اور ان سے سب کو ملنا چاہیئے۔ چنانچہ یہ لوگ بھی پنڈت نہرو سے ملے۔ لندن میں بنگالیوں کا ایک گروپ بھی تھا جس نے کرشنا مینن کی انڈیا لیگ کے مقابلے میں اپنی تنظیم قائم کر رکھی تھی۔ جب کرشنا مینن ہائی کمشنر بن کر لندن پہنچا تو انہوں نے سرت چندر بوس

کو بلایا جس نے لندن میں کرشنا مینن کے خلاف زبردست تقریریں کیں۔ سرت چندر بوس نے اپنی تقریروں میں نہرو کی خارجہ پالیسی کو بھی شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس کی یہ تقریریں بھارت کے اخبارات میں بھی خوب چھپیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایسا سردار پٹیل کے ایما پر ہوا تھا۔ جو وزارتِ داخلہ اور اطلاعات کے انچارج تھے۔

سرت چندر بوس سبھاس چندر بوس کا چھوٹا بھائی تھا اور لندن میں اس کی تقریریں اس کے بھائی کی کانگریس پر تنقید کا ہی دوسرا باب تھیں۔ سبھاس چندر بوس کانگریس کے صدر رہ چکے تھے مگر وہ ہٹلر اور نازی حکومت کی پالیسیوں کے حامی تھے جبکہ کانگریس کی پالیسی نازی مظالم کے خلاف تھی اور اس پر کانگرسی احتجاج بھی کرتے رہتے تھے۔ بالآخر ۱۹۳۹ء میں سبھاس چندر بوس کانگریس کی صدارت سے عہدہ برآ ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے کانگریس کی اس قدر مخالفت کی کہ کانگریس کی مجلس عاملہ کو پارٹی کے سابق صدر کے خلاف انضباطی کارروائی کرنا پڑی۔ لندن میں سرت چندر بوس کی تقریروں کا ایک مستقل اثر ہوا۔ وہ یہ کہ نہرو کرشنا مینن پر نکتہ چینی کو اپنی ذات پر حملہ تصور کرنے لگے اور ۱۹۶۲ء تک جب کرشنا مینن حکومت سے نکل گئے۔ نہرو کا یہ رویہ قائم رہا۔ کرشنا مینن اور اس کے حواریوں کو نہرو کا یہ تصور راس آتا تھا۔ چنانچہ وہ اسے پھیلانے میں مصروف ہو گئے۔ اندرا بھی نہرو کے اس تصور کا شکار ہو گئی۔

لندن میں ہائی کمشنر بنتے ہی کرشنا مینن نے مقامی ہندوستانیوں کو خاصی تعداد میں ہائی کمیشن کے عملے میں بھرتی کر لیا۔ ان میں سے بعض معروف کمیونسٹ تھے یا ان کے کمیونسٹوں سے گہرے مراسم تھے۔ کرشنا مینن یہ اندازہ لگانے میں ناکام رہا کہ برطانیہ کی لیبر حکومت کمیونسٹوں اور ہمسفروں کو پسند نہیں کرتی۔ جلد ہی برطانوی دفترِ خارجہ نے اپنے ہائی کمشنر کی وساطت سے دہلی میں وزارتِ خارجہ کو اس صورتِ حال سے مطلع کیا اور بتایا کہ برطانوی حکومت نے بامرِ مجبوری فیصلہ کیا ہے کہ جب تک بھارتی ہائی کمیشن میں کمیونسٹ اور ان کے ہم جلیس موجود ہیں وہ کوئی خفیہ نوعیت کا مواد انڈیا ہاؤس کو فراہم نہیں کرے گی۔ اس پر نہرو کرشنا مینن سے ناراض ہو گئے اور

دولت مشترکہ کی وزارت کے سیکرٹری ایس دت کو لندن تحقیقات کے لیے بھیجا۔ کرشنا مینن نے دت کی آمد پر احتجاج کیا لیکن بالآخر کرشنا مینن کو مقامی طور پر بھرتی کیے گئے عملہ کے بہت سے افراد کو ملازمت سے الگ کرنا پڑا۔ یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ دو سال کے اس نازک عرصہ میں جب کرشنا مینن لندن میں ہائی کمشنر تھا اس نے بڑی مہارت سے سیاسی مسائل نمٹائے۔ اس کا اعتراف بھارتی اور برطانوی قائدین نے بھی کیا ہے لیکن انتظامی معاملات میں اس نے انڈیا ہاؤس (ہائی کمشن) میں نراج کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ یکے بعد دیگرے سکنڈل بنے اور ان میں اضافہ ہوتا گیا تا آنکہ کرشنا مینن پر مواخذے کا خوف جنون کی حد تک طاری ہو گیا۔ جوں جوں پارلیمنٹ میں اس کی بدمعاملگی پر تنقید زور پکڑتی گئی اس نے حقائق سے فرار اختیار کر لیا اور تیز نشیات کے دامن میں پناہ لی۔ ۱۹۵۰ء تک کرشنا مینن ذہنی اور جسمانی طور پر تقریباً ناکارہ ہو چکا تھا۔

باب ۳۱

کرشنا مینن — ایک نشہ باز

۱۹۴۹ء کی دوسری ششماہی میں پارلیمنٹ میں کرشنا مینن کے خلاف احتجاج میں اضافہ ہو گیا تو وزیر اعظم نے وزارتِ خارجہ کے سیکرٹری جنرل پلائی کو لندن بھیجا کہ وہ سارے معاملات کی تحقیقات کر کے وزیر اعظم کو رپورٹ پیش کرے۔ پلائی ۱۹۵۰ء کے اوائل میں لندن گیا اور اسی طرح واپس آ گیا جس طرح ایس۔ دت گیا اور واپس آیا تھا۔ پلائی نے کوئی تحریری رپورٹ پیش کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ مگر وزیر اعظم کو یہ بتایا کہ کرشنا مینن کے مختلف معاملات میں بھاری رقوم کا لین دین ہوا ہے۔ اس نے یہ تو نہ کہا کہ کرشنا مینن نے یہ رقوم اپنی ہی جیب میں ڈال لی ہیں مگر اس کے بقول اس بات کا غالب امکان تھا کہ یہ رقوم انڈیا لیگ نے وصول کی ہوں۔ یہ وہ تنظیم تھی جس کا کرشنا مینن خود ساختہ سیکرٹری تھا۔ اور اس نے تنظیم کو ملنے والی رقوم کا حساب کتاب دینے انکار کر دیا تھا۔ پلائی کا کہنا تھا کہ کرشنا مینن نے تنخواہ نہ وصول کر کے اپنے خلاف شکوک و شبہات میں اضافہ کر لیا ہے۔ لندن میں لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ کرشنا مینن کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آ گیا کہ تنخواہ وصول نہ کرنے کے باوجود اس کی الماریاں قیمتی ملبوسات سے پٹی پڑی ہیں — کرشنا مینن نے حکومت سے مہمانداری الاؤنس کے طور پر جو خطیر رقم وصول کی تھی اس کا حساب بھی پیش کرنے سے انکار کر دیا۔ اس سے صورت حال اور الجھ گئی۔ کیونکہ یہ

بات توسب جانتے تھے کہ کرشنا مینن انڈیا ہاؤس کی کنٹین کے سوا کسی اور جگہ کسی کا خاطر مدارات نہیں کرتا۔ اس کنٹین میں اشیاء نہایت سستے داموں ملتی تھیں۔ کیونکہ ہائی کمیشن کے ملازموں کی سہولت کے لئے حکومت اس کنٹین کو سستی اشیاء فروخت کرنے کے لئے نقد امداد دیتی تھی۔ پلائی نے وزیر اعظم کو بتایا کہ کرشنا مینن کے مختلف معاملات کے متعلق سکینڈل پارلیمنٹ میں اور پبلک اکاؤنٹس کمیٹی میں پیش ہو چکے ہیں اب حکومت کو ان معاملات سے بطریق احسن ہی عہدہ برآ ہونا پڑے گا۔ پلائی نے صورتحال کا ماحصل یوں بیان کیا کہ اب کرشنا مینن کے معاملہ میں حکومت کو سیاسی بنیادوں پر کوئی فیصلہ کرنا پڑے گا۔ مگر نہرو نے پلائی کے اشارے کو درخور اعتنا سمجھا اور معاملہ کھٹائی میں پڑا رہا۔

ادھر پارلیمنٹ میں کرشنا مینن پر نکتہ چینی زور پکڑ گئی۔ اس اثنا میں لندن سے آنے والے لوگوں نے جن میں راج کماری امرت کور شامل تھیں یہ بتایا کہ انڈیا ہاؤس میں کام بالکل معطل ہو کر رہ گیا ہے۔ کرشنا مینن تیز منشیات کی گود میں پناہ لئے رہتے ہیں۔ اور اس کے بارے میں بعض جنسی سکینڈل بھی منظر عام پر آنے لگے ہیں ۔۔۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں وزیر اعظم نے مجھے ہدایت کی کہ میں لندن جا کر کرشنا مینن سے بات کروں اور حالیہ موصول شدہ اطلاعات کی بھی چھان بین کروں۔ نہرو جانتے تھے کہ کرشنا مینن سے میری کوئی عداوت نہیں۔ اور میں جو بھی رپورٹ دوں گا وہ حقائق پر مبنی ہوگی۔ میں لندن گیا اور انڈیا کلب میں مقیم ہوا۔ جو انڈیا ہاؤس کے بالکل قریب ہے۔

انڈیا ہاؤس پہنچتے ہی میری نظر ایک خفیہ تار پر پڑی جو دلی سے میری روانگی سے بھی ایک ہفتہ پیشتر نہرو نے برطانوی وزیر دولت مشترکہ لارڈ ہیوم کو بھیجا تھا۔ یہ تار ابھی تک کرشنا مینن کی میز پر پڑا تھا۔ میں نے یہ تار اٹھایا اور ہائی کمیشن کے فرسٹ سیکرٹری پی این ہسکر کے پاس گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ تار ابھی تک یہاں کیوں پڑا ہے؟

تو اس نے مجھے بتایا کہ اس قسم کی تاریں ہائی کمشنر کو ہی بھیجی جاتی ہیں اور پھر ان کی اجازت ملنے پر متعلقہ اصحاب تک پہنچائی جاتی ہیں۔ میں نے مسکرا کے کہا تم سمجھ لو ہائی کمشنر نے اجازت دے دی ہے اور یہ تار فوراً تعلقات دولت مشترکہ کی وزارت کو بھجوا دو۔ اس کے بعد میں دوبارہ کرشنا مینن کے پاس گیا۔ میں نے اسے گندھے سے پکڑ کر ہلایا۔ اور کہا۔

"کرشنا مینن، ہوش کرو۔ میں تم سے صرف اس صورت میں کوئی بات کر سکتا ہوں کہ تم ہوش میں ہو اگر تم نے ہوش میں آنے کی کوشش نہ کی تو میں اگلی پرواز سے دلی لوٹ جاؤں گا۔ اس شام کو کرشنا مینن انڈیا کلب میں میرے کمرے میں آیا۔ وہ قدرے ہوش میں تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں معاملات کی بلاوجہ تشہیر نہیں چاہتا۔ میں تم سے، تمہارے مخلص دوستوں اور تمہارے برطانوی نفسیاتی معالج سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ بشرطیکہ تم خود میرا اُن سے تعارف کراؤ۔ اگر ماؤنٹ بیٹن نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے تمہارے برطانوی معالج سے ملوا دے گا۔ میں سب سے پہلے جس شخص کو ملا وہ ڈاکٹر مانڈو تھا۔ جو کرشنا مینن کا پرانا دوست اور مددگار تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ کرشنا مینن مریض بیمار ہے اور تقریباً پاگل ہو چکا ہے۔ وہ تیز نشہ آور ادویات استعمال کرتا ہے۔ اس نے اس امر پر تعجب کا اظہار کیا کہ نہرو نے اب تک کرشنا مینن کو برطرف کیوں نہیں کیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے مجھے بتایا کہ برطانوی وزیر اعظم ایٹلی اور پھر حکومت کے اہم وزراء یہ محسوس کرتے ہیں کہ کرشنا مینن کو تو اب سے ایک سال پہلے ہٹا دیا جانا چاہئے تھا۔ خود ماؤنٹ بیٹن بھی محسوس کرتے تھے کہ اس کی جگہ اور کا تقرر کیا جانا ضروری ہے۔ پی این ہسکر نے جو اس وقت ایک جونیئر افسر تھا کھل کر بات کی اور کرشنا مینن کی جگہ کسی اور کے تقرر پر زور دیا۔ اس نے کہا کہ یہ کام کچھ عرصہ پیشتر ہی ہو جانا چاہئے تھا۔ میری درخواست پر اس نے دستخطوں کے بغیر مجھے ایک نوٹ لکھ دیا جس میں صورت حال کی تفصیلی وضاحت کی گئی تھی۔ یہ نوٹ وزیر اعظم کو پیش کیا جانا تھا۔

کرشنا مینن کے برطانوی معالج سے بھی میری بات ہوئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ کرشنا مینن اور اس کے عملے کی ایک خاتون کا بجلی کے جھٹکوں کی مدد سے علاج کیا جا رہا ہے۔ کرشنا مینن کی حالت ایسی ہے کہ اسے تو ایسے دفتر کے بجائے جہاں اہم فرائض انجام دینا پڑتے ہوں کسی نرسنگ ہوم میں ہونا چاہئے۔ وہ ذہنی مریض ہے اور اس پر جنون کی حد تک تعزیری کارروائی کا خوف طاری ہے۔ اس معالج نے مزید کہا کہ کرشنا مینن کی اصل بیماری یہ ہے کہ اس بوالہوس نے حسن پرستی کو شعار بنا لیا ہے اور اپنی بداعتدالیوں کی بدولت اب وہ صرف دکھاوے کا مردہ گیا ہے۔ مردانہ صفات سے محرومی کا یہ احساس اُسے کھائے جا رہا ہے۔ اس لئے وہ نفسیاتی الجھنوں میں پھنس کر رہ گیا ہے اور اس سے حماقت پر حماقت سرزد ہو رہی ہے۔ اس کا عجیب و غریب طرزِ عمل اور جارحانہ انداز اسی حقیقت کی پیداوار ہے ڈاکٹر نے وزیر اعظم کو دکھانے کے لئے مجھے ایک ذاتی نوٹ بھی لکھ دیا۔ یہ نوٹ ڈاکٹر کے لیٹر پیڈ پر تھا۔ تاہم اس نے نوٹ پر دستخط نہیں کئے تھے۔

ایک شام کرشنا مینن انڈیا کلب میں میرے کمرے میں آیا اور اپنے ساتھ ایک شخص کلیمن سن کو بھی لایا۔ کلیمن سن ایک مہم جو تھا جو کرشنا مینن کے متعدد معاملات میں ملوث رہ چکا تھا۔ کرشنا مینن اسے میرے کمرے میں چھوڑ کر خود کھسک گیا اس کا خیال تھا کہ وہ مجھ سے کرشنا مینن کے ان معاملات کے بارے میں وضاحت کروں گا۔ مگر اس نے مجھے اپنے فلیٹ پر ہونے والے واقعات سنانے شروع کر دیئے۔ اس نے بتایا کہ گزشتہ رات کرشنا مینن اور اس کے عملہ کی وہی لڑکی جو بجلی سے علاج کرا رہی ہے میرے فلیٹ پر آئے وہ نشے میں دھت تھی اس نے اپنا لباس اتار دیا اور اس کے ساتھ ناچنے لگی۔ لڑکی جذباتی ہو گئی مگر کرشنا مینن میں اس کے جذباتی تقاضوں کی تکمیل کی صلاحیت کہاں رہ گئی تھی۔ اس قسم کے لاحاصل تعلقات کے نتیجہ میں وہ لڑکی ہسٹریا میں مبتلا ہو گئی اور دفتر میں بھی چیخ و پکار کرتی رہتی ہے۔ کلیمن سن نے اس طرح کے اور بھی متعدد واقعات سنائے اور چلا گیا۔

کرشنا مینن کے مالی معاملات کے بارے میں اس نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔

کرشنا مینن نے خود بھی مجھ سے بات چیت کی۔ وہ مختلف معاملات کے بارے میں بتاتا رہا جو اس نے بدنام دلالوں کے توسط سے طے کئے تھے۔ مگر ان میں حکومت کو کافی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ وہ دہلی میں بعض سرکاری ملازموں اور وزراء کے بارے میں سراپا شکایت تھا۔ اس نے مجھ سے جو آخری بات چیت کی اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ یا تو وہ معصوم ہے یا پھر بالکل باؤلا ہو گیا ہے۔ اس نے کہا کہ حکومت کو یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ لندن میں ہائی کمشنر کا عہدہ وزیر اعظم کے عہدے کے بعد ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ اور صدرِ مملکت کو ایک حکم کے ذریعے اس وقت تک مجھے نائب وزیر اعظم کا عہدہ دینا چاہئے جب تک میں لندن میں ہائی کمشنر ہوں۔ کرشنا مینن کے کیا کہنے اگر وہ پیرو میں بھی بھارت کا سفیر ہوتا تو اپنے لئے نائب وزیر اعظم کا عہدہ ضروری قرار دیتا۔

دہلی لوٹنے پر میں نے وزیر اعظم کو لندن میں اپنی ملاقاتوں کا حال مختصراً آسنایا اس بات پر زور دیا کہ جتنی جلد ممکن ہو کرشنا مینن کی جگہ کسی دوسرے ہائی کمشنر کا تقرر کر دیا جائے۔ میں نے کہا کہ کرشنا مینن کو یہ مشورہ دیا جائے کہ وہ اپنی استحقاقی چھٹی لے کر کسی ہسپتال میں داخل ہو جائے۔ مکمل آرام کرے اور علاج معالجہ کرائے۔ میں نے تجویز پیش کی کہ اس سلسلے میں وزیر اعظم اسے چٹھی لکھیں جس میں یہ بھی تحریر ہو کہ ۱۹۵۲ء کے انتخابات کے بعد اسے کابینہ میں لے لیا جائے گا۔ نہرو نے میری رائے اتفاق کرتے ہوئے چٹھی لکھ دی اور ۱۲ر جون ۱۹۵۲ء کو بی۔ بی کہر نے کرشنا مینن سے ہائی کمشنر کا چارج لے لیا۔ کرشنا مینن لندن میں ہی ٹھہرا رہا اور اس نے نرسنگ ہوم جانے سے انکار کر دیا۔ مئی ۱۹۵۲ء کے انتخابات کے بعد نہرو نے اسے کابینہ میں بھی نہ لیا۔

کرشنا مینن لندن میں ہائی کمشنر کے عہدے پر فائز ہونے کے دوران اپنے یہودی استاد ہرالڈ لاسکی کے زیر اثر بھارتی حکومت کو بار بار مشورہ دیتا رہا کہ اسرائیل سے

سفارتی تعلقات قائم کر لئے جائیں۔ نہرو بھی اسرائیل سے سفارتی تعلقات کے حامی تھے کیونکہ وہ اسے صحیح سمت میں اقدام تصور کرتے تھے کیونکہ بھارت نے اسرائیل کو تسلیم کر رکھا ہے اور اسرائیل اقوام متحدہ کا رکن بھی ہے۔ اسرائیل سے سفارتی تعلقات کی راہ میں ابوالکلام آزاد حائل رہا۔ آزاد کا مؤقف یہ تھا کہ اس طرح عربوں کو متاثر نہیں کر سکے گا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بھارت کی خارجہ پالیسی میں عربوں کی طرف جھکاؤ نمایاں ہو گیا۔ اگرچہ یہ بات بھارت کے مفاد میں تھی مگر اس سے بھارت کی غیر جانبدارانہ پالیسی پر زد پڑی۔ کرشنا مینن بھی بعد میں بدل گیا اور اپنے گرو ہرالڈ لاسکی کی موت کے بعد یہ احمق یہاں تک آگے بڑھ گیا کہ قاہرہ میں ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے اس نے کہا "عربوں کو متحد ہو کر اسرائیل کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دینا چاہیے"۔ اس پاگل نے یہ بھی کہا کہ "مگر اس سے سمندر کا پانی بھی گندہ ہو جائے گا"۔ کرشنا کو ۱۹۵۲ء میں اقوام متحدہ میں بھارتی وفد کا رکن بنا دیا گیا۔ اس وفد کی سربراہ مسز وجے لکشمی پنڈت تھیں۔ وجے کے جنرل اسمبلی کی صدر ہونے کے بعد کرشنا مینن وفد کا لیڈر بن گیا۔ اس نے کوریا کے بحران میں مفید کردار انجام دیا جس کے صلے میں بھارت کو کوریا کے متعلق اقوام متحدہ کے کمیشن کا چیئرمین منتخب کیا گیا اور بھارت کے جنرل تھمیا اس عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۵۳ء میں کرشنا مینن کو راجہ سبھا کا رکن منتخب کر لیا گیا۔

بھارت اور چین کے تعلقات کی خرابی کا بیج بھارتی سفیر مقیم پیکنگ کے ایم پانیکر نے بویا تھا۔ اس نے اس بات کی پُرزور وکالت کی کہ بھارت تبت پر چین کی بالادستی رسمی طور پر تسلیم کرے۔ تبت پر چین کی بالادستی سے کسی کو انکار نہ تھا کیونکہ سال ہا سال کی تاریخ تبت پر چین کی بالادستی اور سرداری کی شاہد تھی مگر پانیکر نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا تھا کہ ایک مدت سے تبت عملاً خود مختار ہے نہرو کی خواہش تھی کہ تبت پر چین کی بالادستی تسلیم کرنے کے ساتھ ہی میکموہن لائن کا سوال بھی اٹھایا جائے کہ چین اسے تسلیم

کرے مگر پانیکر نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح معاملہ کے نمٹنے میں تاخیر ہو جائے گی۔ پانیکر یہ محسوس ہی نہ کر سکا کہ جس چین سے وہ معاملہ کر رہا ہے وہ ایک طاقت ور ملک کی حیثیت سے ابھر چکا ہے اور تبت کی خود مختاری کے دن پورے ہونے والے ہیں۔ پانیکر کا خیال تھا کہ چین یہ مؤقف اختیار کرے گا کہ میکموہن لائن تو سامراجیوں کی تخلیق ہے۔ چین اور بھارت سرحدی مسئلہ کو مساوی بنیادوں پر حل کر لیں گے۔[1] پانیکر کا خیال تھا کہ اگر ہم نے صبر سے کام لیا تو میک موہن لائن کے مسئلہ کا حل بھی نکل آئے گا۔ اور نہرو نے اس موقف کو تسلیم کر لیا۔

پانیکر کو ایک تار ارسال کیا گیا جس میں اسے یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ حکومت چین کو رسمی طور پر اطلاع دیدے کہ بھارت تبت پر چین کی بالادستی (SOZERAINTY) تسلیم کرتا ہے مگر جب پانیکر نے حکومت چین کو مراسلہ بھیجا تو اس نے بالادستی کو اقتدار اعلیٰ (SOVEREIGNTY) سے بدل دیا۔ جب پانیکر کو بعد میں پوچھا گیا کہ یہ کیسے ہوا تو اس نے معروف بہانہ گھڑ دیا کہ بھارت سے چین ترسیل کے دوران تار کا لفظ بگڑ گیا ہو گا۔ اس پر مجھے دوسری جنگِ عظیم کا ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ "جب انتھونی ایڈن لندن سے قاہرہ جانے لگا تو چرچل نے اس سے درخواست کی کہ اگر ممکن ہو تو میرے بیٹے رینڈولف کو اسماعیلیہ کر اس کا حال احوال دریافت کر لینا۔ ایڈن نے ایسا ہی کیا اور رینڈولف نے کچھ وقت ریڈن کے ساتھ قاہرہ میں گزارا۔ قاہرہ سے ریڈن نے چرچل کو ایک مختصر سا خفیہ تار ارسال کیا۔ رینڈولف سے ملاقات ہوئی جو ابھی ابھی آیا ہے۔ وہ آپ کو سلام کہتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے جنگ (BATTLE) کی روشنی صاف جھلک رہی

---

[1] چین کا مؤقف فی الحقیقت یہی ہے مگر بھارتی قیادت نے اسے توڑ مروڑ کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ نہرو نے خود بھارتی فوج کو چینی دستوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ مگر بعد میں وہ چین کو جارح قرار دیتے نہ تھکتے تھے۔ (مترجم)

ہے۔" تار کے نظام ترسیل میں گڑبڑ کے سبب یا لندن کے دفتر خارجہ میں کسی اہل کار کی شرارت کی بدولت BATTLE کے لفظ میں "A" "O" سے بدل گیا اور یہ لفظ BOTT-LE بن گیا جس سے تار کے آخری جملے کا مفہوم یوں ہو گیا کہ اسی کی آنکھوں سے بوتل کی روشنی صاف جھلک رہی ہے۔" مگر تبت کا معاملہ بوتل سے زیادہ تھا۔ بھارت کو چین سے معاملہ اٹھا کر فوراً غلطی کی تصحیح کرنا چاہئے تھی۔ مگر ایسا نہ کیا گیا اور پھر جب چین نے چین نے تبت پر قبضہ کر لیا تو بھارت ٹک ٹک دیدم کے سوا کچھ نہ کر سکا۔

نہرو چانکیہ کے بڑے مداح تھے۔ چانکیہ وہ شخص ہے جس کے آگے میکاولی بھی طفلِ مکتب معلوم ہوتا ہے۔ نہرو کو چانکیہ کی جو بات بطور خاص پسند آئی وہ یہ تھی کہ چانکیہ بڑی مہارت سے اپنے مخالف کو ایسی پوزیشن میں لے آتا جہاں وہ جنگ کے بغیر ہی اس سے سب کچھ منوا لیتا۔ مگر نہرو یہ بات فراموش کر گئے کہ چانکیہ اکثر ایسے ہتھکنڈے بھی استعمال کرتا تھا جن سے نہرو کو بیر ہے۔ چانکیہ مقاصد کے حصول میں ذرائع کے متعلق کوئی خلش محسوس نہیں کرتا تھا۔ نہرو اشوک کے بھی بڑے مداح تھے۔ وہ کالنگا کی لڑائی کے موقع پر جہاں بے شمار افراد تہ تیغ ہوئے تھے اشوک کے احساس زیاں اور جنگ بند کرنے کے عمل سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ جب نہرو نے کشمیر میں جنگ بندی کا حکم دیا[1] تو نہرو کے ذہن میں بھی اشوک کی کالنگا کی جنگ ہی تھی۔ حالانکہ اس وقت بھارتی فوج دشمن کو پسپا کرنے کے قابل تھی۔ نہرو کا ذہن اس طرح تھا کہ وہ دوسروں

---

[1] بھارت نے کشمیر میں یک طرفہ جنگ بندی نہیں کی تھی بلکہ جب پاکستانی مجاہدوں کے ہاتھوں بھارتی فوج کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا اور بھارت کو یقین ہو گیا کہ پاکستانی مجاہدوں کو سری نگر سے ادھر روکنا ممکن نہیں تو بھارت یہ معاملہ خود اقوام متحدہ میں لے گیا جہاں رائے شماری کرانے کے وعدہ پر جنگ بندی ہوئی مگر نہرو اس وعدہ سے مکر گئے اور آج تک بھارت یہ وعدہ پورا کرنے کو تیار نہیں۔ (مترجم)

کے خیالات کو تیزی سے اپنا لیتے تھے۔ بنیادی طور گاندھی کا ذہن تخلیقی تھا مگر نہرو ذہنی اعتبار سے دوسرے درجہ کے فرد تھے۔ یہ بات ان کی تصانیف سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔

انڈو چائنا کانفرنس میں، جو ۱۹۵۴ء میں جنیوا کے مقام پر ہوئی، کرشنا مینن کسی دعوت کے بغیر شریک ہو گیا۔ اس نے چو این لائی سمیت تمام وفود کے قائدین کو اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اس کے اثر و رسوخ سے کانفرنس میں توازن قائم رہا اور مناسب اوقات پر اس نے قابلِ قدر فارمولے بھی پیش کئے۔ اس طرح اس نے کانفرنس کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے اسی کردار کی بدولت بھارت کو انڈو چائنا کمیشن کا چیئرمین بنا دیا گیا۔ ریڈن، میکملن اور امریکی مندوب ہنری کیبٹ لاج نے بھی اس کی خدمات کو سراہا۔ اس سال (۱۹۵۴ء) نہرو نے کرشنا مینن کو کابینہ میں شامل کرنا چاہا مگر مولانا آزاد نے اس پر شدید اعتراض کیا۔ مولانا نے نہرو پر یہ بات واضح کر دی کہ اگر کرشنا مینن کو کابینہ میں لیا گیا تو وہ مستعفی ہو جائیں گے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وڈاوہ وزراء سی ڈی دیش مکھ اور ٹی ٹی کرشن مچاری نے بھی کرشنا مینن کی کابینہ میں شمولیت کی مخالفت کی مگر یہ دونوں سیاسی لحاظ سے بے وقعت لوگ تھے اس لئے نہرو نے ان کی تو پرواہ نہ کی مگر مولانا آزاد کے رویہ سے نہرو کو بڑا دکھ ہوا۔ طویل رفاقت کے دوران نہرو نے ہمیشہ مولانا کا احترام کیا تھا۔ حتیٰ کہ انہوں نے گاندھی جی کے سامنے بھی مولانا کا دفاع کیا۔ نہرو نے مولانا آزاد سے تو کچھ نہ کہا مگر اپنے احساسات کا اظہار عوام کے سامنے ان الفاظ میں کیا کہ "میں کابینہ سے استعفیٰ دینے کے متعلق سنجیدگی سے غور کر رہا ہوں۔" مگر مولانا آزاد پر اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ البتہ کرشنا مینن کو بھارتی یونین کا وزیر بننے کے لئے مزید ڈیڑھ سال انتظار کرنا پڑا۔

چو این لائی سے جنیوا میں ملاقات کے بعد کرشنا مینن چین کے "وزیر خارجہ" کی حیثیت اختیار کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے سوئز کے بحران سے پہلے اور بعد

میں صدر ناصر کے ضمن میں بھی یہی رویّہ اختیار کیا اور بالآخر مصری وزیر خارجہ محمد فوزی سے اس کا جھگڑا ہو گیا۔ ۱۹۵۳ء کے بعد کرشنا مینن اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل ڈاگ ہیمر شول کے خلاف بھی پروپیگنڈہ کرتا رہا۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ عالمی سطح پر اس کے سوا کوئی اور صلح صفائی کرانے والا نہ ہو۔ ہیمر شول کرشنا مینن سے دلی نفرت کرتے تھے مگر ان کے دل میں نہرو کے لئے بہت عزّت تھی ؂

باب ۳۲

کرشنا مینن ـــــ اقوام متحدہ

۲۳ء اور ۲۴ء اکتوبر ۱۹۵۶ء کی درمیانی رات کو ہنگری قوم نے بغاوت کر دی۔ ۳۱۔ اکتوبر کو نہر سویز کے بحران کے پیش نظر فرانس اور انگلستان نے مصر پر حملہ کر دیا اور نہر سویز کے علاقے میں اپنی افواج اتار دیں۔ بھارت نے مصر پر فرانس اور برطانیہ کے مشترکہ حملے کو ہدفِ تنقید بنایا۔ مصر پر اینگلو فرانسیسی حملے کو روس نے غنیمت جانا اور ۴ نومبر کو ٹینکوں اور فوجوں کی مدد سے ہنگری میں بغاوت فرو کرنے کے لئے کارروائی کی۔ ہنگری کے ایک لاکھ شہری اپنے وطن سے فرار ہو کر آسٹریا پہنچے۔ یہ خبریں بھی سننے میں آئیں کہ ہنگری کے ہزاروں نوجوانوں کو روسیوں نے سائبیریا منتقل کر دیا۔ کرشنا مینن ۵ نومبر کو نیویارک پہنچا۔ ۹ نومبر تک بھارت کی طرف سے ہنگری کے واقعات پر ایک لفظ بھی نہ کہا گیا۔ اور یہ صورت حال نہ صرف بیرونی ملکوں بلکہ خود بھارت کے اندر بھی بہت سے لوگوں کو عجیب و غریب لگی۔ ۹ نومبر کو اقوام متحدہ میں پانچ ملکوں اٹلی، جمہوریہ آئرلینڈ، پاکستان کیوبا اور پیرو کی مشترکہ قرارداد پیش ہوئی جس میں روس سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ فی الفور ہنگری سے اپنی فوجیں نکال لے اور وہاں اقوام متحدہ کی نگرانی میں عام انتخابات کرائے جائیں قرارداد پر رائے شماری ہوئی۔ ۴۸ ووٹ قرارداد کے حق میں اور گیارہ مخالفت میں آئے جبکہ ۱۶ ممالک نے رائے شماری میں حصّہ نہ لیا۔ بھارت واحد غیر کمیونسٹ ملک تھا جس نے قرارداد کی مخالفت کی۔ امور خارجہ کے میدان میں بھارتی حکومت کے کسی اقدام کی پارلیمنٹ

سمیت اندرون ملک کبھی اتنی مخالفت نہیں ہوئی تھی جتنی اقوام متحدہ میں کرشنا مینن کے مخالف ووٹ کی ہوئی۔ پریس نے طوفان کھڑا کر دیا۔ اہم سیاسی قائدین نے کرشنا مینن کو فوراً واپس بلا کر سیاسی ذمہ داریوں سے سبکدوش کرنے کا مطالبہ کیا۔

کرشنا مینن نے ۱۹۶۷ء میں کینیڈا کے ایک مصنف مائیکل بریچر کو بتایا تھا کہ اسے ہنگری کے معاملہ میں اپنی حکومت کی طرف سے کوئی ہدایت نہیں ملی تھی اور وہ ووٹ ڈالنے کے معاملے میں آزاد تھا۔ یہ بالکل غلط ہے۔ کرشنا مینن نے خود نہرو کو تار ارسال کر کے ہدایات طلب کی تھیں۔ ان دنوں نہرو بجے پور میں تھے۔ تار ملا تو میں نے نہرو کو ٹیلی فون پر اطلاع دی۔ نہرو نے مجھے ہدایت کی کہ کرشنا مینن کو فوراً ارجنٹ تار دو اور کہو کہ وہ ہنگری کے معاملے میں رائے شماری میں حصہ نہ لے۔ میں نے نہرو کی جانب سے کرشنا مینن کو یہ ہدایت روانہ کر دی۔ کرشنا مینن نے مائیکل بریچر کے روبرو اقبال کیا کہ بھارتی وفد کے بعض ارکان نے اسے رائے شماری میں غیر حاضر ہونے کی صلاح دی تھی۔ لیکن اس نے ان ارکان سے کہا کہ "ہمیں تو پورے یقین کے ساتھ ڈٹ جانا چاہیئے۔ یا پھر پسپائی اختیار کرنی چاہیئے۔" مگر مینن کس کے "یقین" کی بات کرتا تھا۔ نہرو کے یقین کی کا بینہ کی یا خود اپنی۔

جب کرشنا مینن نیویارک سے واپس آیا تو میں نے اس کے اقدام کے بارے میں دریافت کیا جو وزیر اعظم کی ہدایات کو پائے حقارت سے ٹھکرانے کے مترادف تھا۔ اس نے کہا کہ نہرو جی کا تار اسے کچھ تاخیر سے ملا تھا۔ یہ سن کر میں مسکرا دیا۔ اور میں نے اس سے کہا کہ میں ابھی نیویارک میں مقیم بھارت کے مستقل نمائندے کو خط لکھ کر پوچھتا ہوں کہ وہ اچھی طرح دیکھ بھال کر یہ بتائے کہ تار کس روز اور کس وقت ملا تھا اور قرارداد پر رائے شماری کب ہوئی تھی۔ یہ سن کر کرشنا مینن گھبرا گیا۔ اس نے مجھے کہا "بڑے میاں تم گڑے مردے کیوں اکھاڑنا چاہتے ہو"۔ میں نے طوعاً کرہاً بلکہ اپنی حماقت سے اس معاملے کو مزید نہ بڑھایا۔

اب نہرو کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک یہ کہ وہ اپنے ایک ماتحت کی تذلیل

ہونے دیں اور دوسرے یہ کہ وہ اپنا دفاع کرتے ہوئے کرشنا مینن کے اس اقدام کی حمایت کریں۔ نہرو نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ پارلیمنٹ کی تقریر بیشتر لوگوں کو قائل نہ کر سکی۔ اس المناک حادثے میں صرف ایک ہی شخص تھا جو "یقین" کا مالک تھا اور وہ تھا کرشنا مینن۔ مگر اس کا یہ "یقین" نہرو اور ملک دونوں کو مہنگا پڑا۔ بھارت کے نام کو بٹہ لگا۔ اور اس کی غیر جانبداری دنیا کی نظروں میں تماشا بن کر رہ گئی۔

کینیڈا کے مصنف سے کرشنا مینن کا یہ کہنا کہ نہرو نے اس کے اقدام کی حمایت کی تھی۔ مجھے انگلستان کے وزیر اعظم ڈسرائیلی کی زندگی کے ایک اہم واقعہ کی یاد دلاتا ہے۔ ہوا یوں کہ روسی کافی عرصہ سے امیر افغانستان کے ساتھ پینگیں بڑھا رہے تھے۔ انہوں نے امیر کی رضامندی سے ایک وفد کابل بھیجا۔ ان دنوں لارڈ لٹن ہندوستان کا وائسرائے تھا۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ روسی وفد کابل آ رہا ہے تو اس کی رگِ حمیت پھڑکی۔ لارڈ لٹن ڈسرائیلی کے سیاسی دوست بلویر کا بیٹا تھا۔ ڈسرائیلی کی ہدایات کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے بھی اپنا وفد کابل روانہ کر دیا۔ حالانکہ ڈسرائیلی بات چیت کے ذریعے روسی وفد کو کابل سے واپس بلانے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ امیر افغانستان نے انگریزوں کے وفد کو سرحد پر روک کر واپس کرا دیا۔ اب ڈسرائیلی کے سامنے بھی دو ہی راستے تھے ایک یہ کہ وہ ایک کمزور ملک کے سامنے شرم سے پانی پانی ہو کر سر جھکا دے۔ یا پھر افغانستان سے خطرناک جنگ کا آغاز کرے۔ ادھر گلیڈسٹون نے جو حزبِ مخالف کا لیڈر تھا اس معاملے میں ڈسرائیلی کے خلاف طوفان برپا کر دیا۔ ڈسرائیلی سخت سیخ پا ہوا اس نے غصہ کے عالم میں کہا "جب کوئی وائسرائے یا کمانڈر انچیف ہدایات کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اسے اپنی کامیابی کا تو یقین ہونا چاہیئے"۔ کیا ڈسرائیلی لارڈ لٹن کے اقدام سے لاتعلقی کا اظہار کر دیتا۔ اور ایک ماتحت کی قربانی دے کر حکومت برطانیہ کو معصوم ثابت کرتا؟ مگر یہ ڈسرائیلی کے اصولوں کے منافی تھا۔ اس نے لارڈ لٹن کا ساتھ دیا

اور افغانستان پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ جنرل رابرٹ نے حملہ کیا اور امیر افغانستان کی مختصر سی فوج کو تہس نہس کر دیا۔ جلد ہی روسی وفد کی آمد سے پیدا ہونے والی مخالفانہ صورت حال اور گلیڈسٹون کا طوفان سمندر کی جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ یہ بالکل درست ہے کہ چلتی کا نام گاڑی ہے۔ مگر نہرو باقی ساری زندگی ہنگری کے معاملہ میں کرشنا مینن کے مخالفانہ ووٹ کی مدافعت اور وضاحت ہی کرتے رہے۔

باب ۳۳

کرشنا مینن کے سکنڈل

۱۹۵۵ء کی دوسری ششماہی میں بھارتی حکومت یہ سوچ ہی رہی تھی کہ فضائیہ کے لئے روس سے جنگی طیارے خریدے جائیں کہ کرشنا مینن کو اس کی بھنک پڑ گئی۔ اس نے مجھے کہا کہ بھارت کے لئے دفاع میں روس پر انحصار خطرناک ہوگا کیونکہ روس کی پالیسیوں میں تو اچانک تبدیلی رونما ہوتی ہے اور اس تبدیلی کے باعث ہو سکتا ہے کہ ایک دن ہم کہیں کے نہ رہیں۔ اس نے وزیر اعظم سے تو اس سلسلے میں بات نہ کی البتہ اقوام متحدہ جاتے ہوئے لندن میں رک کر برطانوی وزیر اعظم انتھونی ایڈن کو ساری بات بتا دی۔ برطانوی وزیر اعظم نے نہرو کو تار ارسال کیا جس میں بھارت کے دفاعی نظام میں روس کے عمل دخل پر اپنی تشویش اور اضطراب کا اظہار کرتے ہوئے پُرخلوص خواہش ظاہر کی گئی تھی کہ بھارت اس تجویز سے دستبردار ہو جائے گا۔ بھارت نے ارادہ ترک کر دیا اور پھر برطانیہ سے لڑاکا جہاز خرید لئے گئے۔

نہرو جانتے تھے کہ آڈیٹر جنرل اے۔ کے چندا اور وزارتِ دفاع کے سیکرٹری ایم کے ولودی سے میرے دوستانہ تعلقات ہیں۔ انہوں نے ۱۹۵۵ء کے موسم گرما میں مجھ سے کہا کہ میں ان دونوں اصحاب سے کرشنا مینن کے متعلق مختلف سیکنڈلوں کے بارے میں بات کروں تاکہ یہ قصہ ختم کیا جا سکے۔ کرشنا مینن جن سیکنڈلوں میں ملوث تھے ان میں سے چند یہ ہیں۔

جیپوں کا ٹھیکہ : بھارتی فوج کو کشمیر میں آپریشن کے لئے جیپوں کی ضرورت تھی۔ کرشنا مینن نے ایک مہم جو دلال پوٹر سے سودا کر لیا۔ پوٹر ایک نجی فرم کا مالک تھا جس کا کل سرمایہ بیس پونڈ تھا۔ پوٹر کو بڑی بڑی رقوم پیشگی ادا کر دی گئیں۔ اس نے بھارت کو سیکنڈ ہینڈ مرمت شدہ جیپیں فراہم کر دیں۔ فوجی ماہرین نے یہ جیپیں ناکارہ قرار دے کر مسترد کر دیں۔ کرشنا مینن کو حکم دیا گیا کہ پوٹر کو مزید ادائیگی نہ کی جائے مگر اس وقت حکومت کو دس لاکھ اسّی ہزار روپے کا نقصان پہنچ چکا تھا۔ یہ رقم زرمبادلہ میں ادا کی گئی تھی۔

اسلحہ اور دستی بم : اسلحہ اور دستی بموں کی خریداری کے لئے بھی کرشنا مینن نے مہم جو دلالوں کی وساطت سے ہی سودا طے کیا۔ ان میں نمایاں ترین شخص کلیمسن تھا جو ایک فوجداری مقدمہ میں ملوث رہ چکا تھا۔ پوٹر نے جیپوں کے سودے میں بھارتی حکومت پر دعویٰ کر رکھا تھا۔ غالباً اسے بھی فائدہ پہنچانے کی خاطر اس سودے میں شریک کر لیا گیا۔ کرشنا مینن نے ان دلالوں کو بھاری پیشگی رقوم ادا کرنے کی منظوری دے دی۔ اس طرح حکومت کا کوئی ۷۲ لاکھ روپیہ زرمبادلہ کی شکل میں ان دلالوں کو زائد ادا کر دیا گیا۔ ان دونوں سودوں میں طریق کار کی اور فنی بے ضابطگیاں کی گئیں۔ حالات کو جانچنے میں غلطیاں کی گئیں اور معاہدوں کی شرائط پر عمل کرنے اور ان کی توضیح میں سخت مشکلات پیش آئیں۔

تھیٹر کی خریداری : کرشنا مینن نے ۱۹۵۰ء میں ایک تفریحی تھیٹر کے ساز و سامان کی خریداری کے لئے ایک نجی کمپنی کو دو لاکھ ۲۸ ہزار روپے کی ادائیگی کرا دی۔ یہ کمپنی دسمبر ۱۹۴۹ میں قائم ہوئی تھی۔ اس کا کل سرمایہ ایک ہزار پونڈ اور ادا شدہ سرمایہ صرف دو پونڈ تھا۔ اس سودے میں مہم جو کلیمسن ملوث تھا۔ حکومت کو بالآخر یہ رقم معاف کرنا پڑی۔ یہ کرشنا مینن کی کھلی حماقت اور ناقابلِ معافی حرکت تھی اور بعض لوگوں کا تو خیال تھا کہ اس نے حکومت کو فریب دے کر رقم اپنی جیب میں ڈال لی ہے۔

میں نے کرشنا مینن سے اس بارے میں کھرے کھرے سوالات کئے اور ان سودوں کے ادارے میں دریافت کیا۔ میں نے اسے یاد دلایا کہ ۱۹۵۰ء میں تو کشمیر میں جنگ بھی نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے کسی خوشی میں سودے پر دستخط کی میرے سوالوں سے کرشنا مینن گھبرا سا گیا اور بولا "بڑے میاں ایک پیالی چائے ہو جائے۔" چائے منگوائی گئی اور کرشنا مینن پینے لگا۔ اتنے میں کرنل اور صاحب مجھ سے ملنے آ گئے۔ کرشنا مینن نے سکھ کا سانس لیا۔ اور کھسک گیا۔ اس کے علاوہ ایوانِ صدر کے بعض حصوں کو پٹے پر دینے اور سرکاری کاروں کے متعلق سکینڈل بھی تھے۔ مگر یہ دوسرے معاملات کے مقابلے میں نہایت معمولی تھے۔

میں نے اس سے پہلے سیکرٹری دفاع ولودی سے بات کی۔ سیکرٹری دفاع اور آڈیٹر جنرل دونوں کرشنا مینن کے سخت دشمن تھے۔ ولودی سے میں نے کہا کہ میں پہلے آڈیٹر جنرل چندا کو راہ راست پر لانا چاہتا ہوں۔ ولودی رضامند ہو گیا۔ اور وعدہ کیا کہ اس معاملے میں چندا جو بھی کہے گا وہ اس پر عمل کرے گا۔ اس کے بعد چندا سے میری کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ میں نے چندا کو بتایا کہ میں ان سکینڈلوں کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے مجھ سے پوچھا "تم کرشنا مینن کو بچانے کے لئے اپنی گردن کیوں پھنسانا چاہتے ہو؟" میں نے کہا کہ میں کرشنا مینن کی نہیں حکومت کی پوزیشن صاف کرنے میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ آڈیٹر جنرل اور سیکرٹری دفاع سے ملاقاتوں کے بعد دو متبادل تجاویز سامنے آئیں۔ اوّل یہ کہ حکومت پارلیمنٹ میں یہ بیان دے کہ ان دنوں حالات ایسے تھے کہ جیپیں اور اسلحہ فوری طور پر درکار تھا اور عام روایتی ذرائع سے یہ چیزیں فوراً نہیں مل سکتی تھیں لہٰذا غیر مروجہ طریق کار اختیار کرنا پڑا جس میں بعض خطرات مضمر تھے۔ آئندہ کے لئے ایسے طریقے اختیار نہ کرنے کی ہدایت جاری کر دی گئی ہے۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ کرشنا مینن (ملزم) خود اکاؤنٹس کمیٹی کے روبرو پیش ہو کر اپنی صفائی پیش کرے اور وہاں اسے بچا لیا جائے۔ وہ اس طرح کہ وزارتِ دفاع اس سلسلے میں عام حالات کی وضاحت کر دے۔ آڈیٹر جنرل اور سیکرٹری دفاع دونوں نے میری تجاویز سے اتفاق کیا۔

میں نے کرشنا مینن کو دونوں تجاویز سے آگاہ کیا۔ کرشنا مینن جانتا تھا کہ وہ دونوں اس کے خون کے پیاسے ہیں۔ میں نے اسے کہا کہ تمہیں ان کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انہوں نے تمہیں بچا لیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کرشنا مینن پر یہ تہمت نہیں لگائی جا سکتی کہ وہ کسی کا شکر گزار بھی ہو گا۔ میں نے اس پر واضح کر دیا کہ ان دونوں کے سوا کوئی تیسرا راستہ نہیں۔ کرشنا مینن نے کہا کہ پارلیمنٹ میں حکومت کے بیان دینے سے ان کی پوزیشن پوری طرح واضح نہیں ہوتی۔ تو میں نے کہا کہ اگر تمہارے پاس اپنے اعمال کا کافی جواز موجود ہے تو تم پبلک اکاؤنٹس کمیٹی میں پیش ہو جاؤ۔ میں نے اُسے کہا کہ تم دو چار دن سوچنے کے بعد بتاؤ کہ کس تجویز پر عمل درآمد کیا جائے۔ کرشنا مینن اس وقت تو چلا گیا مگر اسی رات کوئی دو بجے وہ میرے کمرے میں گھس آیا اور بتی جلا کر مجھے بیدار کیا۔ اس کے سر کے بال کھڑے تھے اور وہ کوئی بھتنا دکھائی پڑتا تھا۔ اس نے رونی سی آواز میں دریافت کیا: "بڑے میاں آپ کا کیا مشورہ ہے"۔ مجھے سخت کوفت ہو رہی تھی۔ اور غصہ بھی آیا۔ میں نے کہا اس وقت تو میرا مشورہ یہ ہے کہ جا کر سو جاؤ اور مجھے بھی آرام کرنے دو۔ مگر اس نے اصرار کیا تو میں نے کہا حکومت کی طرف سے بیان ہی بہتر حل معلوم ہوتا ہے۔ میں یہ انتظام کر دوں گا کہ تمہارا "دوست" دیش مکھ یہ بیان دے۔ اگر تم اس پر رضامند نہیں تو پھر غرق ہونے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ میں نے کہا: "کیا تم تھیٹر والے سودے کا جواز پیش کر سکتے ہو۔ تم ذلالت کا نمونہ بن کر رہ جاؤ گے"۔ وہ چند منٹ گہری سوچ میں بیٹھا رہا۔ پھر بولا: "ٹھیک ہے میں بیان جاری کرنے پر رضامند ہوں۔ آپ وزیر اعظم کو بتا دیں"۔

میں نے وزیر اعظم کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ میری تجویز سے متفق تھے۔ اور بولے: "پارلیمنٹ میں بیان میں ہی کیوں نہ دوں؟ دیش مکھ کیوں دے؟" میں نے جواب دیا: "بیان آپ بھی جاری کر سکتے ہیں مگر دیش مکھ جو کرشنا مینن کا سخت مخالف سمجھا جاتا ہے بیان دے تو اس کا اثر زیادہ ہو گا۔ پھر وزیر خزانہ ہونے کے سبب وہ اس کام کے

لئے زیادہ موزوں شخص ہے آپ کو دیش مکھ سے کوئی بات نہیں کرنا پڑے گی۔ میں سب انتظام کر لوں گا"۔

ولودی نے آڈیٹر جنرل چندا کے بتائے ہوئے خطوط پر بیان تیار کر دیا۔ پھر میں بیان کا مسودہ لے کر آڈیٹر جنرل کے پاس گیا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ ذاتی طور پر بیان کو دیکھ کر اس کی نوک پلک درست کر دے گا۔ اس نے بیان کے مسودے میں چند ترامیم کیں۔ پھر یہ بیان لے کر میں وزارت خارجہ کے سیکرٹری جنرل این آر پلائی کے پاس گیا جو دیش مکھ کا گہرا دوست تھا۔ میں نے اسے سارا پس منظر بتایا۔ وہ یہ بیان لیکر دیش مکھ کے پاس گیا اور اس سے بات کی۔ پلائی نے دیش مکھ سے یہ بھی کہا کہ میں بھی اس سے دو چار دن میں ملوں گا۔ جب میں دیش مکھ سے ملنے گیا تو اس نے کوئی اعتراض اٹھائے بغیر مجھے وزیر اعظم کو یہ بتانے کا اختیار دے دیا کہ دیش مکھ پارلیمنٹ میں بیان دے گا۔ اور بالآخر یہ بیان جاری ہوا۔ جب آزاد کو اس کا علم ہوا کہ یہ سب کچھ میں نے کرایا ہے تو وہ بے حد خفا ہوا۔

مولانا آزاد نے کچھ عرصہ پیشتر نہرو جی کو یہ تجویز پیش کی تھی کہ اگر کرشنا مینن کو کابینہ میں لینا ہے تو دیوان چمن لال کو بھی وزیر بنا دیا جائے۔ وزیر اعظم کو اس پر بہت تعجب ہوا اور انہوں نے ایک سیکرٹری کو بلا کر مولانا کو فائیل بھجوا دی۔ جس میں چمن لال کے ان کالے سودوں کا ذکر تھا جو اس نے ترکی اور ارجنٹائن میں بھارتی سفیر کے طور پر اناج کی خریداری کے لئے کئے تھے۔ مولانا نے فائیل پڑھ کر چپ سادھ لی۔ اب مولانا کے پاس کرشنا مینن کو کابینہ سے باہر رکھنے کا کوئی بہانہ نہ تھا۔ چنانچہ ۳ر فروری ۵۶ء کو کرشنا مینن کابینہ میں بطور وزیر بے محکمہ شامل ہو گیا۔ وہ اقوام متحدہ میں بدستور بھارتی وفد کا قائد بھی رہا اور وزیر بننے کے بعد تو اس کی اکڑ میں اضافہ ہو گیا۔

۱۹۵۷ء کے عام انتخابات میں کرشنا مینن کو پارلیمنٹ کا رکن منتخب کرانے کے

لئے حلقہ انتخاب کی تلاش ہوئی۔ بعض سرخوں نے اسے کہا کہ شمالی بمبئی سے انتخاب لڑ لو۔ وہ میرے پاس آیا اور میری رائے پوچھی۔ میں نے کہا "تم بمبئی سے جیت جاؤ گے مگر یہ فتح نہرو کی زندگی سے وابستہ ہے۔ جس دن وہ نہ رہے تمہیں بھی کوئی نہ پوچھے گا۔ کیونکہ بنیادی طور پر تمہارا حلقہ انتخاب "نہرو" ہے۔ تمہاری جگہ اگر میں ہوتا تو کالی کٹ سے انتخاب لڑتا جی ہاں وہاں تو تمہارا کچھ وزن ہو سکتا ہے مگر بمبئی میں تمہیں کون جانتا ہے؟" مگر کرشنا مینن نے آسان راستہ اختیار کیا۔ وہ بمبئی سے منتخب ہو گیا۔ نہرو کی موت کے بعد میری پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ اسے بمبئی کے لئے کانگریس کا ٹکٹ بھی نہ مل سکا۔ اس نے دو مرتبہ آزاد امیدوار کی حیثیت سے اس حلقے سے انتخاب لڑا۔ اور دونوں مرتبہ معمولی رتبے کے کانگریسیوں نے اسے شکست فاش دی۔

کرشنا مینن نے سویز اور ہنگری کے معاملات پر اقوام متحدہ میں جو موقف اختیار کیا تھا مغربی طاقتوں کو اس سے بڑا رنج پہنچا تھا اور وہ کرشنا مینن کو نیچا دکھانے کی فکر میں تھیں۔ یہ حالات تھے جب پاکستان کے وزیر خارجہ نے اقوام متحدہ میں کشمیر کا سوال اٹھایا اور ۲ جنوری ۱۹۵۷ء کو اس پر بحث کا مطالبہ کر دیا۔ بحث ۲۳ جنوری کو شروع ہوئی۔ کرشنا مینن نے یہاں تیرہ گھنٹے تک مسلسل تقریر کی اور پھر بیہوش ہو کر گر گیا۔ دراصل اس وقت بھی کرشنا مینن تیز منشیات کے زیر اثر تھا۔ معمول کے مطابق وہ پریس ٹرسٹ آف انڈیا کے دہلی بیورو کے انچارج کو سرکاری خرچ پر نیویارک لے کر گیا ہوا تھا۔ کرشنا مینن کی یہ طویل تقریر سلامتی کونسل کے ارکان کے لئے سخت کوفت کا باعث بنی اور ہاسکو لندن، نیویارک اور دوسرے دارالحکومتوں کے اخبارات نے اسے چند سطروں سے زیادہ نہ دیا۔ مگر اسے پورے کا پورا بھارت بھیجا گیا اور اخبارات میں چھاپا گیا۔ ساری دنیا میں کسی ملک کے لوگ "اسہال الفاظ" میں اتنی دلچسپی نہیں لیتے جتنی دلچسپی بھارت کے لوگوں کو ہے۔ اس کے باوجود کہ اس تقریر نے اقوام متحدہ میں ایک بھی ووٹ نہ جیتا

کرشنا مینن خود کو کشمیر کا "ہیرو" سمجھنے لگا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سلامتی کونسل میں کرشنا مینن اور بھارت کو روسی ویٹو نے بچا لیا تھا۔

۱۱ مارچ ۵۷ء کو کرشنا مینن شمالی بمبئی سے لوک سبھا کا رکن منتخب ہو گیا۔ اسے اپنے حریف سے ۴۷ ہزار ۱۴۷ زائد ووٹ ملے۔ انتخاب کے بعد میں نے وزیر اعظم کو مشورہ دیا کہ کرشنا مینن کو وزارتِ دفاع میں بھیج دیا جائے۔ تاکہ وزارت خارجہ کو اس کے منحوس اثرات سے بتدریج پاک کیا جا سکے۔ مگر میری یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔

انتخاب میں کامیابی اور خود کو کشمیر کا ہیرو تصور کر لینے کے بعد اب کرشنا مینن کے سر میں ایک اور ہی ہوا سمایا۔ اس نے کئی لوگوں سے برملا یہاں تک کہہ دیا کہ وہ تو نہرو کا قدرتی جانشین ہے۔ کانگریس کے بہت سے اہم قائدین کو یہ بات ناگوار گزری۔ پھر وہ وزارت دفاع میں سینئر سول اور فوجی افسروں کی موجودگی میں اپنے رفیق وزراء پر نکتہ چینی کرنے لگا۔ وہ زیادہ تر پنت مرارجی ڈیسائی اور ٹی ٹی کرشن مچاری کو ہدفِ تنقید بناتا۔ پنڈت پنت کے بارے میں تو وہ اکثر اس طرح کلام کرتا۔ "اچھا وہ بدصورت سمندری گھوڑا!" لوگوں پر پھبتیاں کسنے کے معاملہ میں وہ ایک بد احتیاط شخص تھا۔ اسے دوست بنانا تو آتا ہی نہ تھا مگر دشمن پیدا کرنے میں اسے ملکہ حاصل تھا۔

کرشنا مینن نے ایک روز مجھے بتایا کہ "جہاں کہیں بھی میں جاتا ہوں۔ وزیر اعظم کی طرح لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جاتے ہیں"۔ میں نے اسے بتایا کہ تم سے پیشتر ایک شخص ایسا بھی تھا جس کے جلسوں میں نہرو کے جلسوں سے کہیں زیادہ رونق ہوتی تھی۔ مگر یہ صورتحال عارضی ثابت ہوئی۔ وہ اپنی مقبولیت قائم نہ رکھ سکا اور اسے ڈپٹی وزیر کے معمولی عہدہ پر قانع ہونا پڑا۔ اس نے دریافت کیا کہ وہ کون تھا۔ میں بولا "انڈین نیشنل آرمی کا شاہنواز خاں"۔ میں نے کرشنا مینن سے کہا کہ وہ یاد کرو جو ڈیوک آف ولنگٹن کے ساتھ بیتی تھی۔ اسے اپنے گھر پر لوگوں کی خشت باری دیکھنا پڑی۔ میں نے کہا کہ نہرو کی طرح عمر بھر

اپنی مقبولیت کو قائم رکھنا کوئی مذاق نہیں اور پھر وہی کچھ ہوا جو میں نے کہا تھا۔ وزارت سے الگ ہوتے ہی کرشنا مینن شمالی ہندوستان گیا تو کئی مقامات پر لوگوں نے اس پر خشت باری کی۔

۱۹۵۷ء میں وزیر دفاع اور وزیر خارجہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ چین نے تبت میں شاہراہ اقصائے چین مکمل کر لی ہے مگر وہ خاموش رہے اور جان بوجھ کر پارلیمنٹ اور عوام کو اس سے بے خبر رکھا گیا۔ میرا خیال تھا کہ لندن ہاؤس میں ٹھوکریں کھانے کے بعد کرشنا مینن نے کچھ سبق سیکھا ہو گا۔ مگر وہ انتظامی معاملات میں کورے کا کورا ہی رہا۔ وزیر دفاع کی حیثیت میں اس نے فوج اور وزارت دفاع میں تباہی مچا دی اس نے اپنے حلقہ بگوش تلاش کر لئے۔ اس ضمن میں بہترین مثال کے طور پر بی ایم کول کا نام لیا جا سکتا ہے جسے فیلڈ کمانڈر کی حیثیت سے مطلقاً کوئی تجربہ نہ تھا۔ آرمی کے چیف آف سٹاف جنرل تھمیا نے لفٹیننٹ جنرل کے عہدے کے لئے تین نام پیش کئے۔ بی ایم کول کا نام آخری تھا۔ مگر کرشنا مینن نے اپنے اختیارات بروئے کار لاتے ہوئے بی ایم کول کو اس عہدے پر ترقی دے دی۔ اور بہت سے دیگر نمایاں افسروں کو نظر انداز کر دیا۔ کول فوج کا عظیم ترین بزدل تھا۔ اور یہ بات اس وقت ثابت ہو گئی جب شیخی باز کول کو چینیوں کے مقابلے میں نیفا کے محاذ پر بھیجا گیا۔ اس نے بیماری کا بہانہ کیا اور دہلی واپس پہنچ کر بستر دراز ہو گیا۔ صدر رادھا کرشنن چاہتے تھے کہ ایک طبی بورڈ کول کا مکمل معائنہ کرے اگر ضرورت پڑے تو کول کا پول کھول دیا جائے۔ مگر ان دنوں دلی میں بھی افراتفری مچی ہوئی تھی۔ اور یوں کول بچ نکلا۔ تاہم بعد ازاں اسے بڑی ذلت اور رسوائی کے ساتھ فوج سے نکلنا پڑا۔

وزارتِ دفاع نے جب جنگی ساز و سامان کی برق رفتار تیاری کا پروگرام بنایا کرشنا مینن نے ایک شخص کو بلا لیا جو سکاؤٹ تحریک کے دنوں میں اس کا رفیق کار رہ

چکا تھا۔ وہ معمولی درجے کا آدمی تھا مگر جلد ہی وہ دنیا بھر کے دورے کرنے لگا۔ اگرچہ وہ کسی کا ملازم نہ تھا۔ مگر کرشنا مینن کی سرپرستی میں اس نے بہت سی غیر ملکی فرموں سے معاملات کئے۔ مثلاً برطانوی فرمیں جنہوں نے اویدی میں ٹینک اور کانپور میں ہوائی جہاز بنانے میں بھارت سے اشتراکِ عمل کیا۔ اسی طرح جرمن فرم جس نے بھاری ٹرک اور جاپانی فرم جس نے ہلکے ٹرک بنانے میں معاونت کی۔ یہ شخص کرشنا مینن کا مالی اعانت کنندہ بن گیا۔ اس نے ان سودوں میں اتنا کمایا کہ اب وہ مدراس میں متعدد فرموں اور کمپنیوں کا ڈائرکٹر بنا بیٹھا ہے۔

باب ۳۲

کرشنا مینن ___ ناکام عاشق

شاہراہ اقصائے چین کی تعمیر اور شمالی علاقوں میں چینیوں کے اقدامات کی خبر جب عام ہوئی تو حکومت کو پریس اور پارلیمنٹ میں شدید ترین نکتہ چینی کا سامنا کرنا پڑا اب کرشنا مینن کو راندہ درگاہ سمجھا جاتا تھا۔ اپریل ۱۹۶۰ء میں چو این لائی بھارت کے دورے پر آئے جہاں سرد مہری سے ان کا استقبال کیا گیا۔ اس موقع پر کرشنا مینن نے وزیر اعظم سے کہا کہ وہ چین سے سودا کر لیں اور کہیں کہ اقصائے چین کے بدلے وہ تبت کا وہ تھوڑا سا علاقہ بھارت کو پٹہ پر دیدے جو سکم اور بھوٹان کو بھارت سے جدا کرتا ہے۔ کرشنا مینن کی دلیل یہ تھی کہ اگر ایسا ہو جائے تو اس معاہدہ کی تجدید کے وقت بھارت کی پوزیشن زیادہ مستحکم ہوگی اور وہ چین کے ساتھ سودے بازی کر سکے گا۔ مگر یہ تجویز مبہم تھی اس میں پٹے کی مدت بھی نہیں دی گئی تھی۔ پنت اور کرشن مچاری نے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ جنوبی ہند کے ایک صحافی کا یہ کہنا کہ کرشنا مینن کی تجویز کی مخالفت میں پنت نے استعفا دینے کی دھمکی دی تھی بے سروپا بات ہے اور کرشنا مینن کے بیمار ذہن کی پیداوار ہے۔ پنت اتنا اچھا آدمی تھا کہ وہ نہرو کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ پنت نے نہرو جی سے کہا تھا کہ اگر کرشنا مینن کی تجویز تسلیم کر لی جائے تو اس پر عوام کے غیظ و غضب میں اور اضافہ ہوگا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت تک نہرو بھی کرشنا مینن کو قابل اعتماد شخص نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ چو این لائی کے ساتھ بات چیت میں کرشنا مینن کو شریک ہی نہ کیا گیا۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۲ء کے دوران کرشنا مینن نے پھر تیز نشیات

کا استعمال شروع کر دیا وہ ہر وقت نشے میں رہتا۔ ایک مرتبہ اقوام متحدہ میں تقریر کرتے ہوئے تو اس نے ایسی غلیظ اور غیر ثقہ زبان استعمال کی کہ شرافت کی تمام حدود و قیود پامال ہو گئیں نہرو نے اس پر اسے تار ارسال کیا "یاد رکھو دنیا اقوام متحدہ سے کہیں بڑی ہے"۔ یہ تار اسے دیوان۔ بی، سی ملا جس سے کرشنا مینن بے حد پریشان ہوا۔ وہ غسل خانے کی طرف جانے کی کوشش میں لڑکھڑاتے قدموں سے جنرل اسمبلی کے لاؤنج میں آ گیا جہاں خواتین کی موجودگی میں ہی اس نے رفع حاجت کے لئے پتلون کے بٹن کھول دیئے۔ اور اس وقت تو ان خواتین کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ پریس ٹرسٹ آف انڈیا کے نمائندے کا سہارا لئے ہوئے چلانے لگا "یہ تار متھائی (مصنف) نے بھجوایا ہے وزیر اعظم ایسی سخت زبان استعمال نہیں کرتے۔" اس کے بعد رادھا کرشنن نے بھی نہرو سے کہا کہ وہ کرشنا مینن کو اقوام متحدہ میں بھیجنا بند کر دیں کیونکہ وہ ایک دائم المریض شخص ہے۔ رادھا کرشنن کا ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ کرشنا مینن ذہنی مریض ہے، اقوام متحدہ کے علاوہ اور ممالک میں بھی لوگوں اور پریس نے کرشنا مینن کو متعدد القابات سے نوازا، ان میں سے چند یہ ہیں۔ غیر سفارتی سفارتکار سب سے زیادہ قابل نفرت سفارت کار، بھارتی راسپوٹین۔ بین الاقوامی چم چچڑ۔ زہریلا پھنیر سانپ اور چانٹے پر پلا ہوا شیر۔

دسمبر ۱۹۶۱ء میں بھارت نے گوا پر جو پولیس ایکشن (فوج کشی) کیا اس کے مقاصد سیاسی تھے، ان دنوں عام انتخابات ہونے والے تھے۔ گوا پر بزور قبضہ کا فیصلہ کوئی چھ ماہ قبل کیا گیا تھا کرشنا مینن نے انٹیلی جنس میں سے ایک اطاعت شعار شخص کا انتخاب کر لیا تھا۔ جس کے ذریعے گوا پر فوج کشی کی راہ ہموار کی گئی۔ اس شخص کو جو سینئر افسر تھا، جھگڑے کھڑے کرنے کے بعد جھگڑا مول لینے کی خصوصی مہارت حاصل تھی۔ چنانچہ اس قسم کی بے بنیاد اور جھوٹی خبریں وسیع پیمانے پر پھیلائی گئیں کہ گوا میں پرتگال نے زبردست فوجی قوت جمع کر لی ہے اور پاکستانی فوجیں فضا اور سمندر سے گوا میں اترنے والی ہیں در حقیقت گوا پر تو فوج کشی کی

ضرورت ہی نہ تھی۔ یہ کام تو سنٹرل ریزرو پولیس بخوبی کر سکتی تھی۔ گو اپر فوج نکتھی سے نہرو کی اخلاقی ساکھ میں کوئی اضافہ نہ ہوا۔ امریکہ کا صدر کینیڈی نہرو کا مداح تھا۔ اس نے گو اپر بھارت کے دعوے کو چیلنج تو نہ کیا مگر اسے یہ کہنا پڑا کہ "پادری قحبہ خانہ میں پکڑا گیا ہے"۔

۱۹۶۲ء کے اوائل میں عام انتخابات ہوئے۔ کرشنا مینن اب کے پھر شمالی بمبئی کے حلقہ سے کانگریس کا امیدوار تھا۔ اس کے خلاف اچاریہ کرپلانی نے آزاد امیدوار کے طور پر انتخاب لڑا۔ انتخابی حلقے کی صورتحال کے بارے میں اطلاع ملی کہ کرشنا مینن کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ نہرو نے بدقسمتی سے یہ محسوس کیا کہ اچاریہ کرپلانی نے دراصل انہیں چیلنج کیا ہے اور انہوں نے شمالی بمبئی کے انتخاب کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا۔ وہ چاہتے تھے کہ کرشنا مینن بھاری اکثریت سے جیتے چنانچہ انہوں نے ایس کے پاٹل کو بھی اس سلسلے میں ہدایت کر دی جو صوبہ کے وزیر اعلیٰ تھے پوری انتخابی مہم میں نہرو جس جگہ بھی گئے۔ انہوں نے کرشنا مینن کے انتخاب کی بات کی۔ پونا، گوالیار، دہلی، جبل پور، مدورائی غرض ہر جگہ نہرو کرشنا مینن کی بات کرتے رہے یہاں تک کہ بعض لوگ کرشنا مینن کے متعلق وزیر اعظم کی تشویش کو محض مذاق تصور کرنے لگے۔ کرشنا مینن بھاری اکثریت سے جیت تو گیا مگر یہ فتح بخیر کھیت ثابت ہوئی کیونکہ صرف سات ماہ بعد کرشنا مینن کو حکومت سے ہٹنا پڑا۔

ستمبر ۱۹۶۲ء میں شمالی علاقے میں چین سے فوجی جھڑپوں کا آغاز ہوا جس نے ۲۰ اکتوبر کو بھرپور لڑائی کی شکل اختیار کر لی۔ چینی بھارتیوں پر چھا گئے اور انہوں نے ہمالیہ کے ناقابل تسخیر ہونے کی داستانیں باطل کر دکھائیں۔ کانگریس پارلیمانی پارٹی کے ایک بڑے گروہ نے کرشنا مینن کی علیحدگی کا مطالبہ کیا وزیر اعظم نے کچھ دنوں تو مزاحمت کی۔ ۳۱ اکتوبر کو نہرو نے دفاع کی وزارت خود سنبھال لی اور کرشنا مینن کو دفاعی پیداوار کا وزیر مقرر کر دیا گیا تب کرشنا مینن نے تیزپور میں ایک نہایت احمقانہ اور مہمک بیان داغ دیا۔ اس نے کہا کہ "کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے میں تو اب بھی وزارت دفاع میں ہی بیٹھا ہوں"۔ یہ بیان اس کے تابوت میں آخری

کیل ثابت ہوا۔ کابینہ کے سینئر وزراء نے جن میں کرشن مچاری بھی شامل تھا۔ کرشنا مینن کو برطرف کرنے کا مطالبہ کیا صدر رادھا کرشنن نے بھی وزیر اعظم کو مشورہ دیا کہ کرشنا مینن کو کابینہ سے نکال دیا جائے یہ دھمکی بھی دی گئی کہ اگر وزیر اعظم نے کرشنا مینن کو برطرف نہ کیا تو کانگریس پارلیمانی کے ارکان کی بڑی تعداد پارلیمانی پارٹی کے اجلاس عام کا بائیکاٹ کر دے گی اب نہرو کو نوشتہ دیوار نظر آنے لگا اور اب وہ اس احمقانہ نظریہ سے چھٹے نہیں رہ سکتے تھے کہ "کرشنا مینن پر حملہ میری ذات پر حملہ ہے"۔ اندرا نے بھی کچھ کام دکھایا اس نے لال بہادر شاستری سے مشورہ کیا اور کانگریس کے بعض اعلیٰ قائدین کو جن میں صدر کانگریس یو این دھیبر اور کامراج شامل تھے، کرشنا مینن کی برطرفی کا مطالبہ کرنے پر اکسایا۔ کامراج روانی سے انگریزی نہیں بول سکتا تھا۔ بلکہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولتا تھا۔ اس نے وزیر اعظم سے ملاقات کی اور چھوٹتے ہی بولا۔ "کرشنا مینن کو اب جانا ہی چاہیئے"۔ نہرو نے کرشنا مینن کا دفاع کرنے اور صورتحال کی وضاحت کرنے کی کوشش کی مگر ملاقات کے آخر میں کامراج نے جو الوداعی جملہ بولا وہ بھی یہی تھا "کرشنا مینن کو اب جانا ہی چاہیئے"۔ اور ۷ نومبر ۱۹۶۲ء کو کرشنا مینن ایسا شخص بن کر رخصت ہوا جس نے بھارت کو ذلیل کیا۔ بھارتی فوج کا وقار خاک میں ملا دیا اور خود سربازار رسوائی اور ذلت کا نشانہ بنا۔

نہرو نے کوشش کی کہ کرشنا مینن کو منصوبہ بندی کمیشن کا رکن بنا دیا جائے۔ اٹارنی جنرل نے اس پر رائے ظاہر کی کہ پارلیمنٹ کی رکنیت سے مستعفی ہوئے بغیر کرشنا مینن منصوبہ بندی کمیشن کا رکن نہیں بن سکتا۔ کیونکہ ارکان کمیشن سرکاری ملازم تصور ہوتے ہیں۔

وزارت سے نکلنے کے بعد کرشنا مینن نے بڑے طمطراق سے سپریم کورٹ میں قانونی پریکٹس کا آغاز کیا۔ شروع شروع میں تو اسے چند مقدمات مل گئے مگر اس نے عدالت میں پیش ہونے سے قبل مقدمے کی کبھی تیاری ہی نہ کی۔ اکثر ایسا ہوا کہ ججوں کو اسے بتانا پڑا کہ وہ کسی سیاسی جلسہ میں تقریر نہیں کر رہا ہے آہستہ آہستہ کرشنا مینن کو مقدمات ملنے بند ہو گئے۔

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ کرشنا مینن سرکاری شعبے میں صنعتوں کے قیام کا حامی تھا۔ یہ بالکل غلط ہے، ۱۹۴۷ء میں اس نے مجھ سے کہا کہ حکومت کی طرف سے دفاعی صنعتوں کے سوا دوسری صنعت قائم کرنا بھارت جیسے ترقی پذیر ملک کے لئے سود مند نہ ہوگا ٹاٹا، برلا اور دوسرے صنعتکاروں کی بھرپور حوصلہ افزائی کی جانی چاہیئے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ صنعتیں قائم کریں۔ اس طرح حکومت مزدوروں کے مسائل سے بھی بچی رہے گی۔

ایک روز ایک طویل تار جس پر "ذاتی، فوری اور انتہائی خفیہ" کے الفاظ درج تھے۔ وزارت خارجہ کے خفیہ شعبہ میں موصول ہوا۔ یہ تار خفیہ الفاظ میں تھا اور بمبئی سے کرشنا مینن نے بھیجا تھا۔ نو صفحات پر مشتمل یہ تار خارجہ امور میں کسی معمولی سے مسئلہ کے بارے میں تھا اسے بمبئی حکومت کے سیکرٹریٹ میں خفیہ زبان میں ڈھالا گیا اور وزارت خارجہ میں پھر اصل رنگ میں لایا گیا اس تار کو مجھ تک پہنچنے میں پانچ دن لگ گئے متعلقہ شعبے نے اندازہ لگایا کہ اس تار پر پانچ ہزار روپے صرف ہو چکے ہیں حالانکہ یہ کرشنا مینن کے افکار پریشان کا مجموعہ تھا۔ میں نے وزیر اعظم سے اس کا ذکر کر دیا جب کرشنا مینن بمبئی سے دہلی آیا تو میں نے اسے پوچھا کہ اس نے یہ فضول کا طویل تار کیوں دیا۔ یہی باتیں وہ خط میں لکھ سکتا تھا جو دوسرے دن دہلی میں موصول ہو جاتا۔ اس کا جواب تھا تار کا وزیر اعظم پر زیادہ اثر ہوتا میں نے اسے بتایا کہ میں نے وزیر اعظم کو بھی اس کے اخراجات کے بارے میں بتا دیا ہے کرشنا مینن میں بچت کا تو احساس ہی نہ تھا۔

وزیر دفاع بن جانے کے بعد بھی کرشنا مینن نے وزارت خارجہ میں اپنے کمرہ پر قبضہ برقرار رکھا۔ ایک روز میں ادھر جا نکلا۔ کرشنا مینن دو روز سے کشمیر گیا ہوا تھا۔ مگر میں نے دیکھا کہ اس کمرے کا ایر کنڈیشنر بدستور چل رہا ہے۔ میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ تو احکام کی تعمیل میں ہو رہا ہے۔ میں نے امور خارجہ کے انتظامی شعبے سے کہا کہ ایر کنڈیشنر بند کر دیا جائے کمرہ سے تمام فرنیچر اور ٹیلی فون اٹھا دیا جائے اور اسے کمرہ نشست میں تبدیل

کر دیا جائے۔ جہاں کابینہ کے اجلاس بھی منعقد ہو سکیں۔ متعلقہ افسر کچھ ہچکچایا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ پھنس نہ جائے۔ میں نے اسے کہا کہ اس پر کوئی حرف نہ آئے گا۔ اگر کوئی پوچھے تو میرا نام لے کر کہہ دینا کہ سب کچھ میرے حکم سے ہوا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں کرشنا مینن کو تحریری اطلاع دی اور وزیر اعظم سے زبانی بات کر لی۔ وزیر اعظم نے میرے اقدام کو پسند کیا۔ جب کرشنا مینن کشمیر سے واپس آیا اور اس نے میرا نوٹ پڑھا تو وہ بہت پریشان ہوا وہ سیدھا میرے پاس یہ معلوم کرنے کے لئے آیا کہ کیا میں اپنے احکامات واپس لے سکتا ہوں۔ اس نے میرے اقدام کو ختم کرنے کی ضرورت یہ بیان کی کہ "اس طرح لوگوں میں یہ تاثر پیدا ہوگا کہ کرشنا مینن کا اب وزارت خارجہ سے کوئی تعلق نہیں" میں نے کہا کہ سچی بات یہی ہے اور یہ تاثر ملنا ہی چاہیئے۔

کرشنا مینن جب وزیر بے محکمہ مقرر ہوا تو پوٹر نے جو کرشنا مینن کے چیف سیکنڈل میں ملوث تھا دعویٰ کر دیا۔ اس نے کرشنا مینن کو نوٹس دیا تو وہ بھاگا بھاگا لندن پہنچا۔ اس نے لندن کے بنکوں سے اپنی ملائی کمشنری کے زمانے کی جمع شدہ تنخواہ نکلوائی اور پوٹر کو بھاری رقم دے کر خاموش کیا۔ انہی دنوں وزیر اعظم نے مجھ سے کہا کہ کرشنا مینن کو ایوان وزیر اعظم چھوڑ کر اپنا بسیرا کرنا چاہیئے۔

وزیر اعظم نے مجھے کہا کہ یہ کام شریفانہ انداز میں کیا جانا چاہیئے۔ انہوں نے کہا کہ "وہ اکثر ایسے وقت پر میرے کمرے میں آ جاتا ہے۔ جب میں کام کر رہا ہوتا ہوں۔ وہ میرے اعصاب پر سوار ہوتا جا رہا ہے۔ وہ جب بھی میرے مطالعہ کے کمرے میں داخل ہوتا ہے میں اعصابی کشیدگی محسوس کرنے لگتا ہوں"۔ میں نے کرشنا مینن سے وزیر اعظم کا نام لئے بغیر یہ معاملہ اٹھایا۔ اس نے پہلے تو ہچر مچر کی مگر پھر سیدھی راہ پر آ گیا اور بولا "بڑے میاں مجھے وزیر اعظم کے بنگلہ سے قریب ہی کوئی جگہ دلا دو، میں لوگوں کو یہ تاثر نہیں دینا چاہتا کہ وزیر اعظم سے میرا قریبی رابطہ نہیں رہا"۔ چنانچہ میں نے اسے ایوان وزیر اعظم سے چند گز دور ایک بنگلہ

دلا دیا۔

کرشنا مینن جب کبھی بیرون ملک، بالخصوص امریکہ جاتا وہ اپنے ساتھ ایک برطانوی ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ بھی لے جاتا جس میں اس امر کی تصدیق کی گئی تھی کہ وہ نامرد ہے ایک بار یوں ہوا کہ نیویارک میں ایک خوبرو نوجوان ہسپانوی عورت اس کی جان کو آ گئی۔ کرشنا مینن اسے اکثر شبینہ کلبوں اور ریستورانوں میں لے جایا کرتا تھا۔ اس نے کرشنا مینن کو یہ کہہ کر بلیک میل کرنے کی دھمکی دی کہ میں پریس کو بتا دوں گی کہ میرے ساتھ تمہارے ناجائز تعلقات ہیں۔" کرشنا مینن کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔ اس نے اقوام متحدہ کے ایک بھارتی ملازم کی خدمات حاصل کیں اسے کرشنا مینن نے ہی ملازمت دلائی تھی۔ وہ شخص ہسپانوی عورت سے ملا اور اسے برطانوی ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ بھی دکھا دیا۔ مگر وہ عورت بد دل نہ ہوئی اس نے کہا کہ کرشنا مینن سے کہہ دو یہ سرٹیفکیٹ بھی شائع کرا دے بالآخر کرشنا مینن کو بھاری رقم کے عوض اس عورت کی خاموشی خریدنا پڑی۔

کرشنا مینن سے تین بار میری جھڑپیں ہوئیں۔ ایک مرتبہ میں ایوان وزیر اعظم میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ کرشنا مینن آ گیا۔ وہ بیٹھا گپیں ہانکتا رہا۔ ان دنوں وہ کابینہ میں وزیر تھا۔ گپ بازی کے دوران اس نے کہا "کیا تمہیں معلوم ہے کہ نہرو لیڈی ماؤنٹ بیٹن کا پالتو تھا" اس پر مجھے بڑا غصہ آیا۔ میں نے کہا "اگر تم نے یوں کہا ہوتا کہ لیڈی ماؤنٹ بیٹن وزیر اعظم کی داشتہ تھی تو میں تمہاری بات کا کوئی نوٹس نہ لیتا۔ تم اس شخص کے ذرا بھی احسان مند نہیں ہو جس کے بغیر تم آج گٹر کا ایک حقیر کیڑا ہوتے۔" میں نے اسے کہا کہ فوراً میرے کمرے سے نکل جاؤ۔ وہ بغلیں جھانکنے لگا، اور حماقت اس کے چہرے پر برسنے لگی دوسرا واقعہ لندن میں ۱۰ ڈاؤننگ سٹریٹ (ایوان وزیر اعظم) میں پیش آیا۔ کابینہ کے کمرے میں دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کا اجلاس ہو رہا تھا۔ مذاکرات کی میز پر نہرو اور مسز وجے لکشمی پنڈت بیٹھے تھے۔ میں این آر پلائی اور کرشنا مینن ان کے پیچھے نشستوں پر براجمان تھے میرے ساتھ ہی کینیڈا کا سیکرٹری امور خارجہ بیٹھا تھا۔ نہرو کسی نکتہ پر بول رہے تھے کہ کرشنا

مینن نے میری طرف جھک کر کینیڈا کے سیکرٹری کو سنانے کے لئے کہا "وہ نہرو اب کمزور ہو گیا ہے۔ میں کب تک پچھلی نشست پر بیٹھ کر کار چلاؤں گا۔" میں نے کینیڈا کے سیکرٹری کو سناتے ہوئے کرشنا مینن سے کہا "بکواس بند کرو۔" تیسرا واقعہ میرے سرکاری ملازمت سے مستعفی ہونے کے ایک ہفتہ بعد ایوان وزیر اعظم کے سیکرٹریٹ میں میرے دفتر میں پیش آیا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ کرشنا مینن نے میرے استعفیٰ پر ناگوار سا تبصرہ کیا ہے۔ میں نے اسے ٹیلی فون کیا اور کہا کہ میں تمہیں تمہارے دفتر میں ملنا چاہتا ہوں۔ وہ بولا "بڑے میاں تم کیوں تکلیف کرتے ہو، میں خود آ جاتا ہوں۔" میں نے کہا کہ میں خود تمہارے دفتر میں آ کر ملاقات کو ترجیح دوں گا۔ مگر اس نے آنے پر اصرار کیا اور میرے کمرے میں چلا آیا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا "میں تم سے تمہارے دفتر میں اس لئے ملاقات کرنا چاہتا تھا کہ میں جو کچھ کہنے والا ہوں وہ تمہیں ناگوار گزرے گا۔ تم ایک احسان فراموش انسان ہو۔ تم نے وزیر اعظم سمیت سب کو اپنی اسامی سمجھ رکھا ہے اور ہمیشہ اپنا الو سیدھا کیا ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں جو استعفیٰ دے کر واپس لیا کرتے ہیں۔ اب میں حکومت میں تو واپس آنے سے رہا مگر یاد رکھو میں چاہوں تو باہر رہ کر تمہیں زیادہ خوار کر سکتا ہوں۔ اب تم دفع ہو جاؤ، میں تمہارا گھوڑے ایسا منہ دوبارہ دیکھنا نہیں چاہتا۔" کرشنا مینن سخت پریشان ہوا وہ کانپ رہا تھا اور آہستہ سے بولا "میرے ساتھ کوئی اس طرح گفتگو نہیں کرتا" میں نے کہا کہ میں "کوئی" نہیں ہوں۔ پھر وہ لڑکھڑاتا ہوا میرے کمرے سے نکل گیا اور اس کے بعد میں اس سے کبھی نہیں ملا حالانکہ اس نے دو مرتبہ مجھ سے ملاقات کی کوشش کی تھی

کرشنا مینن مزاح کی حس سے بالکل عاری تھا۔ وہ پہلے پہل وزیر اعظم کے ساتھ کشمیر گیا۔ ابھی وہ وزیر نہیں بنا تھا۔ ایک دن میں وزیر اعظم اور کرشنا مینن مہمان خانے کے باہر دھوپ میں بیٹھے تھے نہرو چھیڑ چھاڑ کے موڈ میں تھے۔ انہوں نے کرشنا مینن سے کہا کہ تم ملیالیوں کو یہاں تہذیب سکھانے کے لئے لایا جاتا ہے۔ اس پر کرشنا مینن کا چہرہ سرخ ہو گیا اس نے

میری طرف دیکھا تو میں نے کہا "تم وزیرِ اعظم سے کیوں نہیں پوچھتے کہ وادیٔ سری نگر کے درمیان میں بلند پہاڑی کی چوٹی پر کیا ہے۔ یہ شنکر اچاریہ کا مندر ہے۔ شنکر اچاریہ کو جو کیرالہ کا رہنے والا تھے۔ پیدل کشمیر آنا پڑا۔ تاکہ یہاں کے لوگوں کو تہذیب کا درس دے سکے۔" اب کرشنا مینن کا غصہ اتر گیا اس نے اپنی باقی زندگی شنکر اچاریہ کے مندر کو یاد رکھا

ایک روز جب اندرا دہلی سے باہر گئی ہوئی تھی میں وزیرِ اعظم کے ساتھ ناشتہ کر رہا تھا کرشنا مینن بھی آ دھمکا۔ میں نے اس کے لئے چائے منگوائی۔ کافی پینے کے بعد جب وزیرِ اعظم نے سگریٹ سلگایا تو کرشنا مینن سگریٹ کی ڈبیا سے اٹکھیلیاں کرتے ہوئے مختلف ولایتی سگرٹوں کے نام اور ان کے ذائقے گنوانے لگا۔ میں بڑا حیران ہوا اور میں نے اس سے در کیا کبھی تم نے عمر بھر سگریٹ پیا بھی ہے۔" اس کا منہ لٹک گیا مگر وزیرِ اعظم اتنا ہنسے کہ دھواں غلط نال میں جانے کے باعث انہیں کھانسی آنے لگی۔ جب ہم کھانے کے کمرے سے باہر آئے تو کرشنا مینن نے مجھ سے کہا "تمہیں وزیرِ اعظم کی موجودگی میں ایسی بات نہیں کرنی چاہیئے تھی۔" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "تم جس چیز کے بارے میں جانتے نہیں اس کے بارے میں باتیں کیوں بناتے ہو۔"

وزارت سے نکلنے کے بعد بھی کرشنا مینن کو سفر کا چسکا تھا۔ وہ درجہ اول میں فضائی سفر کرتا اور لندن نیویارک اور دوسرے شہروں کے مہنگے ہوٹلوں میں قیام کرتا۔ جلد ہی زبانیں چلنے لگیں اور لوگ برملا کہنے لگے۔ "اس نے اتنی دولت کہاں سے حاصل کی ہے۔" پوری زندگی کرشنا مینن اختلافات کا موضوع بنا رہا۔ اس کی موت پر لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے رہے کہ کرشنا مینن نے جو ایک لاکھ روپیہ چھوڑا ہے وہ کہاں سے لیا تھا۔ اور اس کی قیمتی الماری میں لندن اور فرانس کی بنی ہوئی پانچ سو بالکل نئی قمیضیں کہاں سے آئی ہیں! موت بہت سے رازوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔

جن دنوں کرشنا مینن اقوامِ متحدہ میں اور دوسرے مقامات پر مغربی طاقتوں پر برس رہا تھا اقوامِ متحدہ میں فرانسیسی نمائندے نے اس کے متعلق ایک دلچسپ لطیفہ گھڑا جو جلد ہی ہر جگہ پھیل گیا۔ اس لطیفے سے "حادثہ" اور تباہی" کا فرق واضح کرنا مقصود تھا۔

لطیفہ یوں تھا، "اگر کرشنا مینن کسی کنوئیں میں گر جائے تو ہم اسے حادثہ" کہیں گے۔ لیکن اگر وہ گرنے کے بعد کنوئیں سے باہر نکل آئے تو ہم اسے تباہی گردانیں گے۔" مگر یہ لطیفہ فرانسیسی نمائندے کی تخلیق نہ تھا۔ اسی طرح کی بات پہلی جنگ عظیم کے بعد کلیمنسو نے امریکہ کے صدر وڈرو ولسن کے بارے میں کہی تھی۔

باب ۳۵

کیا نہرو مغرور تھے؟

۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کو نہرو کی وفات کے فوراً بعد چین کے وزیر اعظم چو این لائی نے لنکا کے ایک وفد کو پیکنگ میں بتایا "میری خروشیف سے ملاقات ہوئی، میں چیانگ کائی شیک سے ملا ہوں اور امریکی جرنیلوں سے بھی ملاقات کا اتفاق ہوا ہے مگر میں نے آج تک نہرو سے زیادہ کسی کو خود پسند اور متکبر نہیں پایا۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھے یہ کہنا پڑ رہا ہے مگر یہ ہے بالکل سچ"۔ دہلی میں ایک ہائی کمشنر نے جو خود متکبر المزاج شخص تھا اور اپنی تعلیم کے بارے میں اکثر شیخی بھگارتا رہتا تھا، مجھے بتایا کہ نہرو خود پسند شخص ہے حالانکہ یہ صاحب خود اپنے مزاج کے باعث دولت مشترکہ کے دوسرے ہائی کمشنروں میں نفرت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

بنڈونگ میں ۱۸ سے ۲۴ اپریل ۱۹۵۵ء تک افریشیائی کانفرنس کا انعقاد ہوا لنکا کے وزیر سرجان کوٹلاوالا نے کانفرنس کے شرکاء کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرائی کہ کمیونسٹوں کے حلقہ اثر میں موجود ممالک مثلاً ہنگری، بلغاریہ، رومانیہ، البانیہ، لٹاویہ، لتھونیہ، اسٹونیہ اور پولینڈ کی حیثیت افریقہ یا ایشیا میں موجود نوآبادیوں سے مختلف نہیں۔ چو این لائی اور بہت سے دوسرے قائدین کو گمان گزرا کہ سرجان کانفرنس کو ناکام بنانے پر تل گئے ہیں۔ نہرو کوٹلہ والا کے پاس گئے اور قدرے ترش روئی سے دریافت کیا "سرجان تم نے یہ کیوں کہا ہے۔ تم نے اپنی تقریر کا مسودہ مجھے کیوں نہ دکھایا"۔ کوٹلہ والا

سے نہرو کا رویہ کچھ ایسا تھا جیسے وہ صدر کانگریس کی حیثیت سے مجلس عاملہ کے کسی رکن سے باز پرس کر رہے ہوں۔ سرجان نے پلٹ کر جواب دیا "مجھے کیا ضرورت پڑی تھی کہ میں تمہیں اپنی تقریر کا مسودہ دکھاتا پھرتا، کیا تم تقریر کرنے سے قبل مجھے دکھایا کرتے ہو"۔ سرجان نے بعد میں اپنی کتاب "ایشیا کے ایک وزیر اعظم کی کہانی" میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا "مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ نہرو کے ریمارکس اور میرا جواب دونوں معنی خیز تھے۔ نہرو اور میں بہترین دوست ہیں۔ میرے دل میں نہرو کا بے حد احترام ہے۔ خصوصاً میں اس بات پر نہرو کا مداح ہوں کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں اس میں ان کی ذاتی غرض شامل نہیں ہوتی"۔

میرے خیال میں نہرو اتنے سلجھے ہوئے انسان تھے کہ وہ خود پسند ہو ہی نہیں سکتے۔ البتہ بعض اوقات ان سے اضطراری طور پر بعض حرکات سرزد ہو جایا کرتی تھیں۔ وہ اکثر صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا کرتے تھے۔ مجھے اس بات پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ جب میں نے سنا کہ ان کے خاندان میں ایک شادی کے موقع پر وہ کھانے پینے کی دعوت ملنے سے قبل ہی شادی کا کیک کاٹ بیٹھے تھے۔ اور جب کسی نے ان کی توجہ اس طرف دلائی تو وہ ایک معصوم بچے کی طرح شرمندہ شرمندہ واپس اپنی جگہ آ کر بیٹھ گئے۔ وہ متکبر نہیں تھے مگر ان میں اس شخص کی معمولی سی کمزوری ضرور تھی جس نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز ہی بلندی سے کیا ہو۔

باب ۳۶

نہرو اور بیوروکریسی

نہرو ۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو عبوری حکومت میں شامل ہونے اس سے پہلے بھی انڈین سول سروس اور دوسری نام نہاد اعلیٰ سروسوں کے بارے میں جو ہندوستان میں برطانوی سامراج کا مضبوط ڈھانچہ تھیں ان کے خیالات چنداں اچھے نہ تھے۔ پھر آزادی ملتے ہی انہیں ایک مدراسی آئی سی ایس رام مورتی سے پالا پڑا جو برطانوی راج میں صوبائی گورنر رہ چکا تھا۔ نہرو کو اس کا تلخ تجربہ ہوا۔ وہ رام مورتی کو شرنارتھیوں کی امداد اور بحالی کے بورڈ کا چیئرمین بنانا چاہتے تھے۔ نہرو کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھے جو جذباتی طور پر پناہ گزینوں کے مسئلہ سے وابستہ نہ ہو۔ انہوں نے رام مورتی کو بلایا اور اس صورت حال پر اس سے بات کی انہوں نے رام مورتی سے کہا کہ پناہ گزینوں کا مسئلہ ایک بہت بڑا انسانی مسئلہ ہے۔ بجائے اس کے کہ رام مورتی اس مسئلہ کی پیچیدگیوں اور مستقبل میں اس کے پھیلاؤ پر گفتگو کرتا اس نے نہایت احمقانہ انداز میں اپنی تنخواہ، مراعات، ریلوے سیلون، حکومت میں پوزیشن اور بنگلے وغیرہ کے بارے میں سوالات شروع کر دیئے۔ نہرو نے ملاقات یکایک ختم کر کے اس جاہ پسند شخص سے گلو خلاصی کرائی۔ مگر آزادی کے بعد ملک پر جو گزری اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ سول سروس کے بیشتر افسر فرقہ وارانہ تعصب اور تنگ نظری سے بالاتر ہیں اور انہوں نے نہایت مشکل اور صبر آزما حالات میں انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اس کا نہرو پر اچھا اثر ہوا۔

۱۹۵۲ء کے دوران میں نے وزیراعظم سے تین امور اٹھائے۔

۱۔ لی کمیشن کی رپورٹ میں بھارتی سول سروس کے سفر خرچ کے متعلق جو قواعد بنائے گئے ہیں، انہیں کالعدم قرار دیدیا جائے۔

۲۔ بھارتی سول اور فوجی افسروں کی پنشن پاؤنڈ میں متعین کرنے کا طریقہ ختم کر دیا جائے اور تینوں افواج کے سربراہوں کے لئے کمانڈر انچیف کا عہدہ ختم کر دیا جائے۔

لی کمیشن کی رو سے کسی بھی آئی سی ایس افسر کو ملازمت کے دوران اپنے بال بچوں سمیت پانچ مرتبہ حکومت کے خرچ پر لندن جانے اور وہاں قیام کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ اس دوران وہ اپنی تنخواہ بھی پاؤنڈ سٹرلنگ میں وصول کرنے کے مجاز تھے۔ وزیراعظم نے وزیر داخلہ کے این کھجو اور کابینہ کے سیکرٹری وائی۔ این سکھانکر کو اس سلسلے میں ضروری ہدایات جاری کر دیں۔ انہوں نے کابینہ کے اجلاس میں بھی اس کا ذکر کیا۔ کابینہ کی طرف سے بھی وزارت داخلہ کو اس سلسلے میں ضروری تجاویز پیش کرنے کو کہا گیا بار بار کی یاد دہانیوں کے باوجود پانچ سال گزر گئے اور کابینہ کے سیکرٹریٹ یا وزارت داخلہ کی طرف سے اس سلسلے میں کوئی اقدام نہ کیا گیا پھر ایک دن اچانک کابینہ میں لی کمیشن کے متعلقہ قواعد کو حذف کر دینے کے بارے میں تجویز پیش کی گئی۔ مگر یہ اس وقت ہوا تھا جب کابینہ کے سیکرٹری لی کمیشن کے تحت تیسری مرتبہ لندن میں بیوی بچوں سمیت تین ماہ کی تعطیلات منا کر واپس آئے تھے۔ یہ سول سروس میں سرخ فیتے اور وزیر داخلہ کی نااہلی کی ایک مثال ہے۔ پاؤنڈوں میں پنشن کی وصولی کا طریق کار بھی ابھی انہی دنوں ختم کیا گیا۔ جب کمانڈر انچیف کا عہدہ ختم کر کے ہر سروس کا چیف آف سٹاف مقرر کرنے کی تجویز پیش کی گئی تو جنرل کری آپا نے جو سمجھتا تھا کہ لارڈ کچنر کی دستار فضیلت اس کے سر بندھ گئی ہے۔ بڑا شور مچایا۔ کیونکہ اس صورت میں چیف آف سٹاف کے پاس فوج کی کمان کی ذمہ داری نہیں ہوتی بلکہ یہ کام علاقائی کمانڈروں کے سپرد ہوتا ہے۔

بعض بڑے فوجی افسروں نے بھی نئے نظام پر سخت اعتراض کئے اور نجی محفلوں میں یہ تک کہا گیا کے فوج کسی "دھوتی پرشاد" کو کمانڈر انچیف کے طور پر قبول نہیں کرے گی۔ یہ صدر راجندر پرشاد کی طرف اشارہ تھا جو بطور صدر آئینی اعتبار سے فوجوں کے کمانڈر انچیف تھے تاہم جنرل کری آپا کی سبکدوشی کے بعد نیا نظام نافذ کر دیا گیا۔

۱۹۵۰ء میں جب میرا اور وزیر اعظم کا نیا سفارتی پاسپورٹ بنایا جا رہا تھا میں نے چیف پاسپورٹ افسر سے کہا کہ وہ پاسپورٹ میں ممالک کا اندراج کرنے کے بجائے یہ لکھ دے "دنیا کے تمام ممالک کے لئے"۔ اس نے اس پر احتجاج کیا اور کہا کہ اس قسم کی کوئی روایت پہلے سے موجود نہیں۔ میں نے اسے کہا پہلے تمہارا کوئی وزیر اعظم بھی تو نہیں ہوتا تھا۔ روایات کے غلام نہ بنو اپنی روایات قائم کرو۔ مجھے ایک ہفتہ کے اندر پاسپورٹ اور تمام ضروری ویزے چاہئیں اس نے پلٹ کر سوال کیا۔ "اگر کسی غیر ملکی حکومت نے اعتراض کیا تو؟" میں نے کہا "جاؤ جو کہا گیا ہے وہ کرو کوئی حکومت اعتراض نہیں کرے گی"۔ وہ بھاگا بھاگا اپنے باس سیکرٹری خارجہ کے پاس گیا مگر اس میں اتنی عقل تھی کہ فضول سوالات اٹھانے کے بجائے اس نے میری ہدایت کے مطابق پاسپورٹ جاری کرنے کا حکم دیا۔

میں یہاں افراد کا ذکر نہیں کرنا چاہتا۔ بس ایک شخص کی بات کروں گا۔ یہ جیراج شنکر باجپائی تھا جو برطانوی دور میں خوب پھلا پھولا۔ وہ اپنی ملازمت کے اوائل میں ہی وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن بن گیا" ہندوستان چھوڑ دو" تحریک کے بعد اسے واشنگٹن بھیجا گیا جہاں وہ ہندوستانی حکومت کا ایجنٹ جنرل مقرر ہوا۔ اس کا دفتر امریکہ میں برطانوی سفارتخانے کا ذیلی دفتر تصور ہوتا تھا اور واشنگٹن میں باجپائی کا کام۔ "ہندوستان کی تحریک آزادی گاندھی اور نہرو پر الزام تراشی تھا۔ وہ نہرو کو ہندوستان کا ہملٹ" کہہ کر خوش ہوتا تھا۔ وہ اپنے رویہ بات چیت اور الفاظ کی ادائیگی میں نمود و نمائش کا رسیا تھا۔ ایک مرتبہ نیویارک میں اسے ایک اہم تقریب میں شامل ہونا تھا۔ راستے میں تاخیر ہو گئی تو اس نے ڈرائیور سے کہا کہ ٹریفک کے قواعد کی پروا کئے بغیر چلتے چلو جلدی

پولیس کی گاڑیاں اس کے پیچھے لگ گئیں اور اسے گھیر لیا۔ باجپائی بڑا سیخ پا ہوا اس نے امریکی کانسٹیبل سے کہا "تم نہیں جانتے میں کون ہوں"! پھر خود ہی اس سوال کا جواب دیا "میں ہوں باجپائی" وہ امریکی بھی بڑا حضرت تھا بولا "اگر تم ٹریفک کے قواعد کی پابندی نہیں کرو گے تو جلد ہی تم "خاک پائی" ہو کر رہ جاؤ گے"۔ باجپائی نیویارک میں ہی ایک تقریب میں مدعو تھا۔ جب وہاں گیا تو دروازے پر متعین ملازم نے بآواز بلند کہا۔ "حاضرین سر باجپائی اور لیڈی پائی تشریف لاتے ہیں"۔ باجپائی کو غصہ آگیا اور وہ اس شخص سے فضول سی بحث میں الجھ گیا۔

عبوری حکومت کے قیام کے ذرا بعد باجپائی کو واشنگٹن سے واپس بلا لیا گیا اور وزارت خارجہ کا سیکرٹری جنرل مقرر کیا گیا۔ اس تقرر کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ نہرو کو غیر ملکی سفیروں کی ملاقاتوں سے نجات دلائی جائے بہت سے امور میں باجپائی اچھا سیکرٹری جنرل ثابت ہوا مگر اسے یہ وقوف نہیں تھا کہ بھارت کا مفاد کس بات میں ہے۔ مثلاً کشمیر کے معاملے میں اس نے خود کو اقوام متحدہ کے نمائندہ کا پابند بنا لیا بجائے اس کے کہ وہ پاکستان کے خلاف بھارت کی شکایت کے مدنظر اپنے موقف پر قائم رہتا اس نے بعض رعایتیں دینا شروع کر دیں اور اس طرح کشمیر کے معاملے کو الجھا کر رکھ دیا۔

۱۹۴۸ء میں دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس کے سلسلے جب میں اور نہرو لندن گئے تو ہمیں برطانوی حکومت کے مہمان کی حیثیت سے کلیریجز ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ ہوٹل کا مینجر میرے پاس یہ بتانے کے لئے آیا کہ اشیائے ضرورت کی قلت کے باوجود حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم جو چاہیں گے ہمیں مہیا کیا جائے گا۔ میں نے مینجر سے دریافت کیا کہ وہ کونسی چیز ہے جو مشکل دستیاب ہے اس نے کہا انڈے۔ پھر یہ بھی بتایا کہ مہمانوں کو چینی اور مکھن بھی محدود پیمانے پر دیا جاتا ہے۔ میں نے مینجر سے کہا "بھارتی وفد اشیاء کی قلت کے معاملے میں آپ سے تعاون کرے گا۔ ہمیں انڈے بالکل نہ دیئے جائیں اور ہم سے کوئی خصوصی رعایت

نہ برتی جائے۔" میں نے نہرو سے بھی اس واقعہ کا ذکر کیا۔ انہوں نے میری بات کو سراہا مگر باجپائی لگا بڑبڑ کرنے۔ ان دنوں انگلستان میں حالات اس قدر ناگفتہ بہ تھے کہ جب ہم چند روز کے لئے ڈبلن گئے تو لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے مختلف مالیت کے کرنسی نوٹوں کا گٹھا میری جیب میں ٹھونس دیا اور کہا "بیک ہم ایک مدت سے اچھے گوشت سے محروم ہیں ڈبلن سے ہمارے لئے گوشت لیتے آنا۔" لندن واپسی پر میں نے جب اسے پچاس کلو تازہ گوشت کئی درجن انڈے اور بقایا رقم دی تو وہ اتنی خوش ہوئی جیسے کوئی نیم قحط زدہ جنگی قیدی ہو۔

لندن میں قیام کے دوران میں مزدوروں کی ایک بستی میں گیا میں ایک ایسے چھوٹے سے گھر میں گیا جو میاں بیوی اور ایک بچے پر مشتمل تھا اس وقت میاں تو فیکٹری گیا ہوا تھا۔ سرکاری افسر کی اجازت سے جو میرے ساتھ تھا۔ میں نے اس خاتون سے راشن کی مشکلات اور اشیاء کی قلت کے بارے میں چند سوالات کئے۔ اس عورت نے کھٹ سے جواب دیا "ہماری مشکلات بھی ہیں اور اشیاء کی قلت کا سامنا بھی ہے مگر ہم اس قلت میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ میرے بچے کو اتنا ہی دودھ ملتا ہے جتنا کسی ڈیوک کے بیٹے کو فراہم کیا جاتا ہے۔ مجھے کوئی شکایت نہیں" یہ حقیقت ہے کہ برطانیہ میں دوران جنگ اور جنگ کے بعد راشننگ کا نظام بدعنوانیوں سے پاک تھا اور بہت کم اشیاء بلیک میں فروخت ہوتی تھیں۔ لندن سے ہم پیرس گئے وہاں حالات بالکل مختلف تھے۔ پیرس سے بھارت روانہ ہوتے وقت مجھے دل میں کہنا پڑا کہ برطانوی عظیم قوم ہیں۔

۱۹۴۹ء میں نہرو امریکہ کے پہلے دورے پر گئے۔ میں باجپائی اور اندرا بھی ساتھ تھے۔ لندن سے واشنگٹن تک ہم نے صدر ٹرومین کے ذاتی طیارے "متبرک گائے" میں سفر کیا۔ راستے میں طیارہ نیو فاؤنڈ لینڈ میں رکا جہاں امریکی فضائیہ کے بیس کمانڈر نے ہماری آؤ بھگت کی ہم طیارے سے نیچے اترے امریکی کمانڈر نہرو اور اندرا کو ساتھ لے کر چلا گیا تو فضائیہ کا ایک کیپٹن باجپائی کے پاس آیا۔ اس نے احمقانہ سوال پوچھا "کیا آپ انگریزی جانتے ہیں۔" باجپائی کا پارہ چڑھ

گیا اور اس نے درشتی سے کہا "تم کیا چاہتے ہو؟" اس پر میں نے مداخلت کرتے ہوئے امریکی کیپٹن کو بتایا کہ یہ شخص آکسفورڈ کا تعلیم یافتہ ہے اور اتنی عمدہ انگریزی بولتا ہے کہ بہت کم امریکی بول سکتے ہیں اس پر کیپٹن خفیف سا ہوا اور اس نے باجپائی سے معذرت کرلی۔ اس کے بعد دو دن تک باجپائی امریکی کیپٹن کی باتیں کرتا رہا۔ وہ ہر مرتبہ کہتا "دیکھو یہ حرامی پوچھتا تھا کہ مجھے انگریزی آتی ہے یا نہیں حالانکہ میں انگریزی، فرانسیسی، فارسی، سنسکرت، اُردو اور ہندی جانتا ہوں۔" اگر باجپائی کسی ایری غیری زبان کے عالم ہونے کا بھی دعویٰ کر دیتا تو میں اس کے دعوے کو چیلنج تھوڑے ہی کرتا۔

امریکہ میں رسمی تقریبات کے لئے باجپائی نے سیاہ اچکن، چوڑی دار پاجامہ اور گاندھی کیپ سلوا رکھی تھیں۔ مگر ان کی سلائی نہایت ناقص تھی۔ واشنگٹن کے ایک عشائیہ میں باجپائی نے یہ نئے کپڑے پہن رکھے تھے جن کا وہ عادی نہ تھا۔ اس لباس میں وہ بالکل باورچی معلوم ہوتا تھا ہم دونوں کھانے کی میز پر آمنے سامنے کھڑے تھے کہ باجپائی کے پہلو میں کھڑی چنچل سی عورت نے لیڈی باجپائی کے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔ یہ عورت باجپائی کو جانتی تھی۔ مگر اس وقت اس کے مسخروں جیسے لباس کی وجہ سے پہچاننے سے قاصر رہی تھی باجپائی کی اہلیہ قدوقامت میں اس سے دوگنا تھی۔ اس امریکی عورت نے باجپائی کی اہلیہ کی تعریف کی اور کہا کہ اس کی ٹھوڑی پر جو تل ہے وہ بڑا خوبصورت ہے۔ باجپائی اس سے خوش ہو رہا تھا کہ وہ اچانک بولی اس کے بڈھے شوہر کا کیا حال ہے باجپائی کا منہ لٹک گیا۔ خوش قسمتی سے وہ عورت ایک اور مرد کی طرف متوجہ ہو گئی اور باجپائی کی جان میں جان آئی۔

باجپائی کی مدت ملازمت میں دو بار توسیع کی گئی ۱۹۵۲ء میں اسے ریٹائر ہونا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اسے کسی صوبے کا گورنر بنا دیا جائے۔ اس نے وزیر اعظم سے بھی اس کا ذکر کیا مگر انہوں نے کوئی وعدہ نہ کیا چنانچہ وہ میری مدد حاصل کرنے کے لئے میرے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ وہ بمبئی کا گورنر بننا چاہتا ہے۔ میں نے وزیر اعظم سے بات کی تو انہوں نے بتایا کہ بیشتر وزراء نے

اعلیٰ سول افسروں کو بطور گورنر قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہیں نہرو اس حق میں نہ تھے کہ باجپائی کو کسی کے سر منڈھ دیں۔ انہوں نے کہا "باجپائی میں کچھ کچھ خامی ضرور ہے، تاہم تم بمبئی کے وزیر اعلیٰ بی جی کھر سے بات کر دیکھو۔" کھران دنوں دہلی آیا ہوا تھا میں اس سے بات کی تو وہ باجپائی کو گورنر بمبئی مقرر کرنے کے بالکل خلاف نہ تھا تاہم اس نے کہا کہ آئندہ الیکشن کے بعد مرارجی ڈیسائی کو صوبہ کا وزیر اعلیٰ مقرر ہونا ہے۔ میں اس سے بات کروں گا اور تم دو تین دن بعد اس سے بات کرنا۔ میں نے مرارجی سے بات کی تو اس نے مجھ سے پوچھا۔ "باجپائی شراب پیتا ہے۔" میں نے کہا نہیں وہ صرف ایک سگریٹ روزانہ پیتا ہے۔ وہ بھی سہ پہر کی چائے کے وقت۔ اس کا مرارجی پر اچھا اثر ہوا اور جب اس نے وزیر اعظم کو بمبئی کی گورنری کے لئے تین نام پیش کئے تو ان میں باجپائی کا نام بھی شامل تھا۔ اسے گورنر مقرر کر دیا گیا اور اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہو گئی

باب ۳۷

نہرو کی گوپیاں

نہرو نے ایک بار گفتگو میں خود کو بے دین قرار دیا تھا۔ وہ اخلاقیات کی بھی کوئی پروا نہیں کرتے تھے۔ مجھے اب تک نہرو خاندان کے کسی فرد۔ مرد ہو یا عورت کی تلاش ہے جس کا عقیدہ "ایک مرد ایک عورت" ہو۔ نپولین کی لاتعداد داشتائیں تھیں۔ مگر امور سلطنت میں وہ کسی کو دخل دینے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ نپولین کا مقولہ تھا "عورت تو خالی دہن کے لئے محض معروفیت ہے اور کسی جنگجو کے لئے باعث سکون" نہرو کے معاملے میں بھی اس مقولے کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

مردولا سارابائی:۔ وہ عورت جس نے نہایت عزم اور کسی ہچکچاہٹ کے بغیر جو عام طور پر ہندوستانی عورت کا شیوہ نہیں، نہرو کا تعاقب جاری رکھا مردولا سارابائی تھی۔ وہ گجرات کا بھٹیاواڑ کے ایک متمول خاندان کی وارث تھی۔ وہ انتھک اور مخلص کانگریسی ورکر تھی۔ ۱۹۴۶ء کے اوائل میں ہی نہرو نے اس میں دلچسپی لینا چھوڑ دی تھی۔ وہ نسوانی حسن سے عاری تھی اور اس پر مستزاد یہ کہ لباس بھی بے ڈھنگے پن سے پہنتی تھی جس سے وہ اور بھی بدنما نظر آتی تھی۔ ۱۹۴۶ء میں جب نہرو نے کانگریس کی صدارت سنبھالی تو وہ چاہتے تھے کہ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی میں کچھ سوشلسٹ شامل کیے جائیں اور دو کو تو پارٹی کا سیکرٹری مقرر کر دیا جائے۔ لیکن سوشلسٹ آگے نہ بڑھے تو نہرو نے بی۔ وی کاسکر اور مردولا سارابائی کو جنرل سیکرٹری مقرر کر دیا۔ مردولا انگریزی سے تقریباً نابلد تھی چنانچہ اس نے

خطوط وغیرہ لکھوانے کے لیئے کچھ لوگوں کو ملازم رکھ لیا تھا تاہم کبھی کبھار وہ خود بھی نہرو کو انگریزی میں خط لکھا کرتی تھی جس کا نہ سر ہوتا نہ پیر۔ ۱۹۴۷ء میں مردولا سارا بائی کو تقسیم کے وقت اغوا کی جانے والی عورتوں کی بازیابی کا کام سونپا گیا۔ اس نے یہ کام بڑی محنت اور جانفشانی سے کیا اس نے بہت سی عورتوں کو برآمد کرایا اور اس سلسلے میں بعض اوقات بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا۔ مگر جرأت کا مظاہرہ اس سور کی جرأت کی مانند تھا جو شکاریوں میں گھر گیا ہو سچ تو یہ ہے کہ مردولا میں اس جانور سے زیادہ عقل بھی نہ تھی۔ وہ برآمد شدہ خواتین پر تشدد سے بھی نہیں چوکتی تھی حتیٰ کہ لوگ کہنے لگے کہ مردولا کو تو ملٹری پولیس میں ہونا چاہیئے تھا۔ انسانی مسائل کے حل میں وہ انسانی جذبات کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیتی تھی اسے انسانیت کا وقوف ہی نہ تھا۔

اس سلسلے میں بوٹا سنگھ کا واقعہ ایک مثال ہے۔ ۵۵ سالہ بوٹا سنگھ نے جو غیر شادی شدہ تھا، زینب نام کی ایک مسلمان لڑکی کو ایک شخص کے چنگل سے بچایا جو اسے اغوا کر کے جا رہا تھا۔ اس کے لئے بوٹا سنگھ نے پندرہ سو روپیہ ادا کیا۔ اس نے زینب سے شادی کر لی اور ان کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی جس کا نام تنویر رکھا گیا۔ بوٹا سنگھ کا ایک بھتیجا اس کی اراضی پر نظر رکھتا تھا۔ اس نے حکومت کو زینب کی موجودگی کے بارے میں بتا دیا یہ اطلاع مردولا تک پہنچی تو وہ اپنا گروہ لے کر بوٹا سنگھ کے گاؤں پہنچ گئی اور لڑکی کو برآمد کر لے آئی اسے چھ ماہ تک کیمپ میں رکھا گیا اور پھر اسے پاکستان بھیج دیا گیا بوٹا سنگھ کسی طرح اپنی بیٹی سمیت سرحد عبور کر کے لاہور پہنچ گیا۔ اس نے زینب سے ملاقات کی اس نے اسلام بھی قبول کر لیا مگر زینب کے عزیزوں نے زینب کو بوٹا سنگھ کے پاس نہ جانے دیا تو اس نے خودکشی کر لی۔ لاہور میں بوٹا سنگھ کو میانی صاحب کے قبرستان میں مسلمانوں نے بطور مسلمان کے دفن کیا اور اس کی بیٹی تنویر کو ایک مخیر شخص نے پالا اور ایک انجنیئر سے اس کی شادی کر دی۔ بوٹا سنگھ کی داستان سرحد کے دونوں طرف لاکھوں افراد

کی المناک داستانوں کی علامت ہے جو تقسیم کے دوران وجود میں آئیں۔

۱۹۵۲ء میں اور اس کے بعد مردولا پر الزام عائد کیا گیا کہ وہ مسئلہ کشمیر کے سلسلہ میں قومی مفادات کے منافی کارروائیوں میں ملوث ہے۔ چنانچہ وزیر داخلہ پنت کے حکم پر اسے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ میرے خیال میں اس پر قومی مفاد کے منافی سرگرمیوں کا الزام غلط تھا۔ البتہ اس نے اعتدال کی حدود کو پھلانگ کر حماقت کا ثبوت ضرور دیا تھا مردولا سے میری دو جھڑپیں ہوئیں ایک بار ۱۹۴۶ء میں جب برطانوی کیبنٹ مشن ہندوستان کا دورہ کر رہا تھا۔ ہم شملے میں تھے۔ وہ پٹھانوں جیسا لباس پہنے میرے کمرے میں آ گئی اور مجھ پر حکم چلانے لگی۔ میں نے اسے پہلے دیکھا نہیں تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کون ہو تم" اس نے تڑ سے جواب دیا "میں مردولا سارا بائی ہوں"۔ میں نے کہا کہ میں نے تو یہ نام کبھی نہیں سُنا اگر تم نے آئندہ اس قسم کی حرکت کی تو مجھ سے بڑا کوئی نہ ہوگا۔ اب چلتی پھرتی نظر آؤ۔ اس نے آنکھیں نکال کر میری طرف دیکھا اور چل گئی دوسرا قصہ بھی سن لیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ وزیراعظم (نہرو) جب بھی دورے پر جاتے ہیں تو مردولا سارا بائی صوبائی وزراء اعلیٰ اور چیف سیکرٹریوں کو ٹیلی فون پر ہدایات جاری کرتی ہے کہ وزیراعظم کے تحفظ کے لئے کیا کیا جائے انہیں کھانے میں کیا دیا جائے وغیرہ۔ میں نے فوراً تمام وزراء اعلیٰ اور چیف سیکرٹریوں کو گشتی مراسلہ بھیجا کہ مردولا سارا بائی کی اس نوع کی مداخلت بلا اختیار ہوتی ہے اور آئندہ اس کی طرح کی ہدایات کو نظر انداز کر دیا جائے۔ میں نے مردولا کو بھی اس سے آگاہ کر دیا چنانچہ وہ بھی محتاط ہو گئی۔ مجھے جب بھی مردولا یاد آتی ہے تو میرے ذہن میں جرمنی کے آنجہانی چانسلر ایڈ نائر کا مقولہ میرے ذہن میں گردش کرنے لگتا ہے ان کا کہنا تھا "اللہ تعالے نے عورتوں کی عقل تو محدود کر دی مگر وہ ان کی حماقت کو حدود و قیود کی گرفت میں لینا بھول گیا"

پدما جا نائیڈو :- پدما جا نائیڈو سروجنی نائیڈو کی دو بیٹیوں میں بڑی بیٹی تھی

وہ ۱۷ر نومبر ۱۹۰۰ء کی پیدائش تھی۔ اس کی آنکھیں نیم خوابی کا عالم لئے رہتی تھیں گو اس کے نقوش کسی حبشن سے مشابہ تھے۔ مگر وہ خود کو حور پری سمجھتی تھی اور خود کو لتھنا کے غار کی سیاہ شہزادی کی طرح بنا سنوار کر رکھتی تھی۔ وہ غلط فہمیوں کے بوجھ تلے اتنا دب چکی تھی کہ اب اسے یقین سا ہو گیا تھا کہ وہ حسن کی ساحرہ ہے اور جس کی طرف نظر اٹھا کے دیکھ لے وہ تیر نظر کا گھائل ہو جاتا ہے۔ اوائل عمر میں اسے یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ نواب سالار جنگ اس سے محبت کرتے ہیں اور وہ یہ سوچ سوچ کر خوش ہوتی رہتی تھی اور اگر نواب صاحب کبھی اور خاتون کو نظر بھر کر دیکھ لیتے تھے تو وہ غصہ سے پاگل ہو جاتی مگر جلد ہی نواب صاحب کی حد تک اس کی غلط فہمی دور ہو گئی۔

پدما جا سے میری پہلی ملاقات فروری ۱۹۴۶ء میں ہوئی تھی اس کا دیرہ تھا کہ وہ نہرو کے الہ آباد والے گھر میں اور بعد میں دہلی آ کر اکثر قیام کرتی اور اس کا قیام خاصا طویل بھی ہوتا اور وہ اصرار کرتی اسے نہرو کی خواب گاہ سے ملحقہ کمرہ ہی دیا جائے اس کے سینے کے ابھار بڑے بڑے تھے اور وہ کھلے گلے کا بلاؤز پہننے کی عادی تھی اور مردوں کی موجودگی میں اسے ساڑھی کا پلو گرانے میں نہ صرف تامل تھا۔ جب وہ ایوان وزیر اعظم میں قیام پذیر ہوتی تو اپنے کمرے کو طرح طرح کی خوشبوؤں سے معطر رکھتی۔ میں نے اسے کبھی خوبصورت نہیں سمجھا مگر پسند اپنی اپنی خیال اپنا اپنا۔

پدما جا اکثر نومبر کے پہلے ہفتے میں حیدرآباد سے نہرو کے ہاں "آدھمکتی تاکہ ۱۴ر نومبر کو نہرو کی، ۱۷ر نومبر کو اپنی اور ۱۹ر نومبر کو اندرا کی سالگرہ منا سکے۔ اندرا کو پدما جا کا یوں منہ اٹھائے چلے آنا پسند نہ تھا۔ نہ ہی وہ اپنے ہاں اس کے طویل قیام کو پسند کرتی تھی مگر وہ بے بس تھی ایک دن اندرا میرے پاس آئی اور کہنے لگی "مجھے یوم جمہوریہ، یوم آزادی اور اسی نوع کی تقریبات میں پتاجی کے ساتھ پدما جا کا ایک ہی کار میں جانا پسند نہیں۔ تم اس کے لئے کچھ کرو۔" میں نے اندرا سے کہا "تم اپنے پتاجی کے ساتھ تقریبات میں جانا ترک کر دو

بلکہ اپنے دونوں بچوں کو نانا ابو کے ساتھ بھیج دیا کرو اور خود پدما جا کے ساتھ دوسری کار میں چلی جایا کرو۔" اندرا نے ایسا ہی کیا۔ مگر پدما جی کو یہ طریقہ بڑا ناگوار گزرا کیونکہ وہ نہرو اور اپنے تعلقات کے بارے میں گمراہ کن تاثر دینا چاہتی تھی۔

۱۹۴۷ء کے موسم سرما میں نہرو نے لکھنؤ کے دورے کا پروگرام بنایا۔ پدما جا کی والدہ سروجنی نائیڈو یوپی کی گورنر تھی۔ اس نے اپنے قریبی حلقوں میں یہ خبر عام کر دی کہ نہرو لکھنؤ کے دورے کے موقع پر پدما جا سے شادی کی بات چھیڑیں گے۔ پدما جا بھی بالکل تیار بیٹھی تھی مگر ہوا یہ کہ نہرو لیڈی ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ لکھنؤ پہنچ گئے پدما جا پر غصے کا دورہ پڑ گیا اس نے خود کو کمرے میں بند کر لیا اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن سے ملنے سے بھی انکار کر دیا۔ ۱۹۴۸ء میں پدما جا حیدرآباد سے آئین ساز اسمبلی کی رکن منتخب ہو گئی۔ اس کے فوراً بعد وہ ایران وزیر اعظم میں آنا نازل ہوئی۔ اور اپنے "مورچے" پر قبضہ جما لیا۔ وہ ارکان اسمبلی کے لئے حکومت کی فراہم کردہ رہائشی سہولتوں سے فائدہ اٹھانے حق میں معلوم نہیں ہوتی تھی اور اس کا قیام بھی ضرورت سے زیادہ ہی طویل ہوتا۔ مگر یہ مسئلہ حل کر لیا گیا اسے بتایا گیا کہ لیڈی ماؤنٹ بیٹن مشرق کو جاتے ہوئے اور پھر واپسی پر ایوان وزیر اعظم میں قیام کریں گی یعنی تم کمرہ خالی کر دو۔ پدما جا بہت بھنائی مگر وہ ولنگڈن کورٹ میں منتقل ہو گئی جہاں اس کی بہن لیلامنی نائیڈو بھی مقیم تھی۔ وہ وزارت خارجہ میں ملازم تھی۔

لیڈی ماؤنٹ بیٹن کی آمد کے بعد پدما جا نے اندرا کو بلایا اور اسے کہا "میں وہ تمام خطوط جو مجھے نہرو جی نے لکھے ہیں جلد ہی تمہیں دے رہی ہوں اور اس کے بعد میں خودکشی کر لوں گی۔" اندرا نے واپس پر مجھے بتایا۔ میں نے اندرا سے کہا کہ تم پدما جا سے کہو کہ تمام خط سرہانے میں بند کر کے دے اور میں انہیں اسی طرح پتاجی تک پہنچا دوں گی اس کے بعد میں نے قہقہہ لگایا۔ میں نے اندرا کو ٹراونکور میں اپنی ایک پڑوسن کا قصہ سنایا۔ وہ نوجوان شادی شدہ عورت تھی مگر اپنے شوہر سے اس کا اکثر جھگڑا رہتا تھا۔ ایک روز جب زور کی

بارش ہو رہی تھی اور دریا میں سیلاب آیا ہوا تھا اس عورت نے اپنے شوہر سے کہا "میں تو دریا میں ڈوبنے جا رہی ہوں۔" پھر وہ چھتری لے کر گھر سے نکل گئی اس کا شوہر آرام سے گھر میں بیٹھا رہا۔ احمق عورت کا خیال تھا کہ شوہر اسے منانے آئے گا۔ جب ایسا نہ ہوا تو وہ گھر واپس آگئی اور شوہر کی نظر بچا کر کمرے میں چلی گئی۔ تب اس کا خاوند قہقہے لگانے لگا۔ اس نے عورت سے پوچھا "کیا کوئی شخص خودکشی کی پیشگی اطلاع دیا کرتا ہے اور جو گھر سے دریا میں ڈوبنے نکلے وہ بارش سے بچنے کے لئے چھتری لے کر جاتا ہے۔" میں نے اندرا سے کہا کہ اگر پدما جا اب خودکشی کی بات کرے تو اس کی حوصلہ افزائی کرنا۔

جب لیڈی ماؤنٹ بیٹن دلی آئی تو اس نے پدما جا کو پیغام بھیجا کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے اور اس کی رہائش گاہ پر آئے گی مگر پدما جا نے جو طیش کے عالم میں تھی لیڈی سے ملنے سے انکار کر دیا۔ لیڈی ماؤنٹ بیٹن سفر پر چلی گئی اور پھر واپس آگئی۔ ان دنوں پدما جا سے میری ملاقات ہوئی، اب وہ قدرے ہوش میں تھی اور باتوں کے علاوہ اس نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ "جواہر صرف ایک عورت کا دیوانہ نہیں ہے۔" میں نے دل میں سوچا کہ تمہیں اس نتیجے پر پہنچنے میں کافی دیر لگی ہے۔ کوئی ایک سال بعد پدما جا نے دیکھا کہ نہرو کی خوابگاہ میں لیڈی ماؤنٹ بیٹن کی دو تصاویر لگی ہیں۔ اس نے بھی با اصرار اپنی اشتعال انگیز تصویر نہرو کی خوابگاہ میں آتش دان پر رکھوائی۔ یہ تصویر اس انداز سے رکھی گئی کہ جب نہرو بستر پر دراز ہوں تو تصویر پر ان کی نظر پڑتی رہے۔ جونہی پدما جا دلی سے رخصت ہوئی نہرو نے اس تصویر کو بھی شو روم کی زینت بنا دیا۔

جب پنت وزیر داخلہ بنا تو اس نے پدما جا کو جسے وہ کافی عرصہ سے اور اچھی طرح جانتا تھا مغربی بنگال کا گورنر بنا کر بھیجنا چاہا۔ اس نے وزیر اعلیٰ بی۔ سی۔ رائے سے بھی مشورہ کیا جو پدما جا کا ذاتی دوست تھا۔ رائے نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا پنت نے یہ معاملہ وزیر اعظم سے اٹھایا اور پدما جا گورنر مقرر ہو گئی۔ اس کے فوراً بعد مجھے نہرو کی چھوٹی ہمشیرہ کرشنا تھی

سنگھ نے عجیب و غریب خط لکھا اس نے پوچھا "کیا پدما جا کو اس کی خدمات کے عوض گورنر بنایا گیا ہے؟" میں اسے جواب دینا چاہتا تھا کہ یہ سب کام پنت جی نے کیا ہے مگر مجھے نہرو کی یہ نصیحت یاد آگئی کہ کرشنا ہتھی سنگھ سے جہاں تک ممکن ہو خط و کتابت نہ کی جائے۔ پدما جا نے گورنر کی حیثیت سے عمدہ کام کیا۔ رائے کے بعد پی سی سین وزیر اعلیٰ بنے پدما جا اچھی گورنر ثابت ہوئی اور وہ دس سال سے زائد عرصہ اس عہدے پر فائز رہی۔ وہ لاٹ صاحب بن کر کام کرنے میں فرحت محسوس کرتی تھی۔ نہرو کے انتقال کے بعد وہ گورنر کے عہدے سے ریٹائر ہو گئی۔

شاردھا ماتا ــــ فرضی نام :- ۱۹۴۸ء کے موسم خزاں میں بنارس سے ایک نوجوان سنیاسن دہلی آئی اس کا نام شاردھا ماتا تھا۔ وہ سنسکرت زبان کی فاضلہ تھی اور ہندو دیو مالا اور قدیم مذہبی کتب پر اسے عبور حاصل تھا۔ ارکان پارلیمنٹ سمیت عام لوگ اس کا بھاشن سننے کے لئے اسے گھیرے رہتے تھے۔ ایک دن نہرو کا پرانا ملازم اپادھیہ شاردھا ماتا کا خط نہرو جی کے نام لایا۔ یہ خط ہندی میں لکھا ہوا تھا۔ اپادھیہ نے سنیاسن کی بے حد تعریف کی نہرو نے سنیاسن کو ملاقات کا وقت دے دیا۔ جب وہ ملاقات کے بعد ایوان وزیر اعظم سے رخصت ہوئی تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک نوجوان طرحدار عورت ہے۔ اب نہرو اس سے بکثرت ملنے لگے اور اکثر ملاقاتیں رات کے اس حصے میں ہوتیں جب نہرو اپنے کام سے فارغ ہوتے تھے۔ ایک دفعہ نہرو لکھنؤ کے دورے پر گئے۔ شاردھا ماتا بھی وہاں پہنچ گئی اس نے اپادھیا کے ساتھ نہرو کو خط بھجوایا۔ نہرو نے نصف شب کے بعد اس سے ملاقات کی۔ اس وقت پدما جا جنونی کیفیت سے دوچار تھی۔

مجھے اس معاملے میں اپادھیہ کی دلچسپی ناپسند تھی۔ میں نے اس سے بات کی اور کہا کہ میں شاردھا ماتا کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا ہوں مگر اپادھیہ تو جنم جنم کا احمق تھا۔ اس نے نہایت یقین کے ساتھ مجھے کہا "شاردھا ماتا دیوی ہے دیوی۔"

اور شاردھا ماتا اچانک غائب ہوگئی۔ پھر اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔ نومبر ۱۹۴۹ء کی بات ہے بنگلور میں واقع ایک مسیحی مشنری ادارے سے ایک خوبرو شخص ڈھیر سارے خطوط لے کر وہاں پہنچا۔ اس نے بتایا کہ چند ماہ قبل شمالی ہند کی ایک نوجوان عورت اس کے ادارے میں آئی۔ اس نے لڑکے کو جنم دیا۔ اس نے نہ تو اپنا نام بتایا اور نہ ہی اپنی شناخت کرائی۔ جونہی وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوئی وہ اپنے بیٹے کو ادارے میں ہی چھوڑ کر غائب ہوگئی مگر جاتے وقت وہ ایک تھیلا وہاں بھول گئی جو ہندی میں لکھے ہوئے خطوط سے بھرا ہوا تھا۔ ادارے کی سربراہ نے جو ایک غیر ملکی خاتون ہے یہ خطوط کسی سے پڑھوائے تو معلوم ہوا کہ یہ وزیراعظم کے تحریر کردہ ہیں۔ اس شخص نے خط تو دیدیئے مگر اپنا نام پتہ یا ادارے کا نام بتانے سے انکار کر دیا۔ نہرو کو جب ان باتوں سے مطلع کیا گیا تو انہوں نے تمام خطوط کے ٹکڑے پرزے کر دیئے۔ اس وقت نہرو کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔ انہوں نے اس وقت یا بعد میں اس بچے میں کسی دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ اس پر مجھے سبھاش چندر بوس کا رویہ یاد آگیا۔ مجھے نمبیار نے جو سبھاش کے ساتھ رہا کرتا تھا بتایا کہ جرمنی میں قیام کے دوران آسٹریا کی ایک لڑکی جو دفتر میں کام کرتی تھی سبھاش سے تعلقات کے سبب اس لڑکی کا پاؤں بھاری ہوگیا۔ پہلے تو سبھاش نے اسقاط کرانے کی کوشش کی مگر زیادہ وقت گزر جانے کے باعث ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ سبھاش اس لڑکی سے شادی بھی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے تو اپنا سیاسی مستقبل زیادہ عزیز تھا۔ بالآخر وہ جاپانیوں کی ایک آبدوز میں بیٹھ کر جاپان چلا گیا۔ ظاہر ہے اس طرح کے معاملات کے نتائج کی ذمہ داری قبول کر کے کوئی سیاست دان اپنا مستقبل داؤ پر نہیں لگا سکتا۔

شاردھا ماتا شمالی ہند لوٹ آئی تھی۔ سنیاسیوں والا لباس اتار پھینکا تھا۔ مجھے اس کے متعلق جو آخری اطلاع ملی وہ یہ تھی کہ وہ جے پور میں مقیم ہے اور خوب لپ سٹک لگانے، بال کٹوانے اور فیشن کرکے رہتی ہے۔ اس کے بعد اس نے کبھی نہرو سے ملنے کی کوشش نہ کی۔ میں نے اس

لڑکے کے بارے میں متعدد بار تحقیقات کی۔ مگر اس کا اتہ پتہ معلوم کرنے میں ناکام رہا۔ مشنری ادارے ایسے معاملے میں مہر بلب رہتے ہیں اگر میں اس لڑکے کو ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو جاتا تو اسے اپنا متبنیٰ بنا لیتا۔ وہ یقیناً کیتھولک عیسائی کی حیثیت سے پل رہا ہوگا اور اس حقیقت سے بے خبر کہ وہ کس باپ کی اولاد ہے۔

مجھے جب کبھی اس بچے کی یاد آتی ہے۔ تو نپولین کے بیٹے کی داستان بھی میرے ذہن میں آجاتی ہے جو لیڈی میری ویلیسکا کے بطن سے تھا۔ نپولین کو اپنے بیٹے کا علم اس وقت ہوا جب برطانوی حکام کے ایماء پر لیڈی میری جزیرہ ایلبا میں نپولین سے ملنے گئی جہاں وہ قید تھا۔ جب وہ ملاقات کے بعد جزیرہ سے روانہ ہونے لگی تو نپولین نے اپنے بیٹے کو بوسہ دیا اور سینے سے لگایا۔ پھر اس نے اپنی تلوار اپنے بیٹے کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا۔

"پیارے بیٹے یہ وہ تلوار ہے جس سے میں نے ۲۷ سال کی عمر میں اٹلی کو فتح کیا تھا۔"

میری نے نپولین سے کہا "اپنی تلوار واپس لے لو۔ دنیا میں نام کمانے کے تلوار کے سوا اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔" اور لیڈی میری کی یہ بات سچ ہو کر رہی جب اس کا بیٹا الیگزینڈر فلورین جوزف، ویلیسکا (۱۸۱۰ تا ۱۸۶۸) فرانس میں نواب کے لقب سے ممتاز ہوا۔ اس نے فلورنس، نیپلز اور لندن میں فرانس کے سفیر کے فرائض انجام دیئے اور بالآخر اسے ملک کا وزیر خارجہ مقرر کیا گیا۔ پھر وہ تین سال تک وزیر مملکت رہا۔ اس کے بعد سینٹ کا رکن منتخب ہوگیا اور بالآخر اسے مجلس قانون ساز کا صدر بنا دیا گیا۔ وہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو فوت ہوا۔ اس وقت بھی وہ سینٹ کا رکن تھا۔

کیا اگر نہرو کا بیٹا گمنام نہ ہوتا اور ذہین ہوتا تو اس کے ساتھ بھی ایسے ہی واقعات پیش آتے؟ ماضی کی بعض عظیم ہستیاں حرامی تھیں۔ کنفیوشس اور لیونارڈو ڈاونچی اس کی دو بہترین مثالیں ہیں اور موجودہ زمانے میں بھی رمزے میکڈانلڈ اور ولی برانٹ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

لیڈی ایڈوینا ماؤنٹ بیٹن:۔ آزادی کے بعد نہرو کی زندگی میں جتنی بھی عورتیں

داخل ہوئیں ان میں لیڈی ایڈوانا ماؤنٹ بیٹن کو سب سے اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ وہ ایک غیر معمولی خاتون تھی جس میں بلا کی اعصابی قوت تھی اور وہ انسانی ہمدردی کے جذبے سے مالا مال تھی۔ تقسیم ملک کے دنوں میں اس نے لٹے پٹے شرنارتھیوں کی مدد کرنے اور مسلمانوں کی دلجوئی کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس نے سماجی کام کرنے والے اداروں میں اتحاد اور اشتراک عمل پیدا کیا۔ وہ بیشتر وقت ہسپتالوں اور پناہ گزینوں کے کیمپوں کا معائنہ کرتے ہوئے گزارتی وہ غلیظ گلیوں اور جھونپڑیوں میں جانے سے نہ کتراتی۔ گاندھی جی اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اسے "رحم کی دیوی" قرار دے دیا۔

بھارت چھوڑنے سے قبل لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں اسے باقاعدگی سے خط لکھوں گا۔ لیکن میرے خط لکھنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ کیونکہ نہرو نے اسے خود اپنے ہاتھ سے خط لکھنا شروع کر دیئے تھے۔ ان خطوط پر نمبر شمار تحریر کئے جاتے تھے تاکہ اگر کوئی خط گم ہو جائے تو پتہ چل سکے میرے دفتر میں ایک ایسا معاون تھا جو خفیہ خطوط کی آمد اور ترسیل کا انتظام سنبھالتا تھا۔ شروع شروع میں تو میں ہی وہ تمام خطوط کھولا کرتا تھا جن پر ذاتی یا خفیہ لکھا ہوتا تھا۔ مگر جلد ہی خفیہ نوعیت کی ڈاک میں اتنا اضافہ ہو گیا کہ یہ کام میرے بس کا نہ رہا۔ چنانچہ میں نے اس معاون کو جس کا انتخاب بڑی احتیاط سے کیا گیا تھا یہ کام سونپ دیا۔ تاہم میں نے یہ ہدایت کی کہ وزیر اعظم کے جن خطوط پر "ان کے لئے" کے الفاظ تحریر ہوں وہ نہ کھولے جائیں تاکہ انہیں اسی طرح نہرو کی خدمت میں پیش کیا جا سکے۔ شروع شروع میں "ان کے لئے" کے الفاظ اندرا نہرو کی دونوں بہنیں اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن ہی اپنے خطوط پر استعمال کرتی تھیں، مگر رفتہ رفتہ اس عبارت کا علم لوگوں کو ہو گیا اور بہت سے لوگوں نے یہ الفاظ استعمال کرنے شروع کر دیئے۔ پھر میں اس طرح کے "عام" خطوط بھی خود کھولنے لگا۔ ایک روز میرے معاون نے لیڈی ماؤنٹ بیٹن کا خط کھول لیا۔ وہ گھبرا گیا اور خط میرے پاس لے آیا۔ میں نے اسے تسلی دی اور خط نہرو کو بھجوا دیا۔ اس کے ساتھ ایک ذاتی نوٹ بھی

لکھ دیا جس میں ان حالات کی وضاحت کی گئی تھی جن میں یہ خط کھولا گیا اور ساتھ ہی یہ یقین دہانی بھی کرائی گئی تھی کہ آئندہ اس غلطی کا اعادہ نہیں ہوگا نہرو اس پر ناراض ہوئے ان کی ناراضگی بے جا نہ تھی۔ میں اب تک یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ لیڈی ماؤنٹ بیٹن کی عمر کی کوئی عورت جذبات جوانی سے بھرپور خط کیونکر لکھا کرتی تھی۔ خط لکھنے کے واقعہ کے بعد لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے یہ طریق کار اپنایا کہ وہ خط ایک لفافے میں بند کر کے اوپر نہرو کا پتہ درج کرتی اور پھر اس لفافے کو ایک اور لفافے میں بند کر کے میرے نام بھیج دیا کرتی تھی لیڈی ماؤنٹ بیٹن کو اوائل عمر میں ہی جلد کی خرابی کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ میں کئی بار اس کے اور نہرو کے ساتھ ایران صدر کے پیراکی کے تالاب پر گیا۔ جہاں میں نے لیڈی ماؤنٹ بیٹن کو پیراکی کے برائے نام لباس میں دیکھا۔ اس کا بدن خوبصورت نہیں تھا۔ البتہ اس کا چہرہ پرکشش ضرور تھا سینٹ جان ایمبولینس بریگیڈ کی سربراہ کی حیثیت میں لیڈی ماؤنٹ بیٹن ہر سال جنوب مشرقی ایشیا کا دورہ کرتی اور آتے جاتے دہلی میں کئی کئی دن قیام کرتی۔ اور تو کچھ نہیں مگر میں ایک چیز نوٹ کئے بغیر نہ رہ سکا کہ نہرو جب بھی لیڈی ماؤنٹ بیٹن کے پاس کھڑے ہوتے یوں محسوس ہوتا جیسے ان میں فتح مندی کا جذبہ ابھر آیا ہے۔

حیدر آباد کو بھارت میں ضم کئے جانے کے بعد ایم کے وللودی وہاں کا وزیر اعلیٰ مقرر ہوا ان دنوں حیدر آباد کے چند معزز افراد نے نہرو سے درخواست کی کہ وہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے نظام کے دوسرے بیٹے کی ترک بیوی نیلوفر کا مالی مسئلہ حل کرا دیں۔ نیلوفر شہزادہ سے طلاق لے چکی تھی اور ان دنوں پیرس میں مقیم تھی نہرو نے وللودی کو لکھا کہ وہ نظام کو یہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے کرنے کی ترغیب دے۔ نظام نے جو اپنے دونوں بیٹوں سے ہی خوش نہ تھے یہ مسئلہ حل کر دیا اس پر لوگ باتیں بنانے لگے اور یہ افواہ کہ نہرو نیلوفر میں ذاتی دلچسپی رکھتے ہیں، حیدر آباد سے دہلی تک پھیل گئی۔ انہی دنوں ٹاٹا کے ایک ڈائریکٹر نے نہرو کو بتایا کہ نیلوفر ذاتی طور پر ان کا شکریہ ادا کرنے کے لئے دہلی آنے کو بے چین ہے۔ اس ڈائریکٹر

نے بات یہاں تک بڑھا دی کہ نیلوفر کو ایوانِ وزیراعظم میں ہی ٹھہرا لیا جائے۔ نہرو نے کہہ دیا کہ وہ نیلوفر کا خیر مقدم کریں گے۔ اس کے بعد نہرو نے اندرا کو نیلوفر کی متوقع آمد سے مطلع کیا اور کہا کہ اسے ذاتی مہمان کی حیثیت سے ایوان وزیراعظم میں ہی ٹھہرایا جائے۔ اندرا پس منظر سے واقف تھی وہ پریشان ہو کر میرے پاس آئی اور کہا کہ اس سلسلے میں کچھ کیا جائے۔ میں نے اس معاملہ میں دخل دینے سے اظہار معذوری کیا مگر اندرا نے اپنی بات پر اصرار کرتے ہوئے دلیل دی کہ ایسا کرنا خود نہرو جی کے مفاد میں ہے۔ میں نے ٹاٹا کے اس ڈائریکٹر کو بلا کر کہا کہ نیلوفر کے مجوزہ دورے سے وزیراعظم کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ چونکہ وزیراعظم نے ذاتی طور پر اسے نوازا ہے لہذا اس کی دہلی میں آمد نامناسب ہوگی۔ اس لئے نیلوفر کا یہ دورہ منسوخ کرا دیا جائے۔ وزیراعظم تین ہفتے بعد لندن جا رہے ہیں نیلوفر انہیں پیرس کے ہوائی اڈے پر مل سکتی ہے۔ میں نے بھی نیلوفر کو آرلی کے ہوائی اڈے پر دیکھا وہ میرے اندازے سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی۔ بعض اوقات نہرو کو خود اپنی ذات اور ان کے نام نہاد دوستوں سے بھی بچانا پڑتا تھا۔ ٹاٹا کے ڈائریکٹر نے جو حرکت کی تھی اس سے مجھے والٹیئر کا ایک قول یاد آیا "اے خدا تو مجھے میرے دوستوں سے بچا، اپنے دشمنوں سے میں خود نمٹ لوں گا۔"

آخری عورت جس نے نہرو کی زندگی میں دخیل ہونے کی کوشش کی شمالی ہند کی ایک "شہزادی" تھی۔ اس کی شادی پندرہ سال کی عمر میں ہوئی۔ جب اسے شادی کے تقاضوں کا بھی علم نہیں تھا مگر ہوش آتے آتے جب وہ ۲۲ سال کی ہوئی تو چار بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ اب اسے اپنے شوہر کی حرکتوں کا شعور ہوا۔ اس کی کئی داشتائیں تھیں۔ اگرچہ شہزادی نے اس سے طلاق تو نہ لی مگر وہ عملی طور پر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے لیکن دنیا کی نظر میں وہ میاں بیوی تھے۔ لیڈی ماؤنٹ بیٹن کی موت سے دو سال قبل اس شہزادی کو غلط طور پر یہ غلط فہمی ہو گئی کہ وہ نہرو سے پیار کرتی ہے۔ حالانکہ نہرو سے اس کی ملاقات کبھی کبھار ہی ہوتی تھی۔ جب نہرو کا انتقال ہوا تو اس نے باقاعدہ سوگ منایا۔ یہ ایک دیدنی منظر تھا۔ نہرو کے

انتقال کے چند سال بعد اس کا شوہر بھی چل بسا۔ جلد ہی اس نے ایک اور شخص سے شادی رچالی جس کا تعلق مغربی ہند سے تھا۔ یہ شخص خود کو مصنف اور سیاسی مفکر کہلانا پسند کرتا ہے۔

رمزے میکڈانلڈ جو کئی سال برطانیہ کا وزیراعظم رہا ہے خود حرامی تھا۔ اس کے کئی عورتوں سے تعلقات تھے۔ جن کے بطن سے متعدد حرامی بچے پیدا ہوئے۔ دور کیوں جائیں کرشن مہاراج کی سولہ ہزار آٹھ گوپیاں تھیں۔ مگر اتنی ڈھیر ساری عورتوں سے تعلق کی بنا پر کرشن مہاراج یا ان کی منظورِ نظر رادھا کی شہرت پر کوئی بڑا اثر نہیں پڑا۔ اس کے برعکس ہندو شاعری اور مصوری ان کے قصائد اور تصاویر سے بھری پڑی ہے یہ تو ہندوؤں کی بنیادی روایت ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس معاملہ میں ہندوؤں میں شرم و حیا کم ہی دیکھنے میں آئی ہے۔

باب ۳۸

نہرو اور سوشلسٹ

یہ بات تو اب تاریخ کا جزو بن چکی ہے کہ جون ۱۹۳۶ء میں جب نہرو کو لکھنؤ کے اجلاس میں کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا تو پٹیل، راجندر پرشاد، راج گوپال اچاری۔ جے۔بی۔کرپلانی، جے رامداس دولت رام۔ جمنا لال بجاج اور شنکر راؤ دیو نے کانگریس کی ورکنگ کمیٹی سے استعفادے دیا تھا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ نہرو سوشلزم کا پرچار کرتے ہیں۔ انہوں نے ورکنگ کمیٹی میں بھی بہت سے سوشلسٹوں کو شامل کر لیا ہے اور ان کا یہ اقدام اس وقت تحریک آزادی کے لئے نقصان کا موجب ہو سکتا ہے اگرچہ گاندھی جی کی مداخلت پر ان لوگوں نے استعفا واپس لے لیا۔ تاہم ان کے اور نہرو کے درمیان کھٹ پٹ ساری عمر جاری رہی۔ سوشلسٹوں نے بھی اس صورت حال کو سنبھالنے میں کوئی امداد نہ کی۔ ان کا عام خیال تھا کہ پرانے لوگ فرسودہ نظریات کے حامل ہیں۔ وہ ملک کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ اس لئے انہیں ان کے موجودہ مقام سے ہٹا دینا چاہیئے۔ سوشلسٹوں کو یہ بھی احساس تھا کہ نہرو ان کی پوری طرح مدد نہیں کر رہے نہرو نے عدم جانبداری کا جو نظریہ پیش کیا تھا تحریک آزادی میں دائیں اور بائیں بازو کی کش مکش کے باعث صدی کی دہائی کے آخر تک وہ صحیح طور پر متشکل نہ ہو سکا۔

۱۹۴۶ء کے اوائل میں آزاد نے دوبارہ گاندھی جی کے سامنے سفید جھوٹ بولا۔ اس سے گاندھی جی سخت بددل ہوئے اور وہ آزاد کی جگہ کسی اور کو کانگریس کا صدر بنانے کی فکر میں تھے۔ وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ ملک آزاد ہونے والا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے جانشین نہرو کو ہی

کانگریس کی صدارت پر متمکن دیکھنا چاہتے تھے۔ گاندھی نے اچاریہ کرپلانی سے نہرو کا نام صدارت کے لئے پیش کرنے کو کہا۔ اس طرح نہرو ۹ مئی ۱۹۴۶ء کو تیسری بار کانگریس کے صدر منتخب ہو گئے۔

گاندھی جی نے نہرو سے کہا کہ اب وہ اپنی مرضی کی ورکنگ کمیٹی منتخب کریں۔ گاندھی نے یہاں تک کہا کہ پرانے لوگوں میں راجندر پرشاد، پٹیل اور دوسروں کو ورکنگ کمیٹی میں شامل نہ کیا جائے۔ گاندھی جی نے نہرو کو وچن دیا کہ ان لوگوں میں کوئی نہرو کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی نہیں کرے گا۔ نہرو نے گاندھی جی کے مشورے پر عمل تو نہ کیا مگر انہوں نے جے پرکاش نرائن سمیت متعدد سوشلسٹوں کو ورکنگ کمیٹی میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ جے پرکاش نرائن سوشلسٹوں کا ترجمان تھا۔ اس گروہ کا خیال تھا کہ انگریز ہندوستان کو چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ وہ انگریزی استعمار پر آخری ضرب لگانے کیلئے لوگوں کو تیار کرنے کے حق میں تھے۔ چنانچہ سوشلسٹوں نے کانگریس میں شمولیت سے انکار کر دیا۔

۱۹۴۶ء میں جب آئین ساز اسمبلی قائم ہوئی تو نہرو نے ایک بار پھر سوشلسٹوں کو کانگریس اور آئین ساز اسمبلی میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ ان کا ادعا یہ تھا کہ بعد میں ان لوگوں کو حکومت میں بھی شریک کر لیا جائے گا مگر جے پرکاش نرائن اور ان کے ہمنوا برطانوی استعمار پر آخری ضرب کی پرانی راگنی الاپتے رہے۔ اگرچہ نہرو نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا مگر ان کو توقع تھی کہ جے پرکاش نرائن اپنی قابلیت کی بدولت بالآخر ان کی جگہ ملک کا وزیر اعظم بن جائے گا۔ اگر جے پرکاش نرائن نے تحمل سے کام لیتے ہوئے نہرو کی پیش کش منظور کر لی ہوتی تو نہرو اس کی تربیت کے بعد ۱۹۶۲ء میں وزارت عظمےٰ سے الگ ہو جاتے۔

سردار پٹیل کی موت کے بعد نہرو نے جے پرکاش نرائن اور دوسرے سوشلسٹوں کو حکومت میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ کملا دیوی چٹوپادھیا نے جو دل سے چاہتی تھیں کہ جے پرکاش نرائن نہرو جی سے مل کر حکومت میں کام کرے۔ جے پی سے میری ملاقات کا اہتمام کیا۔ یہ ملاقات بھی کملا دیوی کے مکان پر رات کے کھانے کے بعد ہوئی جے پرکاش نے مجھے بتایا کہ اس نے نہرو جی

سے بات چیت کے لیے چودہ نکات تیار کیے ہیں۔ میں نے یہ نکات دیکھے تو ششدر رہ گیا۔ ان میں سے بیشتر تو مارکس کے ان نظریات پر مشتمل تھے جو صرف کتابوں میں درج ہیں۔ میں جے پرکاش کے ساتھ طویل بحث میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اس کے صرف ایک نکتہ ——— معاوضہ ادا کئے بغیر صنعتوں کو قومی تحویل میں لینا ——— پر بات کی۔ میں نے اسے ٹاٹا آئرن وسٹیل کمپنی کا حوالہ دیا تو وہ فوراً بولا: "ان لوگوں نے کمپنی کی قیمت سے کئی گنا منافع کما لیا ہے۔" میں نے تجویز پیش کی کہ جے پرکاش اپنے دوست منوشانی سے یہ معلوم کریں کہ ٹاٹا کمپنی کے کتنے حصص بیواؤں اور یتیموں کے پاس ہیں اور ان لوگوں نے کئی کئی سال قبل یہ حصص کس بھاؤ خریدے تھے۔ میں نے اسے بتایا کہ ٹاٹا کمپنی کا ۵۰ روپے کا حصہ کئی سال قبل تین سو روپے میں فروخت ہو رہا تھا اگر کمپنی کو معاوضہ ادا کئے بغیر قومی تحویل میں لے لیا جائے تو اس سے کتنی بیواؤں یتیموں اور چھوٹے چھوٹے لوگوں کا نقصان ہو گا۔ ان کا قصور کیا ہے اس کا جے پرکاش کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ جے پی سے میری دوسری ملاقات بھی اسی جگہ ہوئی۔ تاہم میں بے دلی سے اس میں شریک ہوا۔ میں نے کملا دیوی کو بتا دیا کہ نہرو اور جے پی کی ملاقات کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو گا۔ اور پھر ہُوا بھی یہی۔ مجھے اس کا افسوس بھی ہوا کیونکہ میں جے پرکاش نرائن کو ایک اچھا انسان اور نہرو کا صحیح جانشین سمجھتا تھا۔ میرا اندازہ نہیں تھا کہ نہرو کا جانشین لال بہادر شاستری جیسا کوئی کم مایہ شخص ہو گا جس پر ایسی پستی کا مقولہ صادق آئے گا۔ اس کے بعد جے پی نہرو سے دور ہوتے چلے گئے اور بالآخر وہ کبھی نیپال کے پنچایتی راج، کبھی پاکستان کی بنیادی جمہوریت، بھودان تحریک، غیر جماعتی جمہوریت اور کبھی سرودھیا تحریک کی طرف مائل پائے گئے۔ اب وہ مکمل انقلاب کے پرچارک ہیں۔ کیسا انقلاب؟ لوگ اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔

ایک مرتبہ میں نے مختلف اقسام کے "دان" (تحفہ) کو سمجھنے کی کوشش کی۔ میں نے دیکھا کہ "دان" اَن گنت ہیں۔ بھودان، اگرام دان، شرم دان، بودھی دان اور جیون دان مگر مجھے کوئی "دان" بھی نہ بھایا۔ میرا خیال ہے کہ یہ تمام "دان" گاندھی جی کے "ٹرسٹ سازی" کے نظریہ

کا حصہ ہیں۔

جب تقسیم ملک کے اثرات ذرا کم ہوئے اور پٹیل کا انتقال ہو گیا تو نہرو کو سوشلزم پر سنجیدگی سے سوچنے کا موقع ملا۔ چنانچہ آوادی میں کانگریس کا جو سالانہ اجلاس ہوا اس میں مولانا ابوالکلام آزاد نے "سوشلسٹ معاشرہ" کے قیام کے بارے میں ایک قرارداد پیش کی جسے منظور کر لیا گیا۔ سوشلسٹ جن میں بعض تو واقعی ذہین لوگ ہیں مگر بیشتر بھوے خاں گپ باز اور بعض ژولیدہ خیالات رکھنے والے مسخرے ہیں، صورتِ حال کے غلط اندازوں کی وجہ سے کہیں کے نہ رہے اور مایوسی کے عالم میں جے پرکاش نرائن نے نہرو کو سوشلزم کی شاہراہ ترقی پر سب سے بڑی رکاوٹ قرار دے دیا۔ مگر اس رکاوٹ کے دور ہو جانے کے بعد میں نے جے پرکاش کی زبان سے سوشلزم کے بارے میں ایک لفظ نہیں سنا۔ نہرو بعض سوشلسٹوں کا ذاتی طور پر بڑا لحاظ کرتے تھے۔ اچاریہ کرپلانی کی طرح نہرو نے لوک سبھا کے ایک ضمنی انتخاب میں اس امر کا خاص اہتمام کیا کہ اشوک مہتہ کے خلاف کانگریس کا امیدوار کھڑا نہ کیا جائے۔

ایک مرتبہ جب پنت یوپی کا وزیراعلیٰ تھا، اس نے مجھے فون کیا اور پوچھا کہ کیا پنڈت جی یوپی اسمبلی کے ضمنی انتخاب کے سلسلے میں فیض آباد کا دورہ کر سکیں گے جہاں کانگریس کا مقابلہ ایک سوشلسٹ اچاریہ نریندر دیو سے تھا۔ میں نے پنت سے کہا کہ وہ خود وزیراعظم سے بات کرے مگر وہ رضامند نہ ہوا اور مجھ سے کہا کہ میں وزیراعظم سے بات کروں اور پھر اگلے روز پنت کو وزیراعظم کے عندیہ سے آگاہ کروں۔ میں نے نہرو سے اس کا ذکر کیا تو وہ ناراض ہو گئے۔ انہوں نے مجھ سے کہا "پنت جی سے کہہ دو کہ میں ضمنی انتخابات کی مہم نہیں چلایا کرتا اور اگر میں اپنے اصول کے خلاف فیض آباد چلا بھی جاؤں تو میں اس بے وقوف کی بجائے جسے کانگریس نے کھڑا کر رکھا ہے نریندر دیو کے حق میں کنویسنگ کروں گا۔" میں نے پنت جی کو اشارۃً بتا دیا کہ نہرو فیض آباد جانا نہیں چاہتے۔ پنت بھی سمجھ گیا۔ حال ہی میں ایک نام نہاد سوشلسٹ جارج فرنانڈس نے کہا ہے کہ نہرو بہت بڑے ریاکار تھے۔ مجھے شک ہے کہ فرنانڈس کو "ریاکار" کے معنوں کا بھی علم نہیں۔

اس قسم کا بیان دے کر اس نے نہرو کے لاکھوں پرستاروں کی نظروں میں اپنے آپ کو گرا لیا ہے۔ فرنانڈس تو نہرو کے بوٹ کے تسمے کھولنے کی خدمت کے قابل بھی نہیں۔ خیر کوئی بات نہیں امریکہ میں بھی ایسے پریشان ذہن مسخرے مل جاتے ہیں جو ابراھم لنکن کو "گندہ حرامی" قرار دیتے ہیں۔

باب ۳۹

نہرو، چین اور کشمیر

نہرو جب حکومت میں شامل ہوئے تو شروع میں انہیں "جدید سیاست" کا علم نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کشمیر میں رائے شماری کرانے کا اعلان کر دیا[1]۔ اس سے کوئی مقصد تو حاصل نہ ہوا۔ البتہ بھارت کے خلاف پاکستان کو ایک ہتھیار میسر آ گیا۔ پھر نہرو ہندوستان سے ملحقہ پرتگیزی اور فرانسیسی نوآبادیوں میں بھی رائے شماری کا اعلان کرتے پھرے۔ یہ اعلان بے موقع تھے۔ ہندوستان سے انگریزوں کے نکلنے پر کوئی رائے شماری نہیں ہوئی تھی اور پھر کیا اگر کشمیر میں رائے شماری کرائی جاتی تو بھارت جیت جاتا؟۔ نہرو صوبوں میں کانگریس کمیٹیاں قائم کرنے کے ذمہ دار تھے۔ انہوں نے مختلف زبانیں بولنے والے علاقوں کو سامنے رکھ کر کمیٹیاں قائم کیں۔ حتیٰ کہ زبانوں کے اعتبار سے مدراس میں چار کمیٹیاں قائم ہوئیں۔ دراصل نہرو روسی نظام سے بڑے متاثر تھے جہاں کاغذوں پر تو فیڈریشن کے کسی بھی یونٹ کو الگ ہونے

---

[1] نہرو نے کشمیر میں رائے شماری کا اعلان کسی ناواقفیت کی بنا پر نہیں کیا تھا وہ ایک کامیاب سیاست دان تھا۔ اس وقت پاکستانی مجاہدوں اور کچھ اقوام عالم کے دباؤ سے مجبور ہو کر اس نے رائے شماری کرانا مان لیا مگر بعد میں وہ صاف مکر گیا۔ مصنف محض نہرو کی "صفائی پیش کرنے" کی کوشش کر رہا ہے۔ (مترجم)

کی اجازت ہے مگر عملی طور پر اگر کوئی یونٹ ایسا کرنا چاہے تو اسے سختی سے کچل دیا جاتا ہے اور لوگوں کی بڑی تعداد کو سائبیریا منتقل ہونا پڑتا ہے ہم سب جانتے ہیں کہ چیکوسلاویکیہ میں کیا ہوا جو ایک خود مختار ملک ہے۔ جب وہاں کمیونسٹوں کے خلاف بغاوت ہوئی تو روس نے پوری قوت سے اسے کچل دیا۔ نہرو تو حیدرآباد دکن کو اس کے ثقافتی پس منظر کے اعتبار سے الگ حیثیت دینا چاہتے تھے ان کا یہ بھی عندیہ تھا کہ یوپی اور بہار کو تقسیم کرکے چھوٹے چھوٹے صوبے بنا دیئے جائیں جن کا انتظام و انصرام آسان ہو مگر پنت ان کے آڑے آئے۔ پنت کی واحد دلیل یہ تھی "گنگا اور جمنا کی سرزمین کو کیسے تقسیم کیا جاسکتا ہے" اور نہرو کو یہ خیال ترک کرنا پڑا۔

چین سے بھارت کی جھڑپوں سے پیشتر جب حالات مخدوش تھے۔ کرشنا مینن نے احمقانہ بیان دیا تھا: "ہم امریکی دفتر جنگ کو پوسٹ کارڈ نہیں بھیجیں گے"۔ لیکن ۱۹ نومبر ۶۲ء کو نہرو نے صدر کینیڈی کو ہنگامی طور پر تار ارسال کیا۔ جس میں چین کے خلاف امریکی فضائی امداد طلب کی گئی تھی چنانچہ امریکہ کا ایک طیارہ بردار جہاز نہرو کی درخواست کے مطابق خلیج بنگال روانہ کر دیا گیا۔ صدر کینیڈی کے نام نہرو کے اس تار کی نقل وزارتِ خارجہ یا وزیراعظم کے سیکرٹریٹ کے فائلوں میں نہیں رکھی گئی تھی بلکہ ان کاغذات میں موجود تھی جو میں نہرو کے گھر میں کئی سال سے جمع کر رہا تھا۔ لال بہادر شاستری جب وزیراعظم بنا تو وہ اس تار سے لاعلم تھا۔ اس نے پارلیمنٹ میں سدھیر گھوش کی کتاب "گاندھی کا سفیر" میں مصنف کے اس بیان کی تردید کی کہ نہرو نے امریکہ سے فضائی امداد طلب کی تھی۔ سدھیر گھوش نے لکھا تھا کہ "امریکی طیارہ بردار جہاز نہرو کی درخواست پر خلیج بنگال میں آیا تھا"۔ مگر لال بہادر نے پارلیمنٹ میں جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بولا تھا تاہم اس نے جو کچھ کیا وہ سچ بھی نہ تھا۔

پروفیسر جے۔ کے۔ گلبرتھ (بھارت میں امریکی سفیر) نے اپنی کتاب "ایمبسڈرز جرنل" میں لکھا ہے کہ "مجھے ایم جے ڈیسائی سیکرٹری وزارتِ خارجہ نے بتایا کہ چین کے گرد گھیرا ڈالنے کے

بارے میں بھارتی طرزِ فکر کیا ہے۔ بھارت اس مقصد کے لئے امریکہ سے سیاسی اور فوجی تعاون کے لئے تیار تھا۔ یہ بھارت کو ہماری امداد کا نتیجہ ہے اور امریکہ کی ایک اہم پیش قدمی۔ نہرو نے ایک ہفتہ قبل اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ وہ اس نہج پر سوچ رہے ہیں"۔

یہ جنوری ۶۳ء کا ذکر ہے انہی دنوں ڈیسائی کی مجھ سے ملاقات ہوئی اور اس نے جو کچھ گلبرتھ کو بتایا تھا اس کا مجھ سے بھی ذکر کیا۔ ڈیسائی نے یہ بھی کہا: "گلبرتھ کو میں نے جو کچھ بتایا ہے وہ نہ صرف وزیراعظم کے علم میں ہے بلکہ انہوں نے اس کی منظوری دی ہے"۔ چند دن بعد میری وزیراعظم سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے جب استفسار کیا تو انہوں نے ڈیسائی کے بیان کی تصدیق کر دی۔ جب گلبرتھ کی کتاب منظرِ عام پر آئی تو کانگریس کے بائیں بازو کے عناصر نے کتاب کے مندرجہ بالا پیراگراف کو چیلنج کیا۔ انہیں علم ہی نہ تھا کہ نہرو غیر جانبداری کو کوئی الہامی چیز نہیں سمجھتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شروع میں تو نہرو کو یہ لفظ ہی پسند نہ تھا مگر چونکہ اس مفہوم کا کوئی اور ایک لفظ نہ تھا اس لئے انہوں نے اس ناگوار لفظ کو گوارا کیا۔

میں نہرو کے دو غیر دانشمندانہ بیانات سے کبھی خود کو ہم آہنگ نہیں کرسکا۔ ۱۹۶۲ء میں نہرو امریکہ کے نوجوان صدر کینیڈی سے ملنے واشنگٹن گئے۔ صدر امریکہ سے بات چیت کے بعد ایک پریس کانفرنس میں ان سے پوچھا گیا "صدر امریکہ سے ان کی کیسی گزری"۔ دراصل امریکی اخبار نویس چاہتے تھے کہ نہرو ان کے صدر کی تعریف کریں کیونکہ وہ نہرو کا بڑا مداح تھا مگر بدقسمتی سے نہرو کے منہ سے یہ جواب نکلا "میں ہر قسم کے لوگوں سے نبھانا جانتا ہوں"۔ ان کا دوسرا بیان پارلیمنٹ میں دیا گیا تھا۔ جب یہ انکشاف ہوا کہ چین سے شاہراہ اقصائے چین بھارتی علاقہ سے گزاری ہے تو نہرو نے پارلیمنٹ میں کہا "تو کیا ہوا۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں گھاس کا ایک تنکا بھی نہیں اگتا"۔ مگر یہ بھول گئے کہ بحیرہ عرب کے ساتھ ساتھ پھیلے ہوئے صحرا میں بھی گھاس کا ایک تنکا نہیں اگتا۔ وہ بھارت کا علاقہ ہے اور اس

کے نیچے سیاہ سونا بہہ رہا ہے۔ کسی کو کیا پتہ کہ ہمالیہ کے ان دشوار گزار علاقوں میں کونسی دولت مدفون ہے۔

نہرو منتقم مزاج نہ تھے اور وہ لوگوں کا تعاقب کرنے پر یقین نہیں رکھتے تھے انہوں نے دو افراد پر سرِ عام نکتہ چینی کی ہے۔ ان میں سے ایک گوپی چند بھارگو تھا اور دوسرا دوارکا پرشاد مشرا۔ گوپی چند بھارگو کے بارے میں تو انہوں نے کہا تھا کہ "وہ سیاسی طور پر بد دیانت شخص ہے"۔ اور مشرا کے بارے میں انہوں نے صرف یہ کہا تھا۔ "میں مدھیہ پردیش کے لوگوں کو مشرا کی سرگرمیوں کے خلاف متنبہ کرنا چاہتا ہوں"۔ مگر نہرو کی موت کے بعد مشرا اور اندرا یوں شیر و شکر ہوئے جیسے دو چور باہم مل جاتے ہیں۔

باب ۴۰

گوبند۔ بلبھ۔ پنت

گوبند بلبھ پنت کا تعلق مہاراشٹر کے ایک برہمن خاندان سے تھا جو الموڑہ میں مہاراجہ کماؤں کی زیرِ پرستی آباد ہو گیا تھا۔ پنڈت پنت ایک کامیاب وکیل تھے اور انہوں نے قومی تحریک میں نمایاں کردار ادا کیا۔ آزادی کے بعد وہ یوپی کے وزیرِ اعلیٰ مقرر ہوئے اور ۱۹۵۵ء تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ اس کے بعد انہیں مرکز میں وزیر بنا دیا گیا۔ کیلاش ناتھ کٹجو انتہائی ناکام وزیرِ داخلہ ثابت ہوئے تھے۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۵۴ء میں نہرو کو میں نے تجویز پیش کی کہ پنت جی کو مرکز میں وزیرِ داخلہ مقرر کیا جائے۔ نہرو نے کسی قدر ترشروئی سے مجھے کہا "میں تو اسے کئی بار کہہ چکا ہوں مگر اس نے رسید ہی نہیں دی۔ اب میں اسے دوبارہ کہنے کے لئے تو تیار نہیں۔ تم چاہو تو کوشش کر دیکھو"۔ چنانچہ میں لکھنؤ روانہ ہو گیا۔ روانگی سے قبل میں نے نہرو سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ "اگر پنڈت پنت مان جائے تو مرکز میں وہ خزانہ، دفاع، امورِ داخلہ میں سے کوئی محکمہ لے سکتا ہے"۔ میں لکھنؤ پہنچا تو پنت جی مجھے نینی تال لے گئے جہاں ہم نے سکون سے گفتگو کی۔ پنڈت پنت مرکز میں وزیرِ داخلہ بننے پر رضامند ہو گئے اور ۱۰ جنوری ۵۵ء کو انہوں نے حلف اٹھا لیا۔

جب میں نینی تال سے واپس آیا تو لال بہادر بھاگا بھاگا مجھے ملنے آیا۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میرا مشن ناکام ہوا ہے یا کامیاب رہا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ پنت جی مرکز میں آنے پر رضامند ہو گئے ہیں تو لال بہادر کا منہ لٹک گیا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ وہ وزیرِ اعظم

کے لئے نہایت مفید ثابت ہوں گے تو لال بہادر بولا: "تمہیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑے گا"۔ دہلی آنے کے بعد وہ تقریباً ہر شام مجھ سے ملنے آتے۔ چنانچہ مجھے اپنے مطالعہ کے کمرے میں ایک چوڑی کرسی رکھوانا پڑی تاکہ پنت جو بہت موٹے تھے، آسانی سے بیٹھ سکیں۔ ایک روز پنت نے مجھ سے کہا کہ میں عام طیارے میں سفر کرتا ہوں تو موٹاپے کی وجہ سے مجھے سخت دقت ہوتی ہے کیونکہ عام طیاروں کی نشستیں تنگ ہیں۔ کیا اس سلسلے میں کچھ ہو سکتا ہے۔ میں نے وزیراعظم سے بات چیت کی اور پنت اور مولانا آزاد کے لئے فضائیہ کے طیارے استعمال کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ پنت یوں تو وزیر داخلہ تھے مگر وزیراعظم نے وزیر خزانہ کو ہدایت کی کہ وہ بجٹ تجاویز پر پہلے پنت سے تبادلہ خیال کر لیا کریں۔ وزیراعظم کی ملک سے عدم موجودگی میں وزارت خارجہ کے معاملات مولانا آزاد کو اور اقتصادی یا اندرونی امور سے متعلق معاملات پنڈت پنت کو پیش کئے جاتے تھے البتہ اہم امور پنڈت نہرو کو بذریعہ تار بھیج کر ان کا مشورہ طلب کیا جاتا تھا۔

صوبوں کی تنظیم نو کے کمیشن نے بمبئی شہر کو مہاراشٹر سے الگ کر دیا۔ اس پر سی ڈی دیش مکھ نے ۲۴ جولائی ۵۶ء کو کابینہ سے بطور احتجاج استعفا دے دیا۔ استعفا کے بعد دیش مکھ نے کھلے بندوں پنت پر بدعنوانی اور رشوت ستانی کا الزام لگایا اور للکار کر کہا کہ وہ عدالتی کمیشن کے روبرو گواہی دینے کو بھی تیار ہیں۔ دیش مکھ نے پنت کے خلاف اپنے الزامات کی تفصیلات بھی سرِعام کیں۔ اس پر نہرو کو بڑا رنج ہوا۔ انہوں نے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس ایس آر داس کو پنت کے خلاف الزامات کی تحقیقات کا حکم دے دیا۔ پنت نے ایک دن مجھ سے بات چیت کرتے ہوئے اس بات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا کہ قومی خدمت کے آخری دنوں میں ایک ایسے شخص نے ان پر الزام تراشی کی ہے جو خود انگریزوں کا ٹوڈی رہ چکا ہے۔ پنت جی نے کہا کہ "مجھے نہرو کی محبت اور ان سے وفاداری کا خیال ہے ورنہ میں ابھی استعفا دے کر دہلی سے چلا جاؤں"۔ جسٹس داس نے تمام الزامات کی چھان بین کے بعد

پنت کو بے گناہ قرار دیا۔ اس پر ملک بھر میں دیش مکھ کا خواب مذاق اڑایا گیا۔ دیش مکھ اور پنت دونوں میں انتقامی جذبہ پایا جاتا تھا، مگر پنت تو اپنے قد، یادداشت اور جذبہ انتقام کے اعتبار سے جنگل کے ہاتھی تھے۔

پنت جب وزیر داخلہ تھے تو مہاراجہ دھولپور کا انتقال ہو گیا۔ اس کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ میں نے وزیراعظم کو کہا کہ یہ ریاست اب ملک کی ملکیت ہونی چاہیئے جیسا کہ برطانوی دور میں ہوتا تھا۔ وزیراعظم نے پنت جی کو ایک سے زائد بار لکھا مگر انہوں نے بھی رسید نہ دی۔ دریں اثنا نابھہ کا مہاراجہ جس کی بیوی دھولپور کے مہاراجہ کی بیٹی تھی اپنا دعویٰ لے کر میدان میں آ گیا۔ اس کی استدعا تھی کہ دھولپور کی گدی اس کے سب سے چھوٹے بیٹے کو عطا کر دی جائے جو آنجہانی مہاراجہ کا نواسہ ہے۔ اس سلسلہ میں نابھہ کے مہاراجہ نے پنت کے داماد سے متعدد ملاقاتیں بھی کیں۔ آخر پنت مہاراجہ نابھہ کی حمایت پر رضا ہو گئے۔ انہوں نے مجھ سے بات کی اور درخواست کی کہ میں وزیراعظم سے بات کروں مگر میں نے صاف انکار کر دیا۔ میری طرف سے مایوس ہو کر پنت جی خود وزیراعظم سے ملے وہ مان تو گئے مگر لوگوں کی زبانیں چل پڑیں۔ پنت جی کا داماد تو بدنام ہوا ہی لوگوں نے پنت جی پر بھی انگلیاں اٹھائیں۔ لال بہادر کی پیش گوئی کے برعکس پنت وزیراعظم کے لئے طاقت کا ستون بنے رہے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو نہرو لندن میں دولت مشترکہ کی کانفرنس میں شریک تھے۔ چنانچہ انہوں نے کانفرنس میں شرکت نہ کر کے اپنے دوست کا سوگ منایا۔ نہرو کے دل میں کماؤں کے شیر پنت کی بڑی عزت تھی۔

باب ۴۱

ٹی۔ ٹی کرشن مچاری

ٹی ٹی کرشن مچاری لیور برادرز کے ایجنٹ تھے جہاں انہوں نے خوب مال کمایا۔ وہ دسمبر ۱۹۴۶ء میں آئین ساز اسمبلی کے رکن مقرر ہوئے۔ دہلی میں ان کا سرپرست این۔ گوپال سوامی آئن گر کی شکل میں موجود تھا جس کا نہرو جی بھی بے حد احترام کرتے تھے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب حکومت بنی تو نہرو کرشن مچاری کو کابینہ میں شامل کرنا چاہتے تھے مگر سردار پٹیل نے اس کی مخالفت کی تاہم کرشن مچاری کو "وہم" تھا کہ پٹیل اس کا حامی ہے۔ پٹیل شیام پرشاد مکرجی کو کابینہ میں شامل کرانا چاہتا تھا مگر گاندھی کی مخالفت کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔ نہرو بنگال کی سیاست کی وجہ سے بی سی رائے کو بھی وزیر نہیں بنانا چاہتے تھے۔ بالآخر انہوں نے مکرجی کو کابینہ میں لے لیا۔ اس سے کرشن مچاری کو بڑی مایوسی ہوئی کیونکہ آئن گر نے انہیں وزارت دلانے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ مکرجی کے استعفا کے بعد کرشن مچاری کو وزیر بنایا گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ بطور وزیر کرشن مچاری بے حد کامیاب رہے۔

۵۰ء کے بعد ایک شخص جس کا نام مولراج کرنداس تھا، بمبئی سے مجھے ملنے آیا۔ اس نے بتایا کہ بھارت میں روس کے تجارتی نمائندے نے اسے فولاد کا بہت بڑا کارخانہ لگانے کے لئے فنی اور مالی تعاون کی پیش کش کی ہے۔ مولراج نے کرشن مچاری سے بھی ملاقات کی تھی مگر انہوں نے مولراج کی بات کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ میں نے مولراج سے کہا کہ بھارت میں نجی شعبہ میں فولاد کی مل لگانے کے لئے روسی امداد کی پیش کش میرے لئے حیران کن ہے۔ اس نے بتایا کہ اس نے

بھارت میں روس کے سفیر سے ملاقات کی ہے اور وہ سفیر سے کہے گا کہ وہ مجھ سے رابطہ پیدا کرے۔ میں نے اسی روز کرشن مچاری سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ روس کو تو فولاد بنانا ہی نہیں آتا۔ انہوں نے مجھے ایک امریکی خاتون کا قصہ سنایا جب اسے بتایا گیا کہ روس نے کار بنالی ہے تو اس نے برجستہ پوچھا "کیا یہ چلتی بھی ہے"؟

روسی سفیر نے مجھے فون کیا اور مجھے دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ دعوت پر اس نے روس کے تجارتی نمائندے کی پیش کش کی تصدیق کی۔ میں نے کہا کہ فولاد کا کارخانہ روس کی امداد سے تو سرکاری شعبہ میں لگایا جا سکتا ہے۔ میں نے سفیر کا رابطہ وزارت پیداوار کے سیکرٹری سے کرایا۔ یہ بھلائی کے فولاد کے کارخانے کی ابتدا تھی۔ اس کے بعد روسی سفیر کا میرے ساتھ مسلسل رابطہ رہا اور ہم نے کئی بار دوپہر کا کھانا اکٹھے کھایا۔ ٹی ٹی کرشن مچاری کی وزارت کا فولاد سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے نجی شعبہ میں امریکہ کی مدد سے فولاد کا ایک بڑا کارخانہ لگانے کے لئے سیٹھ برلا سے بات چیت کی۔ منصوبہ بن گیا اور برلا نے اس سلسلے میں کافی کام بھی نمٹا لیا۔ ضروری انتظامات کے بعد کرشن مچاری نے کوشش کی یہ منصوبہ کابینہ اور منصوبہ بندی کمیشن سے منظور کرا لیا جائے مگر گلزاری لال نندہ نے اس نے ڈٹ کر مخالفت کی اور وزیر اعظم نے نندہ کی حمایت کی۔ اس پر کرشن مچاری آگ بگولا ہو گئے اور انہوں نے نہرو کی لندن روانگی سے ذرا پہلے استعفا بھیج دیا۔ انہوں نے اپنے خط میں یہ بات واضح کر دی کہ اگر فولاد کا شعبہ انہیں نہ سونپا گیا تو وہ کابینہ سے الگ ہو جائیں گے۔ یہ استعفا رسمی طور پر کبھی منظور نہ ہوا۔ کرشن مچاری استعفا دے کر یہ کہتے ہوئے مدراس چلے گئے کہ اب "گیند وزیر اعظم کے کورٹ میں ہے"۔ ان کا یہ اقدام غیر دانشمندانہ اور بے وقت تھا۔ لندن سے نہرو کی واپسی پر میں نے کار میں دفتر سے گھر جاتے ہوئے نہرو سے کرشن مچاری کو واپس لانے کی بات کی تو نہرو آگ بگولا ہو گئے۔ ان کا غصہ بلاجواز نہ تھا۔ نہرو اس قدر غصہ میں تھے کہ ان کے بدن کی تھرتھراہٹ کار میں محسوس کی جا رہی تھی۔ انہوں نے کہا "میں ایسے مغرور اور کج اخلاق کے تاجر شخص کو واپس لانے

کے لئے ہرگز ہرگز تیار نہیں"۔ میں نے آہستہ سے کہا "آپ نے جنوبی ہند کے متعدد وزرا گنوا دیئے ہیں۔ مثلاً راجہ جی۔ گیری اور گوپال سوامی آئنگر اور اب بندھیاچل کے جنوب میں واقع علاقہ کی نمائندگی کے لئے آپ کے ساتھ صرف کے۔ ڈی ریڈی رہ گیا ہے"۔ وزیراعظم خاموش رہے۔ اسی رات میں نے روزنامہ انڈین ایکسپریس کے دہلی آفس سے بذریعہ ٹیلی پرنٹر مدراس میں رام ناتھ گوئنکا کو پیغام بھیجا کہ وہ اپنے دوست کرشن مچاری کو میری طرف سے کہدے کہ فوراً دہلی چلا آئے اور اپنی شرط پر ضد کرکے وزیراعظم کے لئے پریشانی پیدا نہ کرے۔ میں نے یہ بھی لکھا کہ "فولاد کو تمہاری خوراک کا جزو بنانے میں بالآخر کوئی مشکل نظر نہیں آرہی"۔ میں نے اپنے پیغام کی نقل وزیراعظم کو بھی پیش کر دی۔

میرا مشورہ مان کر کرشن مچاری واپس دہلی آگیا اور وزیر صنعت و تجارت کے طور پر کام شروع کر دیا۔ جب سرکاری مشینری کی تنظیم نو کی گئی تو فولاد کی الگ وزارت قائم کرکے اس کا قلمدان بھی کرشن مچاری کے سپرد کر دیا گیا۔ انہی دنوں وزیر خزانہ سی ڈی دیش مکھ مستعفی ہو گئے۔ تو کرشن مچاری یکم ستمبر ۵۶ء کو وزیر خزانہ بن گیا۔ ٹی ٹی کرشن مچاری نہایت جذباتی آدمی تھے مگر ان کی زبان بے حد خراب تھی۔ کم از کم دو مرتبہ میں نے انہیں ارکان پارلیمنٹ کے غیظ و غضب سے بچایا جن کے بارے میں انہوں نے نازیبا الفاظ استعمال کئے تھے۔ جب وہ وزیر خزانہ بنے تو انہوں نے ایچ۔ ایم پٹیل کو وزارت خزانہ کا پرنسپل سیکرٹری بنا دیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ "میں تو پٹیل کو خاصی ذمہ داری تفویض کروں گا اور اسے وزیر بے محکمہ تصور کروں گا"۔ میں نے کرشن مچاری سے کہا کہ پٹیل ضرورت سے زیادہ مستعد شخص ہے۔ اسے انگلی پکڑاؤ تو وہ پنجہ پکڑے گا۔ کرشن مچاری نے بی کے نہرو کے متعلق جو ان دنوں وزارت خزانہ میں تھا کہا کہ "نہرو بھارت کا سب سے ذہین افسر ہے"۔ مگر ایک سال بعد ہی کہنے لگے "نہرو تو نہایت غبی ہے"۔ اور میں سوچتا رہا کہ بھارت کا ذہین ترین سرکاری افسر صرف ایک سال میں غبی کیسے ہو گیا۔

۱۹۶۲ء میں ٹی ٹی کرشن مچاری لوک سبھا کا بلا مقابلہ رکن منتخب ہو گیا۔ ہر شخص کو علم ہے کہ اس کا اہتمام ان کے مدمقابل سوا آفتر اپارٹی کے امیدوار سے مل کر کیا گیا تھا۔ جب نئی حکومت بنی تو کرشن مچاری کو کابینہ میں لے لیا گیا۔ نہرو کے بعد لال بہادر شاستری وزیراعظم ہوا تو اس نے بھی کرشن مچاری کو وزارت خزانہ کا قلمدان ہی سونپا۔ مگر اب نہرو سدھار چکے تھے اور بہت سے لوگ کرشن مچاری پر زبان طعن دراز کر رہے تھے۔ کرشن مچاری نے لال بہادر سے کہا کہ "آپ میری صفائی میں لوک سبھا میں بیان دیں ورنہ میں مستعفی ہو جاؤں گا"۔ لال بہادر نے کہا "میں اس وقت تک ایسا بیان جاری نہیں کر سکتا جب تک سپریم کورٹ کا کوئی جج تمہارے خلاف لگائے جانے والے الزامات کی تحقیقات نہ کرے جیسا کہ مالویہ کے معاملے میں کیا گیا تھا"۔ کرشن مچاری نہ مانے اور استعفا دے کر مدراس اپنے گھر چلے گئے۔ کرشنا مینن کے برعکس، کرشن مچاری میں شکر گزاری کا مادہ موجود تھا وہ کبھی کبھار مجھے خط لکھتے رہے۔ جن لوگوں نے کرشن مچاری پر الزامات عائد کئے تھے انہیں بعد میں احساس ہوا کہ الزامات صحیح نہ تھے۔ کرشن مچاری کے آخری ایام نہایت عسرت میں گزرے۔ کرشن مچاری نے اپنے آخری ایام میں متعدد افراد اور صحافیوں کو بتایا تھا کہ نہرو انہیں اپنا جانشین سمجھتے تھے مگر اس دعوے میں حقیقت کا شائبہ تک نہیں۔

باب ۴۲

کامراج

سیاہ آبنوسی رنگ اور موٹے ٹکتے ہوئے ہونٹوں والا کامراج مجھے اکثر اس وحشی جانور کی یاد دلاتا ہے جو پانچ لاکھ سال قبل ایشیا، افریقہ اور یورپ میں بکثرت موجود تھا۔ اور جسے نسل انسانی کے ارتقا کی ایک کڑی تصور کیا جاتا ہے۔ علم الانسان کا کوئی ماہر اگر کامراج کو دیکھ لیتا تو پہلی نگاہ میں ہی فیصلہ کر لیتا کہ آغاز آدم افریقہ کے بجائے ہندوستان میں ہوا تھا ایک امریکی نے جس کی حس مزاح یقیناً بگڑی ہوئی تھی کامراج کو دیکھ کر کہا تھا "اس کی ماں تو سیاہی کی دوات ہوگی"۔ کامراج ایس ستیا مورتی کا پروردہ تھا اور کانگریس کے معمولی ورکر کی حیثیت سے تحریک آزادی میں شامل ہوا۔ وہ پڑھا لکھا نہ تھا اور صرف تامل زبان بول سکتا تھا۔ اگرچہ اس نے اتنی انگریزی سیکھ لی تھی کہ اس میں گفتگو کرنے لگا تھا مگر اس نے ہندی سیکھنے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ وہ ستیا مورتی کا وفادار تھا مگر وہ برہمنوں کا سخت مخالف تھا۔ محنت، فرض سے لگن اور ستیا مورتی کی مدد سے کامراج جلد ہی کانگریس کی صفِ اول میں آگیا اور تامل ناڈو کانگریس کمیٹی کا صدر بن گیا۔ وہ راج گوپال اچاری کا سخت مخالف تھا اور اس کی مخالفت میں گاندھی جی کی پروا بھی نہیں کرتا تھا۔ ایک مدت تک وہ تامل ناڈو میں اقتدار کے زینے سے دور رہا مگر پس پردہ تار وہی ہلاتا تھا۔ کامراج عمر بھر کنوارہ رہا۔ اس کی زندگی بے حد سادہ تھی کانگریس میں اہم عہدوں پر فائز رہنے۔ اور نہرو کے بعد صدر کانگریس کے طور پر بادشاہ گر بننے کے بعد بھی اس کے طرز زندگی میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ تامل ناڈو کا ایک عیسائی

اس کا سرپرست تھا جس سے کامراج اپنے، اپنی والدہ اور زیر کفالت ہمشیرہ کے لئے ضرورت کے مطابق مالی امداد حاصل کرتا تھا۔ کیرالہ میں اس عیسائی کا وسیع کاروبار تھا۔ کامراج نے اس کے عمر بھر کے احسانات کا بدلہ چکانے کے لئے اسے لوک سبھا کا رکن منتخب کرا دیا۔ میں اس شخص سے اچھی طرح واقف ہوں۔

۱۹۵۰ء کے عشرے میں کامراج کو تامل ناڈو کا وزیر اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ وہ کانگریس کی مرکزی کمیٹی کا رکن پہلے ہی منتخب ہو چکا تھا۔ جن دنوں وہ وزیر اعلیٰ تھا اسے کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے جلسوں میں شرکت کے لئے اکثر دہلی آنا پڑتا تھا مگر وہ حکومت سے کبھی سفر خرچ یا دوسرے اخراجات وصول نہیں کرتا تھا۔ حالانکہ دہلی میں قیام کے دوران وہ تامل ناڈو حکومت کا کام مسلسل کرتا رہتا تھا۔ کامراج غالباً واحد وزیر اعلیٰ تھا جو اس معاملے میں سخت احتیاط برتتا تھا۔ چین سے بھارت کی جھڑپوں کے بعد کامراج نے وزیر اعظم سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ وزیر اعلیٰ کے عہدے سے سبکدوش ہو کر اپنا پورا وقت کانگریس کے تنظیمی کاموں پر صرف کرنا چاہتا ہے۔ کامراج جانتا تھا کہ تامل ناڈو میں دراوڑ امونترا کازگام (کانگریس کی مخالف پارٹی) تیزی سے مقبول ہو رہی ہے۔ ان دنوں نہرو مرض الموت میں مبتلا ہو چکے تھے۔ چنانچہ اندرا اور سبرامنیم نے سازش کی اور "کامراج پلان" کے نام سے ایک منصوبہ تیار کیا جس کا مقصد بظاہر یہ تھا کہ اہم کانگریسی رہنما حکومتی عہدے چھوڑ کر پارٹی کی تنظیم پر توجہ دیں۔ چنانچہ پلان کے تحت لال بہادر شاستری، مرارجی ڈیسائی اور متعدد دوسرے اہم اور بعض غیر اہم افراد حکومت سے نکال دیئے گئے اور پارٹی کی تنظیم پر لگا دیئے گئے۔ "کامراج پلان" دراصل بعض ناپسندیدہ افراد سے گلو خلاصی کرانے کی ایک سازش تھی۔ جلد ہی نہرو نے جو کامراج پلان کی منظوری دے چکے تھے، کامراج کو کانگریس کا صدر منتخب کرا دیا۔ مگر نہرو کی زندگی میں اس کی حیثیت کانگریس کے ایک عام رضا کار سے زیادہ نہ تھی۔ کامراج کے دل و دماغ پر نہرو کا خوف چھایا ہوا تھا مگر نہرو کی موت کے بعد کامراج کے جوہر کھلے اور وہ "بادشاہ گر" بن

بیٹھا۔ جب لال بہادر مراتو کامراج اور کانگریس کے دیگر اہم عہدیدار مرارجی ڈیسائی کے خلاف اور اندرا کے حق میں صف آرا ہو گئے۔ وہ اندرا کو کانگریس کی پارلیمانی پارٹی کا قائد منتخب کرا کے وزیر اعظم بنانا چاہتے تھے۔ کامراج نے اندرا کے حق میں جو سب سے بڑی دلیل دی وہ یہ تھی کہ "اندرا مقناطیس کی طرح ووٹ کھینچے گی"۔ اصل قصہ یہ ہے کہ کانگریس کے عہدیدار کسی مضبوط شخص کو وزیر اعظم کے طور پر پسند نہیں کرتے تھے۔ جب اندرا کو پارلیمانی پارٹی کا لیڈر منتخب کر لیا گیا تو رادھا کرشنن نے ایک مصری صحافی کے سامنے اس پر یوں تبصرہ کیا "اب ہمیں ہر صبح اخبار میں ایک خوبصورت چہرہ تو دیکھنے کو ملا کرے گا"۔ اندرا کی ذہنی صلاحیتوں اور عام استعداد کے بارے میں رادھا کرشنن اچھی رائے نہیں رکھتا تھا۔ اس نے میرے سامنے بھی اپنی اس رائے کا برملا اظہار کیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ "زندگی میں اپنے جن کاموں کا مجھے اب بھی افسوس ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ میں نے نہرو سے اندرا کو یونیسکو کے اجلاس میں بھجوانے اور پھر اسے گورننگ باڈی کا رکن منتخب کرانے کی سفارش کی تھی۔ اندرا پیرس میں بالکل ناکام رہی تھی"۔

اندرا کے دورِ حکومت میں جب بھارتی روپے کی قیمت میں کمی کی گئی تو اخبارات اور ریڈیو نے حکومت کے اقدام کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے اور یہ تاثر دیا کہ اس سے اندرون ملک اشیا کی قیمتوں میں کوئی اضافہ نہ ہوگا۔ کامراج اس فیصلے پر سخت پریشان ہوا۔ اگلی صبح اُس نے دیکھا کہ بینگنوں کے دام بڑھ گئے ہیں۔ ان دنوں وہ جس سے بھی ملتا بینگنوں کی مہنگائی کا رونا روتا۔ اس دوران ایک دوست کے گھر پہ کامراج سے میری بھی ملاقات ہوئی۔ تو اس نے اندرا کے خلاف خوب زہر اگلا اور اپنے متعلق اندرا کے خیالات دہرائے جو ایک نہایت ثقہ راوی کے توسط سے کامراج تک پہنچے تھے اس کے بقول اندرا نے کہا تھا "کامراج سے بات چیت میں کس کو دلچسپی ہو سکتی ہے وہ تو انتہائی بور آدمی ہے"۔ میں نے کامراج کو بتایا کہ اندرا جس سیڑھی کے ذریعے اوپر چڑھتی ہے، اسے مار گراتی ہے۔ کامراج نے سر ہلا کر میرے خیال کی

تائید کی۔ پھر وہ روپے کی قیمت میں کمی کا ذکر کرنے لگا اور بینگنوں کی مہنگائی کا ذکر کرتے ہوئے اس نے ٹھیٹھ تامل میں کہا "چھوکری کے دماغ میں بھُس بھرا ہوا ہے"۔ میں نے کہا "کامراج جی تمہیں یہ بات کچھ تاخیر سے معلوم ہوئی ہے۔ اندرا اقتصادی معاملات میں نری گاؤدی ہی ہے۔ حساب تو اس کی ہمیشہ سے کمزوری رہا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اب بھی وہ دو اور دو جمع کر کے چار جواب نہیں نکال سکتی۔ اسے تو ایکڑ اور ھیکڑ کا فرق بھی نہیں معلوم مگر یہ اس کا قصور نہیں۔ اصل قصوروار تم خود ہو"۔ کامراج سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

پھر ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات آ گئے اور کامراج کا یہ تصور کہ اندرا مقناطیس کی طرح ووٹ کھینچے گی بھک سے اڑ گیا۔ متعدد صوبوں میں کانگریس کو شکست فاش ہوئی اور پارلیمنٹ میں بھی اس کی اکثریت میں خطرناک حد تک کمی ہو گئی۔ کامراج پلان کی دھجیاں اُڑ گئیں۔ اور اس کا پول کھل گیا۔ تامل ناڈو میں کانگریس کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور کامراج کو صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں ایک غیر معروف طالب علم نے بری طرح ہرا دیا۔ کانگریس کا یہ صدر جو کبھی بڑا طاقت ور تسلیم کیا جاتا تھا، تھکے قدموں سے دہلی لوٹ آیا۔ وہ ہر محاذ پر شکست کھا چکا تھا اور حالات کو سدھارنے کی کوئی ترکیب اس کے ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔ اب وہ اندرا کو وزیر اعظم دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اور شکست خوردہ پارٹی کے مفاد کے تحت وہ پارٹی کی قیادت کے لئے انتخاب کا بھی حامی نہ تھا۔ پارٹی میں اندرا کی پوزیشن بھی مستحکم نہیں تھی۔ کامراج نے مرارجی ڈیسائی کو ترغیب دی کہ وہ پارلیمانی پارٹی کا انتخاب لڑنے سے دست بردار ہو جائیں۔ اس نے مرارجی ڈیسائی سے کہا "آپ حکومت میں شامل ہو جائیں ورنہ وہ (اندرا) مزید تباہی مچا دے گی"۔ کامراج نے اندرا سے وعدہ لیا کہ وہ مرارجی ڈیسائی کو ڈپٹی وزیر اعظم نامزد کرے گی۔ بعد میں کامراج خود بھی لوک سبھا کا رکن منتخب ہو گیا تاہم اسے کانگریس کی صدارت

سے ہاتھ دھونا پڑے۔ اس کی جگہ نجلنگ اپا کانگریس کا صدر بن گیا جو کسی بڑے مینڈک کے مشابہ نظر آتا ہے اور قوت فیصلہ سے عاری ہے۔ کامراج اس "معمولی چھوکری" کے ہاتھوں مزید بے عزتی برداشت کرنے کے لئے زندہ رہا جسے اس نے بام عروج پر پہنچایا تھا۔ وہ شکستہ دل مایوس اور رنجیدہ انسان کی حیثیت سے اس دنیا سے سدھارا۔

باب ۴۳

لال بہادر شاستری

ایک چینی ضرب المثل ہے "عاجزی اچھی چیز ہے مگر حد سے بڑھی ہوئی عاجزی فریب کاری سے قریب تر ہے۔ کم گوئی قابلِ تعریف ہے مگر حد سے بڑھی ہوئی خاموشی پر فریب ذہن کی غماز ہوتی ہے"۔

لال بہادر شاستری میں عاجزی کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں مگر اسے حد سے زیادہ عاجزی کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ زندگی کے ادائل میں وہ ایک کانگری رضا کار تھا جو انند بھون (الہ آباد) کے آس پاس منڈلاتا رہتا تھا۔ وہ چھوٹے قد کا چالاک آدمی تھا جو کسی کو ناراض نہیں کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک معمر کانگری عورت نے مجھ سے کہا "میں جب کبھی لال بہادر کو دیکھتی ہوں تو میرا جی چاہتا ہے کہ اُسے گود میں بٹھا کر دودھ پلاؤں"۔ شاستری نے اپنی سرکاری زندگی کا آغاز یوپی میں پارلیمانی سیکرٹری کی حیثیت سے کیا۔ ان دنوں پنت یوپی کے وزیر اعلیٰ تھے بعد میں پنت نے اُسے وزیر بنا دیا اور پولیس کا محکمہ اس کے سپرد کر دیا۔ لال بہادر شاستری عام طور پر کانگریسیوں کی گروہ بندی سے الگ رہا۔

ستمبر ۱۹۵۱ء میں نہرو کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ انہی دنوں پرشوتم داس ٹنڈن نے کانگریس کے جنرل سیکرٹری کے عہدے سے استعفا دے دیا۔ اس پر آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں پریشانی پھیل گئی۔ پھر ۱۹۵۲ء میں عام انتخاب ہونے والا تھا میں نے نہرو جی کو

تجویز پیش کی کہ لال بہادر اور مالویہ کو کانگرس کے جنرل سیکرٹری مقرر کر دیا جائے۔ انہوں نے مجھے ہدایت کی کہ میں لال بہادر سے ٹیلیفون پر بات کروں اور اس سے کہوں کہ وہ پنت جی سے بات کر کے فوراً دہلی چلا آئے۔ چنانچہ لال بہادر نے آکر جنرل سیکرٹری کا عہدہ سنبھال لیا۔ اسے ایوان وزیراعظم میں ٹھہرنے کو کہا گیا اور اسے میرے کمرے کے سامنے والا کمرہ دے دیا گیا۔ مجھے لال بہادر سے بڑی ہمدردی تھی۔ وہ میری طرح دیر تک کام کرنے کا عادی تھا اور کھانا بھی وقت پر نہیں کھا سکتا تھا۔ وہ مردولا سارا بائی سے خوفزدہ تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ مردولا سارا بائی کی باتوں کو نظر انداز کر دے تاہم اگر وہ کوئی شگوفہ چھوڑے گی تو میں نمٹ لوں گا مگر لال بہادر جس انداز میں وزیراعظم سے پیش آتا تھا وہ مجھے پسند نہ تھا۔ وہ اس تاڑ میں رہتا کہ وزیراعظم کو کیسے خوش کیا جا سکتا ہے۔ گویا وہ وزیراعظم کی خوشنودی کے لئے کام کرتا تھا۔ ایک بار میں نے اسے مشورہ بھی دیا کہ وہ اپنا طرز فکر بدل لے۔ میں نے اس سے یہ بھی کہا کہ "تم وزیراعظم کے سامنے تمام حقائق رکھ دیا کرو۔ پھر دیکھو ننانوے فیصد معاملات میں ان کا ردعمل بالکل درست ہو گا۔" لال بہادر نے جواب دیا "متھائی صاحب مجھے معلوم ہے کہ آپ کو تو پنڈت جی سے کچھ لینا دینا نہیں، بلکہ آپ تو ان سے ناراض بھی ہو لیتے ہیں مگر میں ایک معمولی سیاسی کارکن ہوں اور میں آپ جیسا طرز عمل اختیار نہیں کر سکتا۔" لال بہادر بدستور پھونک پھونک کر قدم رکھتا رہا۔

۱۹۵۲ء کے عام انتخاب میں نہرو اور سری پرکاش الٰہ آباد کے دو ملحقہ حلقوں سے کھڑے ہوئے۔ ان دونوں حلقوں میں انتخابی مہم کا انچارج لال بہادر کو بنایا گیا۔ انتخاب کے بعد لال بہادر کو کابینہ میں لے لیا گیا اور ریلوے کی وزارت اسے سونپی گئی۔ اسی سال وہ راجیہ سبھا کا رکن بھی منتخب ہو گیا۔ ریلوے کے حادثہ کے بعد لال بہادر نے وزیر ریلوے کی حیثیت سے استعفا دے دیا مگر اس کا یہ استعفا بھی مستقبل کے سیاسی مفادات سے یکسر خالی نہ تھا۔ ان دنوں دوسرے عام انتخابات ہونے والے تھے۔ وزارت سے استعفا

کے بعد بہت سے کانگرسی ارکان پارلیمنٹ کے نزدیک لال بہادر ایک محترم شخص بن چکا تھا۔ ۱۹۵۷ء میں دوسرے عام انتخابات ہوئے اور لال بہادر لوک سبھا کا رکن منتخب ہو گیا۔ اسے پھر کابینہ میں شامل کر لیا گیا۔ اب کے اسے تجارت وصنعت کا وزیر بنایا گیا۔ وزیر ریلوے اور پھر وزیر تجارت وصنعت کی حیثیت سے لال بہادر کی کارکردگی اوسط درجے سے بھی کمتر تھی۔ وہ بانجھ ذہن کا مالک اور اظہار رائے یا فیصلہ کرنے کی قوت سے عاری تھا مگر جہاں تک کانگریس کے تنظیمی معاملات کا تعلق ہے وہ دوسرے درجے کے سیاست دانوں میں اول درجے کا شخص تھا۔ ان دنوں جب بھی مجھے لال بہادر کا خیال آتا تو مجھے چین کے ایک مشہور شاعر کی کہانی یاد آجاتی۔ یہ شاعر خوش قسمتی سے ایسا تھا جو زندگی کی اچھی چیزوں سے محبت کرتا تھا۔ ایک رات جب چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اس شاعر نے خوب شراب پی اور کشتی میں بیٹھ کر دریائے زرد کے وسط میں پہنچ گیا۔ اس نے پانی میں چاند کا عکس دیکھا اب شاعروں اور دوسرے تصوراتی لوگوں کی طرح اس نے چاند کو دیکھتے دیکھتے یہ تصور کر لیا کہ دراصل یہ اس عورت کا چہرہ ہے جسے وہ زندگی بھر چاہتا رہا ہے۔ اس نے چپو پانی میں رکھا اور اپنی محبوب سے ہمکنار ہونے کے لئے دونوں بازو پھیلا کر آگے بڑھا۔ وزن ایک طرف ہو جانے سے کشتی الٹ گئی اور بے چارہ شاعر پانی کی نذر ہو گیا۔ مگر اس شخص نے اپنی وصیت لکھ رکھی تھی۔ اس نے لکھا تھا "میں ذہین ہوں اور ہشیار ہوں۔ اس لئے میری زندگی تباہی سے دوچار رہی ہے۔ اب میری صرف ایک خواہش ہے کہ میرا بیٹا اوسط درجے کے ذہین نوجوان کی حیثیت سے پروان چڑھے اور بالآخر ملک کا سفیر یا وزیر بن جائے۔" یہ بات ہمارے وزراء پر کتنی صادق آتی ہے وہ ہاتھ ہلا کر اور بازو لہرا کر ان امور پر تقریریں کرتے نظر آتے ہیں جن کے بارے میں انہیں کچھ پتہ نہیں ہوتا۔

متنازعہ فیہ کامراج پلان پر عملدر آمد کے دوران نہرو کی خواہش تھی کہ لال بہادر کو وزارت سے الگ نہ کیا جائے۔ مجھے یہ بات خود لال بہادر نے بتائی مگر ایک "دانشمند"

شخص نے جس کا نام میں منظرِ عام پر نہیں لانا چاہتا، نہرو کو مشورہ دیا کہ یا تو لال بہادر اور مرارجی ڈیسائی دونوں کو کابینہ سے علیٰحدہ کیا جائے یا پھر دونوں کو ہی رکھا جائے۔ اس دانشمند شخص نے کہا کہ اگر صرف ڈیسائی کو سبکدوش کیا گیا تو لوگ محسوس کریں گے کہ یہ محض ایک تو صرف ڈیسائی کو ہٹانے کے لئے پھیلایا گیا ہے۔ اس طرح ڈیسائی عام لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرے گا۔ چنانچہ لال بہادر کو بھی جانا پڑا۔ مگر جب نہرو کو دل کا دورہ پڑا۔ تو انہوں نے لال بہادر کو واپس بلالیا اور وزیر بے محکمہ مقرر کر دیا۔ اس کا مقصد محض یہ تھا کہ وہ وزیر اعظم کی امداد کرے گا۔ لال بہادر کو وزارت خارجہ میں کمرہ دے دیا گیا جہاں اس نے نہرو کی موت تک اپنی زندگی کے نہایت مایوس کن دور کے حوصلہ شکن شب و روز گزارے۔ وزارت خارجہ کے سیکرٹری تمام اہم امور نہرو کے پاس لے جاتے تھے۔ جہاں اندرا ہر وقت منڈلاتی رہتی۔ لال بہادر کو ڈپٹی سیکرٹری اور اسی قبیل کے دوسرے افسر رپورٹیں وغیرہ مطالعہ کے لئے پیش کرتے تھے۔ ان دنوں لال بہادر نے مجھ سے اندرا کی سخت شکایت کی۔ اس نے نہایت افسردگی کے عالم میں کہا "مجھے تم بہت یاد آتے ہو۔ اگر تم پنڈت جی کے ساتھ ہوتے تو حالات بالکل مختلف ہوتے"۔ اپنی مخدوش جسمانی حالت کے باوجود نہرو اختیارات کسی اور کے سپرد کرنے کے حق میں نہ تھے حالانکہ انہیں چاہیئے تھا کہ وہ کابینہ کے سیکرٹری، امور خارجہ کے سیکرٹری اور دیگر اعلیٰ حکام سے کہتے کہ تمام معاملات لال بہادر کو پیش کریں اور وزیر اعظم تک صرف وہ معاملات پہنچائے جائیں جو وہ خود یا لال بہادر وزیر اعظم کے علم میں لانا ضروری خیال کریں۔ نہرو نے اس نوع کی کوئی ہدایت جاری نہ کی کیونکہ وہ ایک چینی ضرب المثل کے مصداق "عمر بھر دوسرے درجے کے انسان کے اس عقیدے میں گرفتار رہے کہ ہر کام کو بطریقِ احسن انجام دینے کے لئے ضروری ہے کہ اسے خود کیا جائے"۔

نہرو کی وفات (۲۷ مئی ۱۹۶۴ء) سے قبل ہی کانگریس کے اعلیٰ عہدیداروں بالخصوص کامراج، تلیہ گھوش، سی بی گپتا اور ایس کے پاٹل نے سنجیوا ریڈی سے مل کر یہ فیصلہ کر لیا تھا

کہ لال بہادر شاستری کو نہرو کا جانشین بنایا جائے۔ انہیں مرارجی ڈیسائی ایسا طاقتور شخص پسند نہیں تھا۔ دراصل دل کے دورے کے بعد نہرو نے لال بہادر کو واپس کابینہ میں بلا کر، بالواسطہ طور پر اپنی پسند کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ اندرا کی دلی خواہش تھی کہ قائم مقام وزیر اعظم گلزاری لال نندہ ہی وزیر اعظم بن جائے۔ مگر کسی نے اس کی طرف توجہ ہی نہ دی۔ ان دنوں اندرا کی اپنی کوئی شخصیت ہی نہ تھی اور اس طرح "چھوٹو" لال بہادر شاستری وزیر اعظم بن گیا۔ ان دنوں کا مقبول ترین لطیفہ یہ تھا کہ بھارت کو وزیر اعظم کے عہدے کے لئے انسان کی ضرورت ہے، کسی چوہے کی نہیں۔ لال بہادر کو وزیر اعظم بنے ہفتہ عشرہ ہی گزرا تھا کہ ایک شام این۔ آر پلائی مجھے سینما لے گیا۔ اس روز خبروں کی جو فلم دکھائی گئی اس میں شاستری کو روس کے نائب وزیر اعظم کوسیان کا استقبال کرتے دکھایا گیا تھا۔ پست قد لال بہادر جواہر کٹ جیکٹ پہنے ہوئے تھا جس کے تمام بٹن کھلے تھے جب اس نے ہاتھ باندھ کر روسی نائب وزیر اعظم کو تمسکار کیا تو تماشائی تحقیر آمیز قہقہے لگانے لگے۔ مجھے افسوس ہوا کہ نہرو کا جانشین بننے سے بیچارے لال بہادر کی مشکلات میں اضافہ ہو گیا ہے کیونکہ نہرو اور اس کے جانشین کے درمیان پستی کا فاصلہ ناقابل عبور حد تک بڑھ گیا تھا۔

لال بہادر کے عہد میں دو بڑے واقعات رونما ہوئے۔ پہلا واقعہ رن کچھ کا تنازعہ تھا جس میں بھارت کو کچھ علاقہ کھونا پڑا اور دوسرا واقعہ پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ تھی۔ جنگ کے دوران بعض اخبارات نے لال بہادر کو بھارت کا مرد آہن لکھا۔ اس پر میں بہت محظوظ ہوا۔ کیونکہ میں تو اسے کئی سال سے "مرد پنیر" کے طور پر جانتا تھا۔ اسے تو یہ تک معلوم نہ تھا کہ مغربی محاذ پر ہماری فوجیں کہاں کہاں موجود ہیں یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ان دنوں جنرل جے این چودھری اور ایر چیف مارشل ارجن سنگھ جیسے "درجہ اول" کے لوگ موجود تھے۔ پاکستان کے ساتھ اس مختصر سی جنگ میں لال بہادر اور اس کے اہل خانہ کبھی اپنے گھر میں نہیں سوئے۔ رادھا کرشنن نے مجھے بتایا کہ وہ تو ایک بل میں سویا کرتے

تھے جو ایوان صدر کے تہہ خانے سے بھی آگے ایک زیر زمین کمرہ تھا جو سبزیوں کی کیاریوں اور پامیں باغ کے نیچے گہرائی میں واقع تھا۔ یہ زمین دوز کمرہ دوسری جنگ عظیم کے دوران تیار کیا گیا تھا۔ رادھا کرشنن نے تہہ خانے میں جانے سے انکار کر دیا تھا۔

تاشقند کے مذاکرات میں لال بہادر شاستری نے روس کے دباؤ میں آکر کوسیگن کے تمام مطالبات منظور کر لئے۔ تاشقند سے اس نے دہلی میں فون کر کے اپنے عملے سے معلوم کیا کہ اعلان تاشقند پر لوگوں کا ردعمل کیا ہے اگر وہ تاشقند سے زندہ دہلی لوٹ آتا تو یہاں اس کا مظاہرین سے استقبال کیا جاتا۔ لال بہادر کی موت سے دو روز قبل میں نے خواب میں دیکھا کہ پالم کے ہوائی اڈے پر اس کی لاش اتاری جا رہی ہے۔ میں نے اپنے دوست پانیکر کو فون کیا تو اس نے کہا کہ "تمہاری پیش بینی ایسی ہے کہ یہ بات سچ بھی ہو سکتی ہے"۔ اور یہ خواب پورا ہو گیا۔ لال بہادر تاشقند میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گیا۔

باب ۲۲

دوگرگ باراں دیدہ

جگ جیون رام اور سردار سورن سنگھ کے وزیر بن جانے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ اچھوتوں اور سکھوں سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی فرقہ وارانہ تعلق کی بنیاد پر ہی وہ کافی عرصہ وزیر رہے ہیں۔ ۱۹۴۶ء میں جب عبوری حکومت قائم ہوئی تو نہرو منی سوامی پلائی کو وزیر بنانا چاہتے تھے جو سارے مدراس میں چھوت چھات کے لئے بدنامی کی حد تک مشہور ہے مگر راجندر پرشاد نے جگ جیون رام کا نام تجویز کیا۔ اس نے ولبھ بھائی پٹیل اور گاندھی جی کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیا۔ پھر ان سب نے مل کر نہرو سے بات جو کی تو نہرو کو سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اور جگ جیون رام کابینہ میں شامل کر لیا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ نہرو جگ جیون رام کو وزیر بنانے کے بجائے کسی صوبے کا گورنر مقرر کرنا چاہتے تھے مگر راجندر پرشاد نے جواب صدارت کے عہدے پر متمکن تھا نہرو کو کہہ سن کر اسے وزیر بنوا دیا۔ جگ جیون رام ہشیاری اور عیاری دونوں کا مرکب ہے اور بعض پہلوؤں سے اہلیت اور قسمت کے معاملے میں وہ رفیع احمد قدوائی سے مشابہ ہے۔ وزارت داخلہ میں جگ جیون رام کی خاصی موٹی فائل تیار ہو چکی ہے اور اس کا اس کے مستقبل پر اثر بھی پڑا ہے مگر زندہ افراد میں سے یہ فائل میرے اور مرارجی ڈیسائی کے سوا کسی اور نے نہیں دیکھی۔ اب جگ جیون رام نے خود کو کافی مضبوط کر لیا ہے لیکن اسے جرأت کا مظاہرہ کرنا چاہیئے تھا اور جب اندرا نے

کابینہ سے پوچھے بغیر ہنگامی حالت نافذ کی تو اسے کابینہ سے مستعفی ہو جانا چاہیئے تھا۔

الفاظ کی ذو ہندی اور پنجابی کے الفاظ کی معنویت سے قطع نظر سورن سنگھ کے معنی ہیں۔ سنہرا شیر۔ بلدیو سنگھ کی سیاسی دیانتداری سے جب نہرو کا ایمان اٹھ گیا تو انہوں نے سورن سنگھ کو جو صوبائی وزیر تھا۔ مرکز میں لے لیا۔ سورن سنگھ ۱۹۵۲ء میں وزیر بنا اور کئی سال تک وزیر رہا جتنی وزارتوں کے قلمدان سورن سنگھ نے سنبھالے کسی اور مرکزی وزیر کو نصیب نہیں ہوئے۔ عام ضلعی وکیل کے پس منظر کے ساتھ سورن سنگھ کی شخصیت میں شرافت رچی بسی ہے مگر ... یوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے جس جرأت اور پرواز فکر کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس سے محروم ہے جب اس کے پاس ورکس، کان کنی اور پاور کی وزارت تھی تو سورن سنگھ نے ایک ایسی حرکت کی جس پر مجھے یہ قول یاد آ گیا "بھگوان نے دو طرح کے انسان پیدا کئے ہیں۔ اچھے کام کے اور ناکارہ" میرے ایما پر وزیراعظم اور وزیر داخلہ پنت نے برماشیل کے ایک اعلیٰ افسر کے۔ کے شاہانی کو سرکاری ملازمت میں لے لیا۔ اسے منصوبہ بندی کمیشن میں مقرر کیا گیا اور سردار سورن سنگھ سے کہا گیا کہ وہ تیل سے متعلقہ معاملات میں شاہانی سے مشورہ کیا کریں۔ جب سوئز کا بحران پیدا ہوا تو غیر ملکی تیل کمپنیوں نے تیل کے کرائے کے نرخ بڑھانے چاہے۔ سردار سورن سنگھ نے شاہانی سے مشورہ کے بغیر نرخوں میں اضافہ سے اتفاق کر لیا مگر پاکستان اور سیلون نے نرخ بڑھانے سے انکار کر دیا۔ اس طرح صرف بھارت کو کئی کروڑ روپے کا نقصان اٹھانا پڑا۔ اس پر سورن سنگھ کی کھنچائی بھی ہوئی۔ جب کرشن مچاری وزیر خزانہ بنا تو سورن سنگھ کو فولاد، کان کنی اور تیل کی وزارتیں دی گئیں اور کے۔ڈی مالویہ کو اس کا جونیئر وزیر بنا دیا گیا۔ شاہانی کو تیل کے معاملات کا انچارج بنا دیا گیا اور اس نے متعدد ایسے اقدامات کئے جن سے حکومت کو کروڑوں روپے کے زر مبادلہ کی بچت ہوئی۔

بھارتی حکومت کو کسی ملک سے جب کسی ایسے مسئلے پر طویل بات چیت کرنا ہو جس کا نہ تو حل آسان ہو اور نہ ہی اسے حل کرنا مقصود ہو تو نگہ انتخاب سورن سنگھ پر پڑتی ہے۔

سورن سنگھ بے پایاں صبر و تحمل کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ مسلسل گفتگو کی زبردست صلاحیت سے بھی مالا مال ہے۔ پاکستان کے ساتھ کشمیر کے مسئلہ پر مذاکرات میں سورن سنگھ نے "عظیم الشان" کامیابی حاصل کی۔ نہرو کی موت کے بعد جب وزارت خارجہ کا قلمدان سورن سنگھ کو سونپا گیا تو بین الاقوامی امور میں بھارت کی قدر و منزلت بہت کم ہو چکی تھی اور سورن سنگھ کی بے رنگ و کیف شخصیت ان بدلے ہوئے حالات کے لئے عین مناسب تھی مگر اس میں ایک کمی ہے اس کی آواز "سوانیوں" جیسی ہے۔ اس کی آواز نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی یا اس نوع کے دوسرے اجلاسوں میں اس کی کوئی مدد نہیں کی۔

مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ اندرا نے جب از خود ملک میں ہنگامی حالت نافذ کی تو سورن سنگھ اس سے خوش نہ تھا۔ وہ اپوزیشن کے لیڈروں کی گرفتاریوں اور اخبارات پر سنسر لگانے کے بھی خلاف تھا مگر یہ "سنہری شیر" اندرا کے سامنے بھیگی بلی بنا رہا۔ اور اس میں اتنی جرأت بھی نہیں تھی کہ وہ کابینہ سے مستعفی ہی ہو جاتا۔ وہ وقت گزارتا رہا حتیٰ کہ اندرا کے ایک ترجمان نے اس کی مشکل یہ کہہ کر حل کر دی کہ "سورن سنگھ طویل مدت تک وزیر رہنے کے بعد اب اکتا سے گئے ہیں اور وہ اپنی جگہ کسی نوجوان کے لئے خالی کرنا چاہتے ہیں" سورن سنگھ اس پر خاموش رہا۔ گویا اس نے ترجمان کی بات کو درست تسلیم کر لیا ہے۔

باب ۲۵

ولبھ بھائی پٹیل

ولبھ بھائی پٹیل عمر میں نہرو سے تیرہ سال بڑا اور گاندھی سے صرف سات سال چھوٹا تھا۔ وہ کسان خاندان سے تھا۔ اور اعلیٰ تنظیمی صلاحیتوں کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ سخت گیر بھی تھا۔ قدرتی طور پر کانگریس کی ''افسری'' اس کے حصے میں آئی۔ یہ ایسا کام تھا کہ نہرو بھی اس سے گھبراتے تھے۔ نہرو نے حصولِ آزادی تک کانگریس کے مرکزی پارلیمانی بورڈ کے صدر کا عہدہ بھی پٹیل کے لیے ہی رکھا۔ اس طرح پٹیل پارٹی کی تنظیم پر چھا گیا۔ ۲ر ستمبر ۴۶ء کو پٹیل عبوری حکومت میں شامل ہوا اور اُسے وزارتِ داخلہ اور اطلاعات و نشریات کے محکمے ملے۔ اس وقت سے لے کر ۱۹۵۲ء میں اپنی وفات تک پٹیل اس طرح کام کرتا رہا جس سے وزارتوں میں اعلیٰ سول افسروں کے درمیان دھڑے بندی کو فروغ ملا۔ اور فی الحقیقت حکومت دو دھڑوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ مرارجی ڈیسائی نے جو پٹیل کے بے حد مداح ہیں۔ ایک بار مجھے ذاتی طور پر بتایا کہ ''سردار میں وہ ذاتی ڈسپلن مفقود ہے جو کسی نمبر دو حیثیت کے شخص کا طرہ امتیاز ہونا چاہیے۔''

نہرو اختیارات کو اپنی محبوبہ تصور کرتے تھے اور وہ پٹیل کو اس سے آنکھ مٹکا کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے مگر وہ ملکی مفاد اور یکجہتی کے لیے چشم پوشی کرتے رہے۔ وہ وقت بھی تو غیر معمولی تھا۔ ۱۵ اگست ۴۷ء کو نئی کابینہ کی تشکیل کے

وقت بعض مفاد پرست لوگوں نے یہ افواہ پھیلا دی کہ پٹیل کو اب شامل نہیں کیا جا رہا۔ نہرو کو اس پر سخت غصہ آیا۔ انھوں نے پٹیل کو نہ صرف کابینہ میں شامل کر لیا بلکہ اُسے نائب وزیر اعظم نامزد کر دیا۔ اگرچہ ڈپٹی وزیر اعظم کا عہدہ برائے نام ہی تھا اور اس کے ساتھ ذمہ داریاں وابستہ نہیں تھیں۔ مگر پٹیل کے ساتھ یہ بات ذرا مختلف تھی۔

آزادی کے بعد حکومت کے قیام کے ساتھ ہی صوبائی رابطہ کی وزارت بنانے کا بھی خیال تھا۔ نہرو کی خواہش تھی کہ ایچ۔ وی۔ آر آئینگر نئی وزارت کے سیکرٹری ہوں گے۔ مگر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا خیال تھا کہ نہرو کو دوست نوازی کا ضرورت سے زیادہ ثبوت نہیں دینا چاہیے۔ لارڈ کو یقین تھا کہ نہرو تصوراتی آدمی ہیں۔ جبکہ پٹیل عملی شخص ہے۔ وہ پٹیل کو صوبوں کی وزارت کا انچارج بنانا چاہتا تھا اور اس کی یہ بھی خواہش تھی کہ پٹیل کا پروردہ اور چہیتا سول افسر وی۔ پی مینن اس وزارت کا سیکرٹری بنے۔ اس طرح خود لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بھی صوبوں میں عمل دخل کا موقع ملتا رہتا۔ ماؤنٹ بیٹن نے یہ سب کچھ ذہن میں رکھ کر پٹیل سے بات کی۔ مگر نئی وزارت کے قیام کا فیصلہ گورنر جنرل کو نہیں بلکہ نئے وزیر اعظم کو کرنا تھا۔ مگر نہرو ماؤنٹ بیٹن کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گئے۔

پٹیل نئی حکومت میں جان متھائی کو وزیر خزانہ نہیں بنانا چاہتے تھے کیونکہ متھائی نے لیاقت علی خاں سے اتفاق کرتے ہوئے بعد میں نہرو کو بھی ترغیب دی تھی کہ انکم ٹیکس کی تحقیقات کے لیے کمیشن ضرور قائم کیا جانا چاہیے۔ پٹیل کا خیال تھا کہ لیاقت علی خاں کا مقصد ہندو تاجروں اور صنعت کاروں کو نقصان پہنچانا تھا۔ چنانچہ پٹیل نے نہرو کو کہہ کر بالآخر آر۔ کے شنمکھم چیٹی کو وزیر خزانہ بنوا دیا۔ پٹیل کا خیال تھا اور یہ درست بھی ثابت ہوا کہ چیٹی سے وہ جو چاہے گا کرایا کرے گا۔ چیٹی کا بطور وزیر خزانہ تقرر بیشتر لوگوں کے لیے باعث حیرت تھا چنانچہ مناسب وقت آنے پر

پٹیل نے چیٹی سے کہا کہ گجرات کے فلاں فلاں تاجروں اور صنعت کاروں کے نام اس فہرست سے نکال دیئے جائیں۔ جن کے خلاف انکم ٹیکس کے تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ پر کارروائی ہونے والی تھی۔ چیٹی نے ایسا ہی کیا۔ مگر جب یہ خبر عام ہوئی تو پارلیمنٹ میں بڑا شور مچا اور پٹیل کی آزمائش کا وقت آن پہنچا۔ مگر پٹیل خاموش رہا اور جس شخص نے اس کی بات مانی تھی اُسے ذلت سے دوچار کر دیا۔ اس دوران پٹیل نے ایک لمحہ کی نیند بھی ضائع نہ کی۔ نہرو نے چیٹی سے استعفا طلب کر لیا۔ اس کی جگہ جان متھائی کو وزیر خزانہ مقرر کیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد متھائی نے مجھے بتایا کہ جو کچھ ہوا چیٹی اس میں بے گناہ تھا۔

الہ آباد یونیورسٹی میں متھائی کا ایک لڑکا زیر تعلیم تھا۔ ایک روز میں کار پر جا رہا تھا کہ ایک شخص اس کی زد میں آگیا اور مر گیا۔ لڑکے کو پولیس نے گرفتار کر لیا۔ مصیبت کا مارا جان متھائی یہ امید لے کر بھاگا بھاگا وزیر اعظم کے پاس پہنچا کہ وہ اس کی مدد کریں گے۔ نہرو نے تمام ماجرا سنا اور فقط اظہار امدادی پر اکتفا کیا کیونکہ وہ قانونی معاملات میں مداخلت کے حق میں نہیں تھے۔ جان متھائی سخت مایوس ہوا۔ اور اس واقعہ کے بعد وزیر اعظم کے بارے میں اس کا رویہ تبدیل ہو گیا۔ وزیر اعظم کے در سے ناکامی کے بعد متھائی پٹیل کے پاس پہنچا۔ پٹیل تو اسے ممنون احسان بنانے کے لیے موقع کی تلاش میں تھا۔ پٹیل نے فوراً یوپی کے وزیر اعلیٰ پنت کو فون کیا اور کہا کہ لڑکے کو رہا کر کے پولیس کی حفاظت میں میرے گھر بھیج دیا جائے۔ اگلے روز لڑکا پٹیل کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے متھائی کو فون کر کے بلایا۔ جب وہ آیا تو اس سے کہا کہ میں "تمہیں حیران کر دینا چاہتا ہوں" یہ کہہ کر لڑکا اس کے سپرد کر دیا۔ پٹیل نے جان متھائی سے کہا کہ لڑکے کو فی الفور ملک سے باہر بھیج دو۔ چنانچہ لڑکے کو اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک سے باہر روانہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس کیس کا کوئی پتہ نہ چلا۔

یہ پٹیل کے انتظامی طریق کار کی ایک مثال تھی۔

پٹیل فرقہ وارانہ تعصب سے بالاتر نہ تھا۔ اس نے کبھی مولانا آزاد پر اعتماد نہیں کیا اور زندگی بھر اس کی مخالفت میں کمربستہ رہا۔ پٹیل رفیع احمد قدوائی کو قابلِ نفرت دشمن تصور کرتا تھا۔ تقسیم ملک اور عظیم تبادلہ آبادی کے دوران وہ نہرو کا مذاق اڑانے میں لطف محسوس کرتا۔ ایک مرتبہ پٹیل نے کانگریس کے بعض ارکان اسمبلی کو بتایا کہ بھارت میں صرف اور صرف ایک قوم پرست مسلمان ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ ان لوگوں کا قیاس تھا کہ پٹیل رفیع احمد قدوائی کا نام لے گا، مگر ان کی حیرت کی انتہائی نہ رہی جب پٹیل نے کہا "مولانا جواہر لال نہرو" پٹیل کی ایک بات اب تک میرے لیے معمہ بنی ہوئی ہے۔ اس نے سری پی رام سوامی کو اس وقت دہلی مدعو کر کے اپنے گھر پر مہمان رکھا جب لوگوں کے ذہنوں میں ریاست ٹراونکور کی آزادی کا اعلان اور پاکستان میں ٹراونکور کے سفیر کے تقرر کی یاد ابھی تازہ تھی۔ پھر پٹیل نے بڑی سنجیدگی سے نہرو کو سفارش کی۔ کہ سری پی کو امریکہ میں بھارت کا سفیر مقرر کر دیا جائے۔ اس پر نہرو کو بے حد تعجب ہوا۔ انہوں نے کہا "میں تو سری پی کو دُور سے چھونا بھی نہیں چاہتا۔ لیکن اگر اس تجویز کا مطلب کسی غدار کو مفاد پہنچانا ہے تو پھر یہ تجویز نہ صرف بے وقت ہے بلکہ انتہائی احمقانہ بھی ہے۔"

۱۹۴۸ء میں جب نہرو امریکہ کے خیر سگالی دورے پر گئے تو ان کی عدم موجودگی میں پٹیل نے آئین کی دو شقیں منظور کرالیں۔ ایک کے ذریعے والیان ریاست کو فراخدلی سے وظیفے اور دوسری مراعات دی گئی تھیں۔ جبکہ دوسری کا تعلق سرکاری افسروں کی ملازمتوں کے تحفظ اور مراعات سے تھا۔ نہرو کو یہ دونوں باتیں پسند تو نہ آئیں۔ مگر وہ مصلحتاً خاموش رہے۔ پٹیل نے نہرو کی عدم موجودگی میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کو بھی ایک قرارداد منظور کرنے کی ترغیب دی۔ جس کے ذریعے آر۔ ایس ایس

ورکرز کو کانگریس میں شمولیت کی اجازت دینی مطلوب تھی۔ یہ قرارداد پٹیل نے پیش کی۔ نہرو کو اس کا پہلے سے اندازہ تھا۔ چنانچہ امریکہ سے آتے ہی انہوں نے کانگریس کی مجلس عاملہ کا اجلاس بلایا۔ جس میں پٹیل کی پیش کردہ قرارداد منسوخ کر دی گئی۔

۱۹۴۸ء کے اوائل میں کسی وقت یو۔ ایس۔ مالیہ ایم پی اے نے مجھے پٹیل سے اپنی جھڑپ کے بارے میں بتایا۔ جب مالیہ کانڈا پردیش کانگریس کا صدر تھا۔ اس نے بتایا کہ "صوبائی اسمبلی کے انتخاب کے لیے امیدواروں کی فہرست لے کر مَیں اور میرے ساتھی بمبئی آئے تاکہ بورڈ میں پیش ہوسکیں۔ بورڈ کی صدارت پٹیل کر رہا تھا۔ ابوالکلام آزاد بھی موجود تھا۔ مَیں نے بورڈ کو بتایا کہ یہ فہرست متفقہ طور پر منظور کی گئی ہے"۔ اس پر پٹیل نے مداخلت کرتے ہوئے کہا: "مجھے تمہارے اتفاق کا سب علم ہے۔" اس کے ساتھ ہی اس نے فہرست میں ترمیم شروع کر دی۔ مالیہ نے پٹیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "میں جانتا ہوں۔ پارلیمانی بورڈ فہرست میں ردوبدل کا مجاز ہے۔ مَیں اپنی فہرست واپس لیتا ہوں۔ آپ خود ہی فہرست تیار کرلیں۔ امیدوار کھڑے کریں۔ کانڈا میں آکر کیمپ لگائیں اور انتخابی مہم چلا کر انتخاب لڑیں" اور یہ کہہ کر مالیہ اجلاس سے نکل گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے رفقائے کار بھی اجلاس چھوڑ کر چلے گئے۔ اب پٹیل نے چند افراد کو بھیجا کہ ان کو منا کر لاؤ۔ مالیہ نے خود تو آنے سے انکار کر دیا۔ مگر اپنا ایک ساتھی بھیج دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ پٹیل کو اس طرح کی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر بورڈ نے مالیہ کی پیش کردہ فہرست کسی تبدیلی کے بغیر منظور کرلی۔ مالیہ نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ وہ خود تو امیدوار ہی نہیں اور نہ ہی اسے کوئی ذاتی غرض پوری کرنا ہے۔ لہٰذا وہ آمرانہ احکامات کی پابندی کیوں کرے۔ مالیہ نے مجھے بتایا کہ پٹیل کے متعلق بھارت میں یہ جو "مردِ آہن" کا تصور ہے یہ محض

ڈھکوسلا ہے وہ تو بس "اینٹے خان" تھا۔

تحریکِ آزادی کے دوران گاندھی جی اور پٹیل ریاستوں کے امور میں کانگریسیوں کی مداخلت کے خلاف تھے۔ درحقیقت پٹیل تو راجوں مہاراجوں سے دوستی گانٹھنا چاہتے تھے۔ ان دو "بڑوں" کی مخالفت کے باوجود نہرو نے ہندوستانی ریاستوں میں جمہوری حکومتوں کے قیام کی تحریک چلائی۔ راجوں اور مہاراجوں نے دیکھا کہ اگر اُن کے عوام ان کی حمایت نہ کریں تو ان کی حیثیت صفر کے برابر رہ جاتی ہے۔ لیکن اس طرح ریاستوں کا استحکام خطرے میں پڑ جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ راجہ ٹراونکور سر سی پی رام سوامی نے اپنی ریاست کو آزاد قرار دے کر پاکستان میں اپنا سفیر بھی نامزد کر دیا تھا اس پر ریاست کے لوگوں نے حملہ کر کے راجہ کو زدوکوب کیا اور اسے ریاست سے فرار ہونا پڑا۔

پٹیل نے وی۔ پی مینن کو راجوں وغیرہ کے معاملات نمٹانے کے لیے کھلے اختیارات دے رکھے تھے۔ اس سے صحت مند انتظامی روایات پر زد پڑی۔ پٹیل کے علم میں لائے بغیر ہی مینن نے بعض راجوں کے بھاری وظائف مقرر کر دیئے۔ وی پی مینن تو ماؤنٹ بیٹن کا آلہ کار تھا۔ بعد میں پٹیل نے اس بات کا اعتراف بھی کیا کہ اس سے پوچھے بغیر ہی مینن نے بعض راجوں کے بھاری وظائف مقرر کر دیئے تھے وزیرِ خزانہ جان متھائی "اشرفیاں لٹیں اور کوئلوں پر مہر" کے مصداق یہ سب دیکھتے رہے۔ ریاستوں کے متعلق کوئی معاملہ کابینہ یا وزیرِ اعظم کے علم میں نہ لایا گیا۔ پٹیل کو بھارت کا "مردِ آہن" اور "بسمارک" کہتے وقت ہمیں کچھ خیال کرنا چاہیئے۔

مَیں نے پہلے بھی کسی باب میں لکھا ہے کہ گجر شنکر باجپائی نے پٹیل سے شکایت کی تھی کہ مَیں نہرو کو متاثر کرتا ہوں اور یہ کہ میں سوشلسٹ ہوں۔ پٹیل کے لیے سوشلسٹ

یا کمیونسٹ کے الفاظ تو سانڈھ کے سامنے سرخ کپڑے والی بات تھے۔ اس وقت تک مجموعی طور پر پٹیل مجھے اچھا آدمی سمجھتا تھا۔ اگرچہ میں اسے کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ پٹیل نے ایک مرتبہ راجکماری امرت کور کو بتایا کہ نہرو کے قریب جتنے لوگ ہیں ان میں متھائی (مصنف) ایسا ہے جو ہمارے درمیان مشکلات پیدا نہیں کرتا۔ مگر میرے بارے میں "سوشلسٹ" کا لفظ سن کر پٹیل کے کان کھڑے ہو گئے۔ چنانچہ اس نے انٹیلی جنس کے سربراہ سنجیوی اور پریس ٹرسٹ آف انڈیا کے انچارج کے ایس۔ رام چندر سے میرے بارے میں تمام معلومات حاصل کرنے اور میرے سیاسی نظریات کا سراغ لگانے کو کہا۔ سنجیوی مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ سیدھا میرے پاس آیا اور پٹیل کی ہدایات کے بارے میں بتایا۔ اس نے کہا کہ وہ کوئی تحقیقات کرنا نہیں چاہتا اور دو ہفتے بعد "اوکے" رپورٹ ارسال کر دے گا۔ لیکن میں نے سنجیوی سے کہا کہ "تم وزیر صاحب کی ہدایات پر پورا پورا عمل کرو۔" رام چندر بھی میرے پاس آیا، وہ نہ صرف مجھے متنبہ کرنا چاہتا تھا بلکہ یہ کہہ کر ڈرانا بھی چاہتا تھا کہ پٹیل میرے بارے میں تحقیقات کرا رہا ہے۔ میں نے رام چندر سے کہا کہ میرا ایک کام کر دو، میرا یہ پیغام پٹیل تک پہنچا دو۔ پھر میں نے اُسے ایک سادہ کاغذ پر یہ الفاظ لکھ دیئے تاکہ وہ بھول نہ جائے اور میرے الفاظ من و عن پٹیل تک پہنچ جائیں۔ پیغام یہ تھا:

"سردار پٹیل کون ہے؟ میں اُسے جانتا نہیں۔ لیکن اگر وہ شخص جس کے ساتھ مجھے کام کرنے کا فخر حاصل ہے مجھے اپنے سیاسی اعتقادات کا اعلان کرنے کو کہے۔ تو میں نہ کہوں گا کہ میں صرف سوشلسٹ نہیں بلکہ کمیونسٹ ہوں۔"

رام چندر نے یہ پیغام پٹیل تک پہنچا دیا اور اگلے دن ہی سنجیوی کو پٹیل کی ہدایت ملی کہ میرے خلاف تحقیقات ختم کر دی جائے۔

حکومت میں شامل ہونے سے قبل میں نے ایک ایسا کام کیا تھا جس سے پٹیل کچھ ناراض ہو گیا تھا۔ ہوا یہ کہ پٹیل کے حکم سے رام منوہر لوھیا کو گرفتار کر کے جیل پہنچا دیا گیا۔ میرے دل میں ان دنوں لوھیا کی کچھ عزت تھی۔ میں جیل میں اس سے ملنے گیا اور ساتھ کچھ آم بھی لے گیا۔ پٹیل نے نہرو سے شکایت کی اور نہرو نے مجھ سے کہا تو میں نے جواب دیا کہ اگرچہ میں حکومت میں شامل نہیں تاہم اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے اگر آپ کے لیے کوئی مشکل پیدا ہوتی ہے تو آئندہ اس کا اعادہ نہیں ہوگا۔

۱۹۵۰ء کی دوسری ششماہی میں پٹیل نے "شدھ ہندی" ہندو ثقافت کے حامی اور کٹر رجعت پسند پرشوتم داس ٹنڈن کو کانگریس کی صدارت کے لیے تجویز کر دیا۔ نہرو نے اس تجویز کی مخالفت کی تو پٹیل اڑ گئے اور اس بات پر نہرو سے ناراض ہو گئے کہ نہرو کانگریس کے معاملات میں رفیع احمد قدوائی اور دوسرے لوگوں کی بات کو پٹیل کی بات پر وقعت دیتے ہیں۔ نہرو کسی دوسرے امیدوار کا نام پیش کر کے اختلافات کی راہ نہیں کھولنا چاہتے تھے۔ لیکن رفیع احمد قدوائی، مرد ولا سارا بائی اور بعض دوسرے اصحاب نے اچاریہ کرپلانی کو کانگریس کے صدر کا انتخاب لڑنے پر رضامند کر لیا۔ نہرو ان باتوں سے الگ تھلگ رہے۔ کیونکہ وہ کانگریس میں دھڑے بندی یا خود کو کسی ایک دھڑے سے منسوب کرنا سخت ناپسند کرتے تھے۔ پٹیل نے مہم شروع کر دی اور صوبوں کے وزرائے اعلےٰ سے مسلسل ٹیلی فون پر ٹنڈن کے حق میں راہ ہموار کرنے لگے۔ بالآخر مقابلہ ہوا۔ ٹنڈن ۱۴ ووٹوں کی اکثریت سے جیت گیا۔ اگر نہرو اپنی پسند و ناپسند کا اظہار کھلے عام کر دیتے تو ٹنڈن پٹیل کی حمایت کے باوجود بری طرح ہارتا۔ ناسک میں کانگریس کا اجلاس ہوا۔ جہاں نہرو نے دو تین زبردست تقریریں کیں۔ اس کے بعد ٹنڈن اور ان کے ساتھیوں نے جتنی بھی قراردادیں پیش کیں وہ سب نامنظور ہو گئیں۔ پٹیل اس اجلاس میں شریک نہیں تھا وہ ناسک میں موجود تھا اور برلا ہاؤس میں ٹھہرا ہوا تھا

ولبھ بھائی پٹیل کا انتقال ۱۵ر دسمبر ۵۰ء کو بمبئی میں ہوا۔ کیا پٹیل نے اپنی زندگی میں کبھی یہ سوچا تھا کہ نہرو کو معزول کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا جائے؟ میرا جواب تو نفی میں ہے۔ پٹیل یہ کبھی نہ بھولا کہ نہرو گاندھی کا نامزد جانشین ہے۔ اس نے متعدد لوگوں سے بھی وقتاً فوقتاً کہا:

"میں یہ کبھی فراموش نہیں کر سکتا کہ جواہر لال باپو کا منتخب شخص ہے۔"

پٹیل کو اس بات کا بھی پوری طرح علم تھا کہ عوام کی تائید اُسے نہیں، نہرو کو حاصل ہے۔ اس یقین کے ساتھ پٹیل نے ایسٹ ویسٹ بنگال کے بحران پر لیاقت نہرو پیکٹ کی زبردست حمایت کی اور کلکتہ جا کر اس معاہدہ کے حق میں تقریریں کیں۔ حالانکہ وہ اس معاہدے کا حامی نہ تھا اور اس طرح اس نے مثالی تدبر اور دانشمندی کا ثبوت دیا۔ جس کی نہرو اکثر تعریف کیا کرتے تھے۔ نہرو نے ۱۰ر اگست ۵۱ء کو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد مولانا آزاد نے بھی استعفیٰ پیش کر دیا۔ ٹنڈن نے یہ صورتِ حال دیکھی تو تاڑ گیا اور فوراً کانگریس کی صدارت سے الگ ہو گیا۔ اس نے اپنے بیان میں کہا کہ "نہرو قوم کا نشان ہے۔" اس کے بعد نہرو کو کانگریس کا صدر منتخب کر لیا گیا۔

باب ۴۶

اندرا

دو ضرب الامثال ملاحظہ فرمایئے:-

۱۔ جب مرغی بانگ دیتی ہے تو یہ ایک سلطنت کے خاتمے کا اعلان ہوتا ہے

——— (چینی ضرب المثل)

۲۔ جب مرغی بانگ دیتی ہے تو قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔

——— (ملیالی ضرب المثل)

آج سے اکتیس سال قبل اندرا نے مجھ پر اپنا جو پہلا تاثر چھوڑا تھا وہ یہ تھا کہ اندرا "خود پسند" ہے۔ ملکہ وکٹوریہ نے اپنے نوجوان وزیر خزانہ ڈسرائیلی کے بارے میں وزیر اعظم ڈربی سے کہا تھا:

"میں نے وزیر خزانہ کے سرکاری کاغذات ملاحظہ کیے ہیں۔ وہ خود پسند معلوم ہوتا ہے۔"

لارڈ ڈربی نے عرض کیا:

"ملکہ عالیہ ہر شخص کو خود پسندی کا حق حاصل ہے تا آنکہ وہ کامیابی سے ہمکنار ہو جائے۔"

اندرا کے معاملے میں خود پسندی کا جذبہ کامیابی کے ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ میری عادت ہے کہ نہرو جو کچھ بھی لکھتے ہیں، میں اس کی نقل ضرور رکھتا ہوں۔ پھر اہم تاروں اور اہم

دستاویزات کی نقول بھی محفوظ کی جاتی ہیں۔ نہرو کی غیر رسمی سی اجازت کے تحت میں یہ سب نقول اندرا کو مطالعہ کے لیے دے دیتا ہوں۔ اس سے اس کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور کسی تقریب یا دعوت میں وہ ان غیر ملکی معززین سے بہتر طور پر بات چیت کر سکتی ہے۔ جو روایتی طور پر اس کے دائیں بائیں بیٹھے ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے عملے کے دو پی اے بھی اندرا کے کام کے لیے مخصوص کر رکھے ہیں۔ ایوانِ وزیر اعظم کی میزبان کی حیثیت سے اُسے خاصا کام ہوتا ہے۔ میں اپنا کام نہرو جی کے پی اے سے کروا لیتا ہوں۔

اندرا کو چھوٹی کاروں سے نفرت ہے۔ جب ہندوستان موٹرز نے پہلی کار بنائی تو نہرو نے مجھ سے کہا کہ ان کی بیوک کار سے گلو خلاصی کرائی جائے اور ان کے لیے ایک ملکی کار خرید لی جائے۔ میں نے جلد ہی وزیر اعظم کی خواہش پوری کر دی۔ اندرا نے جب چھوٹی سی "ہندوستانی" کار دیکھی تو اس نے محسوس کیا کہ بیوک تو گئی وہ غصے سے اُبلنے لگی اور اس نے ایک ہفتے تک مجھ سے کلام نہ کیا۔ اندرا کو اپنے پتا جی سے مستقل شکایت تھی کہ کھانا کھاتے وقت اگر وہ دونوں ہی ہوں تو وہ بہت کم بات چیت کرتے ہیں اور سوالوں کا تسلی بخش جواب بھی نہیں دیتے۔ میں نے اندرا کو مشورہ دیا کہ کھانے کے دوران بھاری بھرکم قسم کی باتیں نہ کیا کرو بلکہ ہلکے پھلکے انداز میں پتا جی کو دلچسپ قصے یا لطیفے سنایا کرو تاکہ وہ خوب ہنسیں۔ مگر اس نے میرے مشورے پر کبھی عمل نہیں کیا۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ وہ لکھ کر بتائے کہ آیا ہفتے میں دو بار وہ علیحدگی میں اپنے پتا سے بات چیت کرنے کی خواہش مند ہے۔ ایسا انتظام کیا جا سکتا تھا مگر اس نے مجھے سوالات شروع کر دیئے۔

"پاپو تمہیں تو ہر بات کا قطعی اور دو ٹوک جواب کیوں دیتے ہیں۔"

ایک بار اندرا نے گلہ گیر لہجے اور آنسوؤں بھری آنکھوں سے مجھے بتایا کہ:

"جب میں جوان تھی اور انگلستان میں تعلیم حاصل کر رہی تھی تو پتا جی مجھے اس طرح رکھتے تھے کہ بعض اوقات مجھے فاقے کرنے پڑتے تھے۔"

دراصل یہ بھی باپو کے خلاف ہی اندرا کی شکایت تھی۔

ایک روز اندرا اپنے دونوں بچوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"اگر کبھی وقت آیا تو میں ملک کے مفاد کی خاطر اپنے ان دونوں بچوں کو چٹان سے ٹکرانے میں بھی دریغ نہیں کروں گی۔"

اس پر مجھے غصہ آگیا اور میں نے کہا:

تم تصورات کی دنیا میں رہتی ہو۔ بچپن میں تمہاری گڑیاں برطانوی فوج سے لڑ کر اسے شکست دیتی تھیں۔ نوعمری میں تم ہندوؤں کی فوج کی بریگیڈیر تھیں۔ نوجوانی میں تم خود کو "جون آف آرک" سمجھتی تھیں۔ اور اب تم لیڈی میک بیتھ بن بیٹھی ہو۔ اگر تم دیہات میں جا کر کھیتوں سے چوہے پکڑو اور انہیں چٹانوں پر دے مارو تو ملک کے مفاد کی زیادہ خدمت کر سکو گی۔"

یہ کہہ کر میں چلتا بنا۔

فنونِ لطیفہ کے ضمن میں اندرا کی پسند مضحکہ خیز تھی۔ جیکولین کینیڈی جب ایوان وزیر اعظم میں مہمان ٹھہریں تو اندرا نے بھاری سرکاری رقم صرف کر کے ایک فن پارہ بنوایا۔ یہ لکڑی پر کام کیا ہوا تھا۔ جسے دیکھ کر ہول آتا تھا۔ اب یہ بات تعجب خیز ہے کہ جیکولین رات کو ڈراؤنے خواب دیکھے بغیر کمرے میں کس طرح سوئی۔ مگر اندرا کو وُہ ہولناک تصویر بڑی پسند تھی۔ خروشچیف نے ایک بار بالکل سچ کہا تھا:

"جدید آرٹ تو خچر کی دم کی تخلیق معلوم ہوتا ہے۔"

لال بہادر شاستری کی سفارش پر کانگریس کے صدر یو۔این دھیبر نے اندرا کو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی میں نامزد کر دیا۔ نہرو کو اُس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ۱۹۵۹ء میں اندرا کانگریس کی عبوری صدر منتخب ہوئی۔ مگر اس میں بھی جواہر لال نہرو کا ہاتھ نہ تھا۔ بلکہ یہ کامراج کی تجویز پر ہوا تھا۔ نہرو تو خاموش تماشائی تھے۔ انہوں نے نہ تو اس کی حوصلہ افزائی کی اور نہ حوصلہ شکنی۔ حیدر آباد سے واپسی پر انہوں نے مجھے یہی بتایا تھا۔ تاہم مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ اندرا کے اس اعزاز پر وہ خوش ضرور تھے۔ اگلی صبح میں نے دیکھا کہ وزیر اعظم کے مطالعہ کے کمرے سے سونے کے کمرے کو جانے والی راہداری میں موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو اور اندرا کی تصاویر کارنس پر ساتھ ساتھ پڑی ہیں۔ میں ان تصاویر کو دیکھ ہی رہا تھا کہ وزیر اعظم اور اندرا ناشتہ کر کے باہر نکلے وزیر اعظم نے مجھ سے پوچھا:

"اتنی غور سے کیا دیکھ رہے ہو؟"

میں نے تصاویر کی طرف اشارہ کیا اور کہا:

"باپ، بیٹا اور پوتر بھوت"

اس پر نہرو نے قہقہہ مارا اور اندرا بھی ہنسنے لگی۔

نہرو نے صرف دو بار میرے سامنے اندرا کی شکایت کی۔ پہلی بار اس وقت جب اندرا نے سعودی عرب کے شاہ کی طرف سے ملنے والا ایک قیمتی نیکلس کافی دیر اپنے پاس رکھا اور قانون کے مطابق، حکومت کے حوالے نہ کیا۔ نہرو بے حد غصے میں تھے وہ مجھ سے بولے:

"دوسری خواتین کی طرح اندرا میں بھی احساس ملکیت بہت زیادہ ہے"

میں نے انہیں کہا:

"اصل بات یہ ہے کہ اندرا کو بچپن سے تحفظ نہیں ملا۔ اب بھی وہ تحفظ

چاہتی ہے۔ مجھے علم نہیں کہ مستقبل کے خزانوں میں اس کے لیے کیا ہے مگر اس کی تمام زندگی پر عدم تحفظ کا احساس چھایا رہے گا اور اس کی حرکات اسی احساس کے تابع ہوں گی۔"

وزیر اعظم نے میری باتوں کو نہایت غور سے سنا۔ وہ غمگین ہو گئے۔ اندرا سے ان کو بے حد پیار تھا۔ کافی عرصہ بعد جب اندرا وزیر اعظم بن گئی تو اسی نیکلس کے بارے میں رام منوہر لوہیا نے پارلیمنٹ میں سوال کیا۔ جس کا مقصد اندرا کو مطعون کرنا تھا۔ مرارجی ڈیسائی نے جو نائب وزیر اعظم اور وزیر خزانہ بھی تھے۔ اس سوال کا جواب دیا۔ مرارجی نے کہا کہ یہ نیکلس پنڈت نہرو کے قبضے میں ان کے سیف میں تھا۔ یہ بات بالکل غلط تھی۔ نہرو کا تو کوئی سیف تھا ہی نہیں۔ ایوان وزیر اعظم میں نہرو کا جو دفتر تھا اس میں کوئی سیف نہ تھا۔ البتہ یہاں ایک چھوٹا سا کیش بکس ضرور تھا۔ مگر یہ نیکلس اس میں رکھا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ ایوان وزیر اعظم میں صرف ایک سیف تھا۔ یہ سیف میں نے اندرا کی فرمائش پر لگا دیا تھا تاکہ وہ اپنے زیورات وغیرہ اس میں رکھ سکے۔ اس کی دونوں چابیاں اندرا کے پاس ہی رہتی تھیں۔

دوسری بار نہرو اندرا سے اس وقت ناراض ہوئے جب اس نے امریکہ جاتے ہوئے ہانگ کانگ میں ایک احمقانہ بیان جاری کر دیا۔ اندرا لیکچر ٹور پر امریکہ جا رہی تھی۔ جس کے لیے اس نے مختلف لوگوں سے لاتعداد تقریریں لکھوائی تھیں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ یہ ۱۹۶۳ء کا واقعہ ہے۔ نہرو سخت علیل تھے اور اندرا انہیں بیماری کے عالم میں ہی چھوڑ کر امریکہ چلی گئی تھی۔ اندرا کے جاتے ہی نہرو کی حالت اور خراب ہو گئی۔ مجھے اس صورت حال کو سنبھالنے کے لیے ایوان وزیر اعظم جانا پڑا۔ میں نے ڈاکٹر بی سی رائے کو فون کیا۔ وہ دوسرے روز آ گیا۔ اس نے دوسرے سرکاری ڈاکٹروں کی مدد سے نہرو کا علاج شروع کیا۔ ایک روز میں اور نہرو

کمرے میں اکیلے تھے کہ نہرو نے مجھے ہانگ کانگ میں اندرا کے بیان کے بارے میں بتایا۔ وہ ناراض تھے۔ اندرا نے کہا تھا:

"میرے والد نے مجھے وزیر خارجہ کے طور پر کابینہ میں شمولیت کی دعوت دی ہے۔"

نہرو نے کہا کہ میں نے اندرا کو ایسی کوئی پیش کش نہیں کی، مگر میرے ذہن میں ایک خیال ضرور تھا اور اندرا کی موجودگی میں اس خیال پر میں اونچی آواز میں غور بھی کرتا رہا۔ مگر غور و خوض کے بعد میرا فیصلہ یہ ہے کہ میں اسے کبھی اپنی کابینہ میں نہیں لے سکتا۔"

نہرو کی وفات کے بعد اندرا نے اپنے پتاجی کی وصیت پر کوئی عمل نہ کیا بلکہ ان کی خواہشات کے برعکس قدم اٹھائے۔ نہرو نہیں چاہتے تھے کہ ان کی موت کے بعد کسی بھی قسم کی مذہبی رسومات ادا کی جائیں، مگر اندرا نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ کانگریس پارلیمانی پارٹی نے محض ایک وجہ سے اندرا کو لال بہادر کے جانشین کے طور پر منتخب کیا کہ وہ نہرو کی بیٹی ہے۔ دراصل یہ نہرو کو ایک طرح کا خراج عقیدت تھا۔ انتخاب سے ایک روز قبل ایک وزیر میرے پاس آیا اور مجھے بتایا کہ اس نے مرارجی ڈیسائی سے کہا ہے کہ وہ پارلیمانی پارٹی کے لیڈر کا انتخاب نہ لڑیں اور کسی نوجوان کو آگے آنے کا موقع دیں۔ اس نے مزید کہا:

"تم اندرا کو کسی اور سے زیادہ جانتے ہو۔ تمہاری کیا رائے ہے؟"

میں نے اسے کہا:

"تم جاؤ اور ووٹ اپنی مرضی اور ضمیر کے مطابق استعمال کرو، پھر مجھ سے بات کرنا۔"

ووٹنگ کے بعد وہ وزیر سیدھا میرے پاس آیا اور پوچھا:

"تمہاری اب کیا رائے ہے۔"

میں نے جواب دیا:

"مجھے کوئی شبہ نہیں کہ اندرا منتخب ہو جائے گی۔ اس لیے کہ اس کے پس منظر میں جواہر لال نہرو کی عظمت کی پرچھائیاں لہرا رہی ہیں۔"

پھر اس نے پوچھا:

"تمہارے خیال میں وہ کس طرح کی وزیر اعظم ہو گی۔"

میں نے کہا:

وہ اس تباہی میں کتنا وقت صرف کرے گی۔

"میں نہیں بتا سکتا۔ اس میں غیر فرقہ وارانہ نقطہ نظر کے سوا اپنے والد کی کوئی خوبی نہیں۔ اس کی سیاست مختلف نوعیت کی سیاست ہو گی۔ اس کی بنیاد جوڑ توڑ، دھڑے بندی اور دھوکہ دہی پر رکھی جائے گی وہ اپنی ذات کے سوا کسی کی وفادار نہیں ہو گی۔ چونکہ وہ ضمیر کے بوجھ سے آزاد ہے۔ اس لیے وہ کوئی بھی کام کر سکتی ہے۔ وہ کامراج اور دوسرے لوگوں کے ساتھ جنہوں نے اس کی حمایت کی ہے۔ ایسا سلوک کرے گی کہ وہ حیران و پریشان رہ جائیں گے۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اس کی فطرت میں پاگل پن کا عنصر بھی موجود ہے۔ وہ لوگوں پر کلہاڑا چلانے میں گلیڈسٹون کو بھی مات کرے گی اور تمہاری باری جلد آ جائے گی۔ وہ سوشلزم کے نفاذ کا دعویٰ کرے گی۔ حالانکہ وہ اس پر یقین ہی نہیں رکھتی اور نہ ہی اس کے معنی سمجھتی ہے۔ جب کبھی ملک کو کوئی سنگین بحران درپیش ہوا، وہ خود کوئی فیصلہ نہیں کر سکے گی بلکہ دوسروں کے ہاتھ

میں کھلونا بن کر رہ جائے گی۔ اگر یہ لوگ بھی دیانت دار اور بیباک نہ ہوئے تو بس کام تمام ہو چکا۔ فی الحال میں اتنا ہی کہوں گا۔"

"میری باتوں سے یہ وزیر مبہوت ہو کر رہ گیا اور بولا کہ تم نے جو کچھ کہا ہے۔ میں اُسے ضبط تحریر میں لا کر اپنے پاس رکھوں گا تاکہ مستقبل کے واقعات کا اس سے موازنہ کیا جا سکے۔"

اندرا کے دور حکومت میں بعض غیر صحت مندانہ رجحان واضح ہوئے جو یہ ہیں۔

۱۔ اندرا ایسے سول ملازموں، ایسی عدلیہ اور ایسے پریس کی داعی تھی جو برسر اقتدار پارٹی کے حامی ہوں۔

۲۔ وہ معمولی معمولی باتوں پر دہلی میں "عوامی اجتماعات" منعقد کراتی تھی۔ ان اجتماعات اور مظاہروں کے لیے دہلی، ہریانہ، پنجاب اور راجستھان کی حکومتیں مظاہرین بھجواتیں اور یہ سب حکومت کے خرچ پر کیا جاتا تھا۔ بازاری قسم کے یہ اجتماعات منعقد کرنے کے لیے آدمی ہر وقت اس طرح موجود رہتے تھے جیسے فوراً تیار ہونے والی کافی کا مسالہ۔ ان لوگوں کو باقاعدگی سے معاوضہ ملتا تھا۔ اور سرکاری ٹرانسپورٹ فراہم کی جاتی تھی۔

۳۔ اُس نے کابینہ کو بے وقعت افراد کا ٹولہ بنا دیا۔ جن کی اپنی الگ کوئی حیثیت نہیں تھی۔

۴۔ وہ ضرورت کے وقت بھارت کی کمیونسٹ پارٹی سے عشق بازی کرتی اور جب سیاسی طور پر مناسب سمجھتی اسے دھتکار دیتی اور

۵۔ اس نے چپراسیوں کے سوا تمام افسروں کو "خفیہ محرر" بنا دیا۔ حکومت کے حامی سول افسر کا ایک نمونہ پی این ہسکر ہے اُسے وزارت خارجہ میں معمولی درجے کے افسر کے طور پر تھوڑا سا تجربہ تھا۔ وہ نظم و ضبط اور غیر جانبداری کے جذبے سے

بالکل عاری تھا جو کسی سول افسر میں ہونا لازمی ہے مگر اُسے پارٹی کی سیاست چلانے کی کھلی چھٹی دے دی گئی۔ حالانکہ اس کے لیے بھی وہ انتہائی نااہل اور نکما ثابت ہوا۔

میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ کابینہ میں شامل وزراء اور بعض دوسرے عمال حکومت جنہیں عوامی زندگی کا کافی تجربہ بھی تھا۔ کس طرح بالشتیے، خوشامدی اور محض ہاں میں ہاں ملانے والے بن گئے۔ ایک نے تو یہ کہہ کر خود کو گدھا ثابت کر دیا کہ:

"اندرا انڈیا ہے اور انڈیا اندرا ہے۔"

جبکہ دوسرے دو جو خود کو بڑے سیاست دان کہتے ہیں۔ اندرا کے دونوں طرف بیٹھے مسخروں کی طرح تالیاں بجاتے رہے۔ اسی مسخرے نے سنجے کو شنکر اچاریہ سے تشبیہ دی۔ ایک اور مسخرے نے ہانک لگائی:

"اندرا پر جو بیتے گی وہ انڈیا پر بیتے گی۔"

اندرا نے اپنے اردگرد کسی ہائی سکول کے غبی بچوں کو جمع کر رکھا تھا۔

اب اپوزیشن کو لیجئے۔ جن سنگھ کے رہنما اٹل بہاری باجپائی نے جب سنا کہ ڈھاکہ فتح ہو گیا ہے تو اس کے پاؤں تلے زمین نکل گئی اور وہ چلانے لگا

"اندرا درگا ہے۔"

حالانکہ بنگلہ دیش میں بھارت نے جو کچھ کیا وہ محض ایک فوجی آپریشن تھا اور اُس کے لیے کسی درگا ماتا یا بھدرا کالی کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے امید ہے کہ مسٹر باجپائی اب بھارت کے وزیر خارجہ کی حیثیت سے توازن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑیں گے۔ یوپی کے وزیر اعلیٰ تیواڑی نے تو کمال ہی کر دیا۔ اس نے سنجے کو "کرشنا کا روپ" قرار دیدیا۔

اندرا کے خلاف الہ آباد ہائی کورٹ نے جب فیصلہ سنایا تو دو صحافیوں ایس ملگوکر اور بی جی ورگیش نے اپنے اخبارات میں اداریے لکھے۔ دونوں کا نفس مضمون

تقریباً یکساں تھا اور ان کا عنوان "اب جانے کا وقت آگیا ہے" تھا۔ مگر ان دونوں کو جلد ہی پتہ چل گیا کہ خود ان کے جانے کا وقت آگیا تھا۔ یہ تو تھی اندرا کی پریس کی آزادی، اندرا نے مشہور صحافی ڈیوڈ فروسٹ سے ایک انٹرویو میں کہا ہے:

"میں نے اقتدار سے الگ ہو کر یک گونہ اطمینان محسوس کیا ہے۔ جب
میں نے انتخاب میں اپنی شکست کی خبر سنی تو مجھے یوں محسوس ہوا گویا
میرے کندھوں سے کوئی چٹان ہٹا دی گئی ہو۔"

مگر میں نہیں مانتا کہ اندرا نے جو کچھ کہا ہے اس کا مطلب بھی یہی ہے۔ اگر ایسا ہی تھا تو جب الٰہ آباد ہائی کورٹ نے فیصلہ سنایا تھا تو وہ حکومت چھوڑ کر "یک گونہ اطمینان" حاصل کر سکتی تھی۔ اس طرح نہ صرف اس کے وقار میں اضافہ ہوتا۔ بلکہ اس کے تمام گناہ بھی معاف ہو جاتے۔ میرے خیال میں حکومت سے استعفا نہ دینا اندرا کی سنگین ترین غلطی تھی۔ کیونکہ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ حکومت سے چمٹی رہی پھر بددیانت ناپختہ اور بونے افراد اور ایک خام کار نوجوان نے اس کی باگ ڈور سنبھال لی۔ اور اس کے بعد وہ غلطیوں کی مشین بن کر رہ گئی۔

اہلیت، بے خوفی، دور اندیشی اور ادراک اور سب سے بڑھ کر وزارت سے مستعفی ہونے کا حوصلہ کسی وزیر کا طرہ امتیاز ہونا چاہیئے۔ اندرا نے جب کابینہ کی منظوری کے بغیر ملک میں ہنگامی حالت نافذ کی تھی۔ اگر اس وقت تمام وزیر مستعفی ہو جاتے تو ہنگامی حالت چند روز میں ختم ہو جاتی۔ مگر یہ ٹولہ ایک قومی بحران کے موقع پر اپنے فرض سے عہدہ برآ ہونے میں ناکام رہا۔ وہ اور پارلیمنٹ میں ہنگامی حالت کی حمایت کرنے والے بزدلوں کا ٹولہ عوامی نمائندگی کے حق سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو چکا ہے۔ جب تک یہ لوگ موجود ہیں۔ کانگریس کے لیے ملک میں کوئی موقع نہیں۔ کانگریس کو ققنس کی طرح اپنی آگ میں جل جانا چاہیئے تاکہ اس کی راکھ

سے ایک نئی کانگریس پیدا ہو جو ملک کو نئی قیادت اور نئی امنگوں سے ہمکنار کر سکے۔

۲۵ رجون ۷۵ء کو جب ہنگامی حالت کا اعلان ہوا۔ میرے وزیر دوست نے مجھے فون کیا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں سنگین معاملات کے بارے میں فون پر بات نہیں کیا کرتا اور فون بند کر دیا۔ شام کو وہ مجھے ملنے آیا۔ اس کے پاس ایک ڈائری تھی جس میں وہ تمام باتیں لکھی تھیں جو میں نے دس سال قبل اندرا گاندھی کے بطور وزیر اعظم انتخاب کے موقع پر کہی تھیں۔ اس نے کہا:

"واقعی اندرا نے ملک کو تباہ کر دیا ہے۔"

میں نے کہا کہ ابھی تو ابتداء ہے۔ اب وہ پارٹی اور اپنی ذات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے کے درپے ہے۔ وہ اب زیادہ دیر حکومت نہیں کر سکے گی۔ مجھے تو اس بات کی تشویش ہے کہ کانگریس کی جگہ آئندہ ملک کا حکمران کون بننے والا ہے۔

باب ۴۷

مرارجی ڈیسائی

کئی سال گزرے ایک اتوار کو میں ایک دوست کے ساتھ قطب مینار گیا۔ اس نے مجھ سے مرارجی ڈیسائی کے بارے میں دریافت کیا۔ تو میں نے لوہے کی ایک لاٹھ کی طرف اشارہ کر کے کہا:

"اگر تم اس لاٹھ کو گاندھی ٹوپی پہنا دو تو یہ مرارجی ڈیسائی ہے۔ مرارجی کا جسم اور ذہن دونوں بالکل سیدھے ہیں۔"

نہرو نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ:

"میں زندگی میں جن دو کھرے افراد سے ملا ہوں، وہ مرارجی ڈیسائی اور پرُشوتم داس ٹنڈن ہیں۔" میرے دل میں مرارجی کے لیے عزت و احترام تقسیم ملک کے دنوں میں پیدا ہوا۔ جب انہوں نے بمبئی میں مسلمانوں کا ڈٹ کر تحفظ کیا۔ ان دنوں وہ بمبئی کے وزیر داخلہ تھے اور وزیر اعلیٰ بی جی کھر نے انہیں پوری آزادی عمل دے رکھی تھی۔ مرارجی نے یہ مشکل کام بے مثال مہارت اور پورے اعتماد کے ساتھ کیا۔ اس معاملے میں کوئی دوسرا کانگریسی لیڈر جن میں پنت بھی شامل تھا مرارجی کے ہم پلہ نہ تھا۔ میرے دل میں ان کا یہ احترام ہمیشہ قائم رہا۔

نہرو مرارجی کی کارکردگی سے بے حد متاثر تھے۔ ۱۹۵۰ء کے عام انتخابات میں

جب مرارجی کے صوبائی انتخاب ہارنے کی خبر ملی تو نہرو تلملا اُٹھے۔ انہوں نے اعلان کیا:

"مرارجی ایک فاتح پارٹی کے فاتح لیڈر ہیں۔"

مرارجی کو بمبئی کا وزیر اعلیٰ مقرر کر دیا گیا اور پھر وہ ضمنی انتخاب میں اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ نہرو نے ۱۹۵۶ء میں مرارجی کو مرکزی کابینہ میں شامل کر لیا اور انہوں نے ۱۴ نومبر کو حلف اٹھایا۔ پنت بھی مرکز میں وزیر داخلہ مقرر ہو چکے تھے۔ مرارجی کے کابینہ میں آنے کے چند روز بعد رکن پارلیمنٹ یو۔ ایس مالیہ جو کانگریس پارلیمانی پارٹی کا ڈپٹی چیف وہپ بھی تھا میرے پاس آیا اور بولا:

"مرارجی چاہتے ہیں کہ کابینہ میں ان کی حیثیت پنت کے بعد تیسرے نمبر پر ہو۔"

میں نے وزیر اعظم سے اس کا ذکر کیا تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔ جب میں نے پنت جی کی مثال پیش کی جو بعد میں آ کر نمبر دو مقرر ہوئے تھے تو انہوں نے اظہار رضامندی کر دیا۔ چنانچہ میں نے کیبنٹ سیکرٹری کو ضروری ہدایات جاری کر دیں۔ مرارجی جب وزیر خزانہ تھے تو ایک دن انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ بمبئی کی وفاقی حیثیت کو ختم کر کے اُسے مہاراشٹر میں شامل کرنے کے حق میں نہیں ہیں اگر ایسا کیا گیا تو وہ نہ صرف وزارت سے مستعفی ہو جائیں گے بلکہ سیاست چھوڑ کر گھر چلے جائیں گے۔ میں بے یقینی سے مسکرایا اور بولا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ وہ مستعفی نہیں ہوں گے اور ان کے سیاست چھوڑنے کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مرارجی بھی دوسرے سیاست دانوں کی طرح اپنے الفاظ ہضم کرنے کی عادت سے مبرا نہیں۔ یعنی وہ جو کہتے ہیں۔ اس سے مکر بھی جاتے ہیں۔

مرارجی میں گاندھی کی عظمت کے سوا تمام عادات ہیں۔ پھر وہ ضدی اور

جذبات سے عاری ہیں۔ موتی لال نہرو نے کانگریس کے نظم وضبط کے پیش نظر مے نوشی ترک کر دی تھی۔ بعد میں جب وہ بیمار ہوئے تو ان کے ڈاکٹروں نے انہیں شراب نوشی کی اجازت دے دی۔ مگر بڈھے نے پینے سے انکار کر دیا۔ اس پر ڈاکٹر بی سی رائے نے گاندھی جی سے بات کی۔ گاندھی جی نے موتی لال نہرو سے کہا کہ وہ ضد نہ کریں اور مے نوشی شروع کر دیں تو وہ مان گئے۔ مگر میرا خیال ہے اگر موتی لال کی جگہ مرارجی ہوتے تو وہ اپنی ہٹ سے باز نہ آتے۔ ایک بار برطانوی وزیر اعظم ہیرالڈ میکمیلن دہلی آئے تو برطانوی ہائی کمشنر نے ان کے اعزاز میں دعوت دی۔ نہرو اس دعوت میں مہمان خصوصی تھے۔ مرارجی ڈیسائی بھی مدعو تھے۔ میں بھی موجود تھا۔ میں نے دیکھا کہ دعوت میں شریک ہر مہمان پھلوں کے رس کا جام اٹھائے پھر رہا ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ مرارجی نے شرط لگادی ہے کہ جس دعوت میں وہ شریک ہوں گے۔ وہاں مے نوشی نہیں کی جا سکے گی۔ میں اس سے زیادہ نامعقول بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ مرارجی اس دعوت میں مہمان خصوصی نہیں تھے۔ پھر بین الاقوامی قانون کے مطابق سفارت خانے یا ہائی کمشن بھارت کا حصہ تصور نہیں ہوتے۔ برطانوی باشندے مرارجی کی اس شرط پر بڑے جز بز ہوئے۔ انہوں نے شراب کا اہتمام ایک ملحقہ کمرے میں کر لیا اور کھانا جان بوجھ کر کافی دیر سے شروع کیا گیا۔

دو واقعات ایسے رونما ہوئے۔ جن سے نہرو نے اندازہ لگایا کہ مرارجی لوگوں کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے کبھی اپنی ہٹ میں نرمی پیدا کرنے کی صلاحیت سے عاری ہیں۔ پہلا واقعہ سونے پر کنٹرول کے بل کی منظوری کے دوران پیش آیا۔ لوک سبھا میں ارکان نے مطالبہ کیا کہ اٹارنی جنرل کو ایوان میں طلب کر کے بل پر ان کی رائے لی جائے۔ مرارجی اس پر بھنا اٹھے اور بولے کہ اگر سارا ایوان بھی کہے تو میں اٹارنی جنرل کو نہیں بلاؤں گا۔ چنانچہ نہرو کو ان کی بات مسترد کر کے فیصلہ دینا پڑا اور اٹارنی جنرل کو ایوان

میں بلایا گیا۔ دوسرا واقعہ راجیہ سبھا میں رونما ہوا جہاں مرارجی نے حکومت کے کسی اقدام کی حمایت میں گاندھی جی کا نام لیا۔ اس پر راج کماری امرت کور جو گاندھی جی کو مرارجی سے زیادہ جانتی تھیں کھڑی ہو گئیں اور بولیں:

"اگر آج باپو زندہ ہوتے تو مرارجی کے اس اقدام کو ناپسند کرتے۔"

مرارجی نے اس پر درشت زبان میں جواب دیا اور راج کماری کو "مس میو" کہہ کر مخاطب کیا۔ اس پر نہرو سخت ناراض ہوئے۔ پنت کی موت کے بعد مرارجی کو ہی پارلیمانی پارٹی کا ڈپٹی لیڈر بننا تھا۔ ان دنوں میں سرکاری طور پر نہرو کے ساتھ کام نہیں کر رہا تھا۔ نہرو نے دیکھا کہ ارکان پارلیمنٹ کی بڑی تعداد مرارجی کی مخالف ہے۔ پارٹی کا ایک گروہ ڈپٹی لیڈر کے عہدے کے لیے جگ جیون رام کو آگے لانا چاہتا تھا پارٹی کے ارکان کے عزائم دیکھ کر نہرو نے تجویز پیش کی کہ کانگریس پارلیمانی پارٹی کے آئین میں ترمیم کر دی جائے اور ایک کے بجائے دو ڈپٹی لیڈر منتخب کیے جائیں۔ ایک لوک سبھا کے لیے اور دوسرا راجیہ سبھا کے لیے۔

چین سے جھڑپوں کے دوران بعض افراد خصوصاً اندرا نے نہرو کو مرارجی ڈیسائی سے بدظن کر دیا۔ ان لوگوں نے ڈیسائی پر نہرو کے خلاف سازباز کا الزام لگایا۔ حالانکہ مرارجی ایسے انسان ہیں۔ جو اتنی گھٹیا حرکت کر ہی نہیں سکتے۔ وہ اتنے بے باک ہیں کہ وہ علی الاعلان ایسا کرتے۔ مجھے یہ حقیقت ذاتی طور پر معلوم ہے کہ کانگریس میں دھڑے بندی سے قبل جب اندرا کی پوزیشن ڈانواں ڈول تھی، اندرا کی کابینہ کا ایک اہم وزیر مرارجی ڈیسائی کے پاس آیا۔ اس نے اندرا کو نکال باہر کرنے کے لیے مرارجی کو اپنی مکمل حمایت اور اعانت کا یقین دلایا اور کہا کہ اندرا سے چھٹکارا حاصل کرنا نہایت ضروری اور ناگزیر ہے۔ اس نے یہاں تک کہا کہ مرارجی اُسے بے تکلف کابینہ میں شریک بھی نہ کریں۔ ان دنوں مرارجی ڈپٹی وزیر اعظم اور وزیر خزانہ تھے۔ مرارجی

نے اسے جواب دیا کہ جب تک وہ اندرا کی کابینہ میں ہیں، وفاداری کا تقاضا ہے کہ وہ اندرا پر انگلی بھی نہ اٹھائیں۔ مرارجی نے مزید کہا کہ وہ تو کابینہ سے مستعفی ہونے کے بعد ہی اندرا کی مخالفت کر سکتے ہیں۔ پھر وہ ٹک چھپ کر نہیں بلکہ علی الاعلان ایسا کریں گے۔ مرارجی نے کہا کہ وہ مناسب وقت پر دوسرا راستہ اختیار کریں گے اندرا کابینہ کا یہ وزیر آج بھی کانگریس کی باقیات میں موجود ہے۔

مرارجی ڈیسائی نے حال ہی میں کہا ہے کہ:

"جب بلگانن اور خروشیف بمبئی کے دورے پر آئے تھے۔ تو میں نے انہیں شراب کے پرمٹ جاری کیے تھے، مگر انہوں نے بمبئی میں قیام کے دوران شراب استعمال ہی نہیں کی، بلکہ انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ کاش وہ روس میں شراب بندی نافذ کر سکتے۔"

میں نے یہ کبھی سوچا بھی نہیں کہ مرارجی ڈیسائی اتنے سادہ لوح ہو سکتے ہیں۔ کیا بلگانن اور خروشیف کو شراب کا پرمٹ لے کر بمبئی کی کسی دکان پر جانا چاہیے تھا۔ انہوں نے یہ پرمٹ پھاڑ کر پھینک دیئے ہوں گے۔ خروشیف شراب کے رسیا تھے۔ روسی رہنما ہر نوع کی شراب کی وافر مقدار ساتھ لے کر آئے تھے۔ وہ جہاں کہیں بھی گئے۔ شراب کا یہ ذخیرہ ان کے ساتھ رہا۔ انہوں نے بمبئی سمیت ہر جگہ شراب پی۔ جنوبی ہند میں تو انہوں نے ایک صبح منہ کا ذائقہ تبدیل کرنے کے لیے تاڑی بھی پی تھی۔

مرارجی سبزی خوروں کے بھی بڑے مداح ہیں۔ انہوں نے رکمنی اروندیل کو بھارت کا صدر بنانے کی بڑی کوشش کی۔ جس کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ سبزی خور تھی۔ حالانکہ درحقیقت نہ رکمنی اور نہ مرارجی ہی محض سبزی خور ہیں۔ سبزی خوری کوئی چیز ہی نہیں دودھ، مکھن، گھی اور دہی سبزیاں نہیں ہیں۔ یہ سب حیوانی پیداوار ہیں۔ ایک بار کے۔ ایم منشی نے مجھے بتایا تھا کہ مرغے کے بغیر مرغیاں جو انڈے دیتی ہیں۔ وہ

سبزی ہی ہوتے ہیں۔ منشی کا نظریہ یہ تھا کہ سبزی خور کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی خوراک کے لیے کسی کی جان نہیں لیتا۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اس نے کبھی ڈاکٹر وشی سین یا سر جگدیش چندر بوس سے اس موضوع پر بات کی ہے کہ درختوں، پودوں، سبزیوں پھلوں اور اخروٹوں تک میں زندگی اور احساس کا مادہ ہوتا ہے تو منشی نے اپنی لاعلمی کا اعتراف کر لیا۔

میں نے مرارجی سے کئی بار امتناع شراب پر بات چیت کی ہے۔ میں نے ایک مرتبہ ان سے پوچھا کہ وہ امتناع شراب کے اتنے زبردست حامی کیسے بنے؟ کیا ان کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ رونما ہوا ہے جس نے انہیں شراب کا مخالف بنا دیا؟

انہوں نے بتایا کہ ان کے گاؤں میں ایک نوجوان کا معاملہ پیش آیا تھا۔ اس نوجوان نے جب وہ شراب کے نشے میں تھا۔ اپنی جوان بہن کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا اس پر میں نے انہیں بتایا کہ شہنشاہ نیرو جب نوعمر تھا تو اس نے اپنی خوبصورت ماں سے جنسی تعلقات قائم کیے تھے۔ حالانکہ ان دونوں میں سے کسی نے بھی شراب نہیں پی رکھی تھی۔ اب مرارجی چار سال کے عرصہ میں بھارتی عوام پر مکمل امتناع شراب کا نفاذ چاہتے ہیں۔ انہوں نے صوبوں کے وزرائے اعلیٰ کو اس سلسلے میں قانون سازی کی ہدایت کر دی ہے۔ انہوں نے اس امر کا بھی خیال نہیں کیا کہ شراب کی فروخت سے حکومت کو ۵۴ کروڑ روپے ایکسائز ڈیوٹی وصول ہوتی ہے۔ نہ وہ اخراجات کی پرواہ کر رہے ہیں جو امتناع کے نفاذ پر ہوں گے اور نہ ہی انہیں ان پانچ لاکھ افراد کے روزگار کا خیال ہے جو شراب کی صنعت و تجارت سے وابستہ ہیں۔ مرارجی نے اس حقیقت سے بھی آنکھیں بند کر لی ہیں کہ مکمل امتناع شراب کے نفاذ سے چور دروازے کھل جائیں گے اور بدعنوانی کو فروغ ملے گا۔ پھر ان لوگوں کا کیا بنے گا جن کی معاشرت میں شراب لازمی جزو ہے۔ شراب ہمارے آباؤ اجداد کا پسندیدہ مشروب رہا ہے۔ شاید

مرارجی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ مہاتما بدھ گوشت خور تھے اور ان کی موت کی وجہ سور کا وہ باسی گوشت بنا تھا جو کسی نے اُن کے کشکول میں ڈال دیا تھا۔ جسے کھا کر وہ بد ہضمی کا شکار ہو گئے تھے۔

مرارجی شراب نہیں پیتے۔ وہ سگریٹ نوشی نہیں کرتے، وہ گوشت نہیں کھاتے انڈے نہیں کھاتے، مچھلی کو چھوتے تک نہیں، وہ کافی نہیں پیتے اور چائے بھی نہیں پیتے۔ جب وہ ستائیس سال کے تھے تو انہوں نے جنس سے توبہ کر لی تھی۔ دیکھا آپ نے یہ نیکیوں کی کتنی مرعوب کن فہرست ہے۔ ان کی دلچسپی محض اور محض سیاست تک محدود ہے، سیاست جو بنیادی طور پر اقتدار کے تعاقب کا دوسرا نام ہے اگر انہوں نے سیاست سے بھی کنارہ کشی کر لی ہوتی اور تپسیا کے لیے جنگل میں چلے گئے ہوتے، تو شاید لوگ انہیں رشی اور منی سمجھ کر ان کی پوجا شروع کر دیتے۔

کسی وزیر اعظم کو یہ حق نہیں کہ لاف زنی کرتا پھرے۔ مکمل امتناع شراب مکمل ناکامی سے ہمکنار ہو گا اور اس سے سخت بے راہ روی پھیلے گی۔ کسی سیاست دان کو ایسی پالیسی ٹھونسنے کا حق نہیں، جو انتظامی اعتبار سے ناقابل عمل ہو۔ انہیں لوگوں کو شراب سے اجتناب کی تلقین کرنی چاہیئے۔ میں اس مہم میں ان کا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔ میں مرارجی سے درخواست کروں گا کہ وہ ناروے کے عظیم ڈرامہ نگار ابسن کا شاہکار ڈرامہ "برانڈ" ضرور پڑھیں، جو ۱۸۶۶ء میں لکھا گیا تھا۔ برانڈ ایک عینیت پسند پادری ہے جو نہایت صمیم قلب اور خلوص کے ساتھ کوئی غلط کام نہ کرنے کا عزم کرتا ہے۔ وہ اعلان کرتا ہے کہ:

"میں حامی ہوں چیزوں کا ——— ان چیزوں کا نہیں جیسی کہ وہ ہیں، نہ ان چیزوں کا جیسی انہیں بنایا جا سکتا ہے، بلکہ میں

ایسی چیزوں کا حامی ہوں جیسا کہ انہیں میرے نزدیک ہونا چاہیئے۔"

برانڈ کے نزدیک "ان چیزوں" کا مطلب ایسی چیزیں ہیں جو برانڈ کے انسان کامل کے تصورات کے مطابق ہوں اور یہ انسان بھی ایسا ہو جو ہر زاویے سے مکمل اور مثالی نظر آئے۔ اپنی مثالیت پر اصرار کے باعث برانڈ پرہیز گاری کی بلندیوں پر محو پرواز ہونے کی آرزو میں، میدانِ عمل میں غیر انسانی حماقتوں کے اتھاہ سمندر میں گھر جاتا ہے۔

———:———

مرارجی ڈیسائی کا "آبجیات"

بھارت کے وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی نے حال ہی میں یہ حیران کن انکشاف کیا ہے کہ گذشتہ پانچ چھ سالوں سے وہ روزانہ ایک گلاس پیشاب نوش کرتے ہیں انہوں نے زور دے کر کہا ہے کہ:

"یہ نہایت عمدہ ہے اور پھر مفت ملتا ہے۔"

طبی ماہر مرارجی کے اس بیان کا مضحکہ اڑا رہے ہیں کہ:

"امریکہ میں ڈاکٹر انسانی پیشاب کو امراضِ قلب میں استعمال کرا رہے ہیں اور ہزاروں ڈالر کما رہے ہیں۔"

عرصہ گزرا مغرب میں بعض طبی سائنس دان گھوڑے کے پیشاب کو بار بار صاف کر کے کوئی کیمیاوی مادہ حاصل کرتے تھے۔ مگر یہ طریقہ بھی کافی عرصے سے متروک ہے کیونکہ مطلوبہ کیمیاوی مادہ اب دوسرے طریقوں سے تیار ہونے لگا ہے۔

مرارجی نے کئی قدم آگے بڑھ کر یہاں تک کہا ہے کہ انجیل مقدس میں آیا ہے کہ:

"اپنے گھڑے سے پانی پیو، یہ اپنا گھڑا کیا ہے۔ یہ اپنا پیشاب ہی تو ہے۔"

معلوم ہوتا ہے کہ انجیل کے بارے میں مرارجی کا مبلغ علم بھی اتنا ہی "گہرا" ہے جتنا

گہرا طبی فارماکوپیا کے بارے میں ہے۔ عبرانیوں کی پوری تاریخ میں، خواہ وہ اپنے قدیم وطن میں تھے یا بابلیوں اور مصریوں کی قید میں یا چالیس سال تک صحرائے سینا میں محوِ آوارگی تھے۔ پانی ان کے لیے نایاب چیز تھا۔ آج بھی اسرائیل کے لیے پانی نایاب چیز ہے۔ خانہ بدوش عبرانی پانی گھڑوں، یا اس سے ملتی جلتی کسی چیز میں محفوظ رکھتے تھے اور انجیل میں جو یہ حکم دیا گیا ہے کہ "پانی اپنے گھڑے سے پیو"، اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ عبرانی ایک دوسرے کا پانی چوری نہ کریں۔

مسانی کی کتاب

حال ہی میں منو مسانی کی ایک کتاب منظرِ عام پر آئی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ تقسیم ملک کے بعد جب حکومت بننے والی تھی تو گاندھی جی جے پرکاش نرائن کو کانگریس کا صدر بنانا چاہتے تھے تاکہ نہرو اور پٹیل پر قابو رکھا جا سکے جو حکومت میں شامل ہونے والے تھے۔ میں نے کبھی گاندھی جی کے اس خیال کے بارے میں نہیں سنا۔ مجھے اس بارے میں بھی شک ہے کہ ۱۹۴۷ء میں جے پرکاش نرائن کی حیثیت ایسی تھی کہ اُسے کانگریس کا صدر بنایا جا سکتا اور وہ نہرو یا پٹیل کی راہ میں کوئی رکاوٹ بن سکتا۔ مسانی نے یہ بھی لکھا ہے کہ نہرو نے گاندھی جی کی تجویز کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ کیونکہ وہ اچاریہ ترینددیو کو کانگریس کا صدر بنانا چاہتے تھے مگر پٹیل نے نہرو کی تجویز کو مسترد کر دیا تھا اور بالآخر بابو راجندر پرشاد کو کانگریس کا صدر بنا دیا گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ۱۹۴۱ء کے بعد راجندر پرشاد کبھی کانگریس کا صدر نہیں بنایا گیا۔ نہرو کی جگہ اچاریہ کرپلانی کانگریس کے صدر بنے تھے اور ان کے بعد سیتارام پتابھائی کو کانگریس کا صدر مقرر کیا گیا۔ مجھے علم نہیں کہ منو مسانی نے یہ کہانی کہاں سے گھڑی ہے کہ برطانوی حکومت نے کرشنا مینن کو لندن میں بھارت کا ہائی کمشنر مقرر کرنے کی مخالفت کی

تھی۔ مسانی نے لکھا ہے کہ "سر سٹیفورڈ کرپس نے نہرو کو خط لکھا تھا جس میں برطانیہ کا مؤقف بیان کیا گیا تھا۔ خط میں کہا گیا تھا کہ لیبر پارٹی کرشنا مینن کو کمیونسٹ تصور کرتی ہے۔ لہٰذا اس کا تقرر نا قابل قبول ہے۔" یہ میرے لیے نئی خبر ہے۔ ہاں سٹیفورڈ نے نہرو کو حسبِ معمول سرخ سیاہی میں اپنے ہاتھ سے ایک خط ضرور لکھا تھا۔ جس کا لبِ لباب یہ تھا کہ کرشن مینن کو انڈیا لیگ کے بل سے نکال کر نئی حکومت کے لیے کسی مفید کام پر لگایا جائے۔